شرحِ

بانگِ درا

تالیف:
ڈاکٹر شفیق احمد

نظرِ ثانی:
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

پاپولر پبلشنگ ہاؤس ○ چوک اُردو بازار لاہور

شرحِ بانگِ درا

مع تحقیق متن

تالیف
ڈاکٹر شفیق احمد
اُستاد شعبۂ اُردو و اقبالیات
اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

نظر ثانی
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
صدر شعبۂ اُردو
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

پاپولر پبلشنگ ہاؤس
فضل الٰہی مارکیٹ چوک اُردو بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب ـــــــــــ شرح بانگ درا

تالیف ـــــــــــ ڈاکٹر شفیق احمد

نظر ثانی ـــــــــــ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

سال اشاعت ـــــــــــ ۱۹۹۰ء

مطبع ـــــــــــ معراج پرنٹنگ پریس

کتابت ـــــــــــ خوشخطی کالج۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

قیمت مجلد ۷۵/- روپے

پیپر بیک ۶۰/- روپے

عرضِ حال

فارسی میں اہم کتابوں کی شرحیں لکھنے کی ایک قدیم اور مستحکم روایت موجود ہے۔ اردو کے شارحین نے بھی اِس روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اردو ادب کی اہم اور دقیق کتابوں کی شرحیں لکھنے میں بڑی کوشش و کاوش سے کام لیا ہے۔ خصوصاً کلامِ غالب کے شارحین کی تعداد دیگر شارحین کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ دیوانِ غالب کے بعد کلامِ اقبال کی شرحیں بھی خاصی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ اِس سلسلے میں یوسف سلیم چشتی کو تقدم حاصل ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی اہمیت اِس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے اقبال کے مکمل کلام کی (اردو اور فارسی) شرح لکھ ڈالی ہے۔

غلام رسول مہر کی شرحیں اردو کلام کے تمام مجموعوں اور فارسی میں محض اسرار و رموز کا احاطہ کرتی ہیں اور معیار میں دیگر شرحوں سے بہتر ہیں۔ کچھ اور شارحین نے بھی کلامِ اقبال پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان تمام حضرات کی کوششوں کے باوجود مزید شرحوں کی ضرورت ہنوز باقی ہے یہی احساس زیرِ نظر شرح کی تالیف کا محرک ہے۔

شرح کی تالیف کے دوران مندرجہ ذیل امور میرے پیشِ نظر رہے ہیں:

۱۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اقبال کو انھی کے کلام کے سیاق و سباق میں سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اُسے اپنے معانی نہ پہنائے جائیں۔

۲۔ تمام نظموں کے سنین متعین کرنے کی حتی المقدور سعی کی گئی ہے تاکہ اقبال کا فکری ارتقاء قاری کے ذہن نشین ہو جائے۔

۳۔ جہاں تک ممکن ہو سکا نظموں کا پس منظر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں نظموں کے تعارف میں بعض ایسے اشارات بھی کر دیے گئے ہیں جن سے فکرِ اقبال کے عمومی

رجحانات کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

۴۔ بانگِ درا کی متعدد منظومات اکثر ترمیم و تحریف کے عمل سے گزرتی رہی ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف ان ترمیمات کی نشاندہی کر دی جائے بلکہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ متروک کلام باقیات و متروکات کے کن مجموعوں میں ملے گا۔ اِس ضمن میں اگر متروک کلام کے مرتبین سے کوئی فرو گذاشت ہوئی ہے تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

۵۔ بانگِ درا جیسی ضخیم کتاب کے ایک ایک شعر کو اگر شرح و بسط کے ساتھ لکھا جائے تو شرح کی ضخامت اتنی بڑھ جائے گی کہ اسے شائع کرنا اور اس سے استفادہ کرنا پریشانی کا باعث بن جائے گا۔ اِس لئے دیگر شارحین کی طرح اختصار ہماری بھی مجبوری ہے۔

مَیں استاذی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹیل کالج لاہور کا ممنونِ احسان ہوں جنہوں نے اِس کتاب پر نظر ثانی کی اور متعدد کوتاہیوں کو دور کیا۔ علاوہ ازیں اُنہوں نے ظریفانہ کلام کی شرح لکھی۔

اب یہ کتاب باذوق قارئین اور طلبا کی نذر ہے۔ اُمید ہے کہ اس میں جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں، ان کی نشاندہی سے اہل علم حضرات گریز نہیں کریں گے تاکہ آئندہ اشاعتوں میں اسے بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔

نوٹ شرح بانگ درا کی کتابت کا آغاز ہوا تو کاپی رائٹ ایکٹ کے مطابق اِس کے جملہ حقوق علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کے تصرف میں تھے اور کتاب کے واحد ناشر غلام علی اینڈ سنز لاہور تھے۔ اس کے علاوہ مارکیٹ میں اس کتاب کا کوئی ایڈیشن موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اس اشاعت کو سامنے رکھتے ہوئے ہر نظم کے عنوان کے بعد صفحہ نمبر غلام علی اینڈ سنز کی مطبوعہ بانگِ درا سے دیا گیا ہے اور چونکہ کلام کے طویل اقتباسات کے شائع کرنے کی ممانعت تھی، اِس لئے ہر بند کا صرف پہلا مصرعہ تشریح سے قبل درج کر دیا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین کو اس طریق کار کے سمجھنے میں زیادہ زحمت نہیں ہو گی۔

شفیق احمد

استاد شعبۂ اردو و اقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

فہرست

نظم	صفحہ نمبر	نظم	صفحہ نمبر	نظم	صفحہ نمبر
حصۂ اوّل (... سے ۱۹۰۵ء تک)		گلِ پژمردہ	۴۶	داغ	۱۰۹
ہمالہ	۱	سیّد کی لوحِ تربت	۴۷	ابر	۱۱۲
گلِ رنگیں	۶	ماہِ نو	۵۰	ایک جگنو اور پرندہ	۱۱۴
عہدِ طفلی	۹	انسان اور بزمِ قدرت	۵۱	بچّہ اور شمع	۱۱۵
مرزا غالب	۱۰	پیامِ صبح	۵۴	کنارِ راوی	۱۱۷
ابرِ کوہسار	۱۴	عشق اور موت	۵۵	التجائے مسافر	۱۱۹
ایک مکڑا اور مکھی	۱۷	زہد اور رندی	۵۸	غزلیات	۱۲۲ تا ۱۴۹
ایک پہاڑ اور گلہری	۱۸	شاعر	۶۰	حصہ دوم (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک)	
ایک گائے اور بکری	۱۹	دل	۶۲	محبت	۱۵۰
بچے کی دُعا	"	موجِ دریا	۶۶	حقیقتِ حسن	۱۵۲
ہمدردی	۲۰	رخصت اے بزمِ جہاں!	۶۷	پیام	۱۵۳
ماں کا خواب	۲۱	طفلِ شیر خوار	۷۰	سوامی رام تیرتھ	۱۵۴
پرندے کی فریاد	۲۲	تصویرِ درد	۷۲	طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام	۱۵۶
خفتگانِ خاک سے استفسار	۲۳	نالۂ فراق	۸۹	اخترِ صبح	۱۵۷
شمع و پروانہ	۲۶	چاند	۹۲	حسن و عشق	۱۵۸
عقل و دل	۲۷	بلالؓ	۹۴	... کی گود میں بلی دیکھ کر	۱۵۹
صدائے درد	۳۰	سرگزشتِ آدم	۹۶	کلی	۱۶۱
آفتاب (ترجمہ گایتری)	۳۲	ترانۂ ہندی	۹۹	چاند اور تارے	۱۶۲
شمع	۳۴	جگنو	۱۰۱	وصال	۱۶۳
ایک آرزو	۳۹	صبح کا ستارہ	۱۰۴	سلیمیٰ	۱۶۴
آفتابِ صبح	۴۲	ہندوستانی بچوں کا گیت	۱۰۶	عاشقِ ہرجائی	۱۶۵
دردِ عشق	۴۴	نیا شوالہ	۱۰۷	کوششِ ناتمام	۱۶۸

نظم	صفحہ نمبر	نظم	صفحہ نمبر	نظم	صفحہ نمبر
نوائے غم	۱۶۹	نصیحت	۲۴۴	تہذیبِ حاضر	۳۱۱
عشرتِ امروز	۱۷۰	رام	۲۴۵	والدۂ مرحومہ کی یاد میں	۳۱۳
انسان	،،	موٹر	۲۴۶	شعاعِ آفتاب	۳۲۲
جلوۂ حسن	۱۷۲	انسان	۲۴۷	عرفی	۳۲۳
ایک شام	،،	خطاب بہ نوجوانانِ اسلام	۲۴۸	ایک خط کے جواب میں	۳۲۴
تنہائی	۱۷۳	غرۂ شوال یا ہلالِ عید	۲۵۱	نانک	۳۲۵
پیامِ عشق	۱۷۴	شمع اور شاعر	۲۵۳	کفر و اسلام	۳۲۷
فراق	۱۷۷	مسلم	۲۶۰	بلال رضؓ	۳۳۰
عبد القادر کے نام	۱۷۸	حضور رسالت مآبؐ میں	۲۶۸	مسلمان اور تعلیمِ جدید	۳۳۱
صقلیہ	۱۸۰	شفاخانۂ حجاز	۲۷۰	پھولوں کی شہزادی	۳۳۱
غزلیات	۱۸۳	جوابِ شکوہ	۲۷۱	تضمین بر شعر صائب	۳۳۳
حصہ سوم (۱۹۰۸ء سے ....)	۲۰۰	ساقی	۲۸۸	فردوس میں ایک مکالمہ	۳۳۴
بلادِ اسلامیہ	۲۰۱	تعلیم اور اس کے نتائج	۲۸۹	مذہب	۳۳۶
ستارہ	۲۰۴	قربِ سلطان	۲۹۰	جنگِ یرموک کا ایک واقعہ	۳۳۷
دو ستارے	۲۰۵	شاعر	۲۹۱	مذہب	۳۳۸
گورستانِ شاہی	۲۰۶	نویدِ صبح	۲۹۳	پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ	۳۳۹
نمودِ صبح	۲۱۲	دُعا	۲۹۴	شبِ معراج	۳۴۰
تضمین بر شعر انیسی شاملو	۲۱۳	عید پر شعر لکھنے کی فرمائش		پھول	۳۴۱
فلسفۂ غم	۲۱۴	کے جواب میں	۲۹۵	شیکسپیئر	۳۴۲
پھول کا تحفہ عطا ہونے پر	۲۱۸	فاطمہ بنت عبد اللہ	۲۹۷	مَیں اور تو	۳۴۴
ترانۂ ملی	۲۱۹	شبنم اور ستارے	۲۹۹	اسیری	۳۴۷
وطنیت	۲۲۰	محاصرۂ ادرنہ	۳۰۱	دریوزۂ خلافت	۳۴۸
ایک حاجی مدینے کے راستے میں	۲۲۲	غلام قادر رہیلہ	۳۰۲	ہمایوں	۳۵۰
قطعہ	۲۲۴	ایک مکالمہ	۳۰۴	خضرِ راہ	۳۵۱
شکوہ	،،	میں اور تو	۳۰۵	طلوعِ اسلام	۳۶۵
چاند	۲۳۷	تضمین بر شعر ابو طالب کلیم	۳۰۶	غزلیات	۳۷۷ تا ۳۹۰
رات اور شاعر	۲۳۸	شبلی و حالی	۳۰۷		
بزمِ انجم	۲۴۰	ارتقاء	۳۰۸	ظریفانہ کلام	۳۹۱
سیرِ فلک	۲۴۲	صدیق رضؓ	۳۱۰		

ہمالہ

(۲۱)

تعارف

نظم "ہمالہ"، پہلی بار شیخ عبدالقادر کے ادبی رسالے "مخزن" کی اشاعتِ اوّل سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم فارسی بندشوں اور انگریزی خیالات نیز منظر کشی کے اعلیٰ نمونوں کے باعث پسند کی گئی۔ "ہمالہ"، اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل کی بہت سی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ مخزن میں اس نظم کے بارہ بند شائع ہوئے تھے۔ نظرِ ثانی میں چار بند حذف کر دیئے گئے دیگر بندوں میں بھی جزوی طور پر ترامیم کی گئیں۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

ہمالہ: برصغیر پاک و ہند کے شمال میں سب سے اونچے پہاڑ کا نام، سنسکرت میں "ہم" برف اور "آلہ" گھر کو کہتے ہیں یعنی برف کا گھر، **فصیل**: لفظی معنی جدا کرنے والا۔ اصطلاحی معنوں میں قلعہ یا شہر کی وہ اونچی اور مضبوط دیوار جو بیرونی حملہ آوروں سے حفاظت کے لئے تعمیر کی جاتی ہے؛ **کشور**: سلطنت؛ **دیرینہ روزی**: قدامت، پرانا پن؛ **کلیمِ طورِ سینا**: وادیٔ سینا کے پہاڑ طور پر کلام کرنے والا، مراد حضرت موسیٰؑ جنھوں نے کوہِ طور پر خدا کا جلوہ دیکھا تھا؛ **چشمِ بینا**: دیکھنے والی آنکھ، صاحبِ بصیرت؛

وضاحت

حضرت علامہ اقبالؒ ہمالہ پہاڑ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو ہندوستان کے لئے ایک حفاظتی دیوار کا کام کرتا ہے اور تو اس قدر بلند ہے کہ تیری چوٹیاں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ گذرتا ہوا وقت تجھ پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی وجہ سے تجھ میں پرانے پن کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی وقت کی گذران کے ساتھ ہر چیز بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن تو ہمیشہ کے لیے جوان ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر اللہ کے نور کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص چشمِ بصیرت رکھتا ہو تو اُس کے لیے تو سر سے پاؤں تک جلوہ ہی جلوہ ہے۔ مطلب یہ کہ چشمِ بصیرت تیرے

پردے میں خداوند تعالےٰ کی قدرت اور عظمت کو پا سکتی ہے۔

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو ۔۔۔

حلِ لغات امتحانِ دیدۂ ظاہر : سرسری مشاہدہ ، **پاسباں** : حفاظت کرنے والا ، دیکھ بھال کرنے والا ، **مطلعِ اوّل** : غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں ، **خلوت گاہِ دل** : دل کی تنہائی ، **دامن کش** : مائل کرنے والا ، **دستارِ فضیلت** : بزرگی اور بڑائی کی پگڑی ، **خندہ زن** : ہنسنا ، مذاق کرنے والا ، **کلاہِ مہر عالم تاب** : دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی پگڑی ۔

وضاحت اے ہمالہ اگر ظاہری طور پر دیکھا جائے تو تُو صرف ایک پہاڑ ہے ۔ لیکن تو درحقیقت برعظیم میں بسنے والوں کا محافظ ہے اور ہندوستان کے لیے فصیل کا کام کرتا ہے ۔ اقبالؒ نے یہی خیال ایک اور جگہ یوں پیش کیا ہے ۔

پربت وہ سب سے اونچا ، ہمسایہ آسماں کا

وہ سنتری ہمارا ، وہ پاسباں ہمارا

اقبال ہمالہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تجھے شعری مجموعہ قرار دیا جائے تو آسمان اس کا پہلا شعر ہے ۔ یعنی تیری عظمت اور بلندی کے مقابلے میں آسمان بھی ہیچ ہے ۔ تُو انسان کو دنیا کے ہنگاموں سے نجات دلا کر دنیا نے دل میں کھو جانے پر مائل کرتا ہے ۔

برف نے تیرے سر پر عظمت اور بزرگی کی پگڑی باندھ رکھی ہے جو سورج کی شعاؤں کا مذاق اڑاتی ہے ۔ یہ غالباً اس لیے کہا گیا کہ ہمالہ کی بلند چوٹیاں ہر وقت برف سے ڈھکی رہتی ہیں اور موسمِ گرما میں بھی سورج کی شعاعیں اس برف کو نہیں پگھلا سکتیں ۔ لطف یہ ہے کہ برف اور فضیلت کی پگڑی دونوں کا رنگ سفید ہوتا ہے ۔

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن ۔۔۔

حلِ لغات عمرِ رفتہ : گذری ہوئی عمر ، عہدِ کہن : پرانا زمانہ ، ثریا : ستاروں کا ایک جھرمٹ جو زمین سے بہت دور ہے ۔ اسے پروین بھی کہتے ہیں ۔ پہنائے فلک : آسمان کی وسعت ؛

وضاحت اے ہمالہ گزشتہ زمانہ تیری عمر کے مقابلے میں محض ایک لمحے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی تو دنیا کی پرانی تاریخ کے مقابلے میں کہیں قدیم اور پرانا ہے ۔ تیری وادیوں میں

کالے بادل ہر وقت ڈیرے ڈالے رہتے ہیں (یہ مصرع ہمالہ پہاڑ کی موسمی کیفیت کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے
تیری چوٹیوں کی بلندی سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ آسمان کے بلند ترین ستاروں سے گفتگو کر رہی ہیں۔
اگرچہ تُو زمین پر ہے لیکن ترا وطن آسمان کی وسعتیں ہیں۔

ترے دامن سے اُبلنے والے چشمے کا پانی درحقیقت بہتا ہوا آئینہ ہے۔ ہمالہ کی وادیوں میں چلنے والی ہوائیں اِس پانی کے لئے اُس رومال کی حیثیت رکھتی ہیں جو آئینہ کی دُھندلی سطح کو صاف کرنے کے کام آتا ہے۔

۵ ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے ۔۔۔

حلِ لغات

رہوارِ ہوا : ہوا کا گھوڑا ، تازیانہ : چابک ، بازی گاہ : کھیل کا میدان عناصر : عنصر کی جمع ہے۔ اصطلاحی طور پر وہ اجزاء مراد ہیں جن سے کائنات اور زندگی وجود پذیر ہوئی۔ آج کل ان کی تعداد ایک سو دس سے بھی تجاوز کر چکی ہے لیکن قدیم زمانے میں ان کی تعداد صرف چار تھی یعنی ہوا، آگ، مٹی اور پانی ، فرطِ طرب : خوشی کی افراط
اُڑا جانا : محاورۃً بہت تیز دوڑنا۔

وضاحت

پہلے مصرع میں بادل کو سوار اور ہوا کو گھوڑا قرار دیا گیا ہے۔ یوں بھی بادل کو ہوا ہی اِدھر سے اُدھر لے جاتی ہے لیکن چونکہ گھوڑے کو تیز دوڑاتے اور قابو میں رکھنے کے لئے سوار کے پاس چابک کا ہونا بھی ضروری ہے لہٰذا بادلوں میں بار بار چمکنے والی بجلی بادل کے ہاتھ میں چابک کا کام دیتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ہمالہ پہاڑ کی چوٹیوں نے بادل کے ہاتھ میں بجلی کا چابک دے دیا ہے تاکہ وہ ہوا کے گھوڑے کو اپنی مرضی سے جدھر چاہے دوڑائے جائے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے ہمالہ تو بھی ایک کھیل کے میدان کی حیثیت رکھتا ہے جسے خدا نے عناصر کے کھیل کے لئے بنایا ہے۔ اشارہ ان حوادث کی طرف ہے جو تیز ہواؤں، بارشوں اور چٹانوں کی ٹوٹ پھوٹ کے باعث وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

بادل خوشی و مسرت کی افراط کے باعث جھومتا ہوا جا رہا ہے اور ہوا کے دوش پر تیزی سے اُڑتے ہوئے بادل کو دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ جیسے یہ مست اور بے قابو ہاتھی ہو۔

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی ۔۔۔

حلِ لغات

گہوارہ : جھُولا، پالنا، پھلنے پھولنے کی جگہ، وہ جھولا جس میں بچے کو سلاتے ہیں۔ دستِ گلچیں : پھول توڑنے والے کا ہاتھ ، کنجِ خلوت خانہ

قدرت : خدا کا بنایا ہوا تنہا و پرسکون گوشہ، کاشانہ، گھر۔

وضاحت

اقبالؒ ہمالہ کی وادیوں کے ایک منظر کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں پر پھول کی کلی مستی و سرشاری کے عالم میں جھومتی ہے۔ ان کلیوں کے لیے صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جھولے کا کام دیتے ہیں جو انھیں ادھر ادھر حرکت دیتے ہیں۔ سرشاری کے عالم میں کلی اپنی پتیوں کی زبان سے کہتی ہے کہ آج تک پھول توڑنے والا کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ بات اس لیے درست ہے کہ کوہ ہمالہ کے دامن میں بیشمار ایسی وادیاں ہیں جہاں دشوار گذار راستوں کے باعث آج تک انسان پہنچ ہی نہیں سکا۔

اقبال کہتے ہیں کہ ہر کلی خاموشی کے ذریعے اپنی داستانِ حیات بیان کر رہی ہے۔ داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرت کا بنایا ہوا محفوظ و پرسکون گوشہ ہی میرا گھر ہے۔

ے آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

فرازِ کوہ : پہاڑ کی بلندی ؛ کوثر و تسنیم : جنت میں بہنے والی دو نہریں۔
شاہد : محبوب ؛ عراق : ایرانی موسیقی میں ایک راگنی کا نام۔

وضاحت

اقبال ہمالہ کا ایک اور منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہاڑ کی بلندیوں سے میدانوں کی طرف آنے والی ندی نغمے گاتی ہوئی آتی ہے۔ شاعر نے پانی کے بہنے کی آواز کو ندی کے نغمے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ پہاڑی ندی اپنے ٹھنڈے، میٹھے اور صاف وشفاف پانی کے علاوہ اپنے چلنے کے انداز سے بھی جنت کی نہروں کوثر و تسنیم سے سبقت لی جاتی ہے۔ یہ ندی مناظرِ قدرت کا مشاہدہ کرنے والے کو آئینہ دکھاتی ہوئی اپنا سفر طے کرتی ہے۔
یعنی مناظرِ فطرت اس کے شفاف پانی میں منعکس ہوتے رہتے ہیں اور یہ ان کے لیے آئینے کا کام کرتی ہے۔ ندی کا پانی کبھی تو راستے میں آنے والے پتھروں سے بچ کر گذر جاتا ہے اور کبھی ان سے ٹکرا جاتا ہے۔

اقبال ندی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو دل کو لبھانے والی موسیقی کے سازوں کو چھیڑ دے اور اے سفر کرنے والی ندی! دل تیرے نغموں کی معنویت کو سمجھتا ہے۔ اس بند میں علامہ اقبال نے سیدھے سادھے انداز میں ایک منظر بیان کیا ہے جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے بہت خوبصورت اور دلآویز ہے۔

۵ لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا ۔ ۔ ۔

حلِ لغات
زلفِ رسا : دراز اور لمبی زلفیں؛ **غازہ :** منہ پر سرخی پیدا کرنے کے لیے لگایا جانے والا خوشبودار پوڈر ۔

وضاحت
جب رات کی محبوبہ اپنی دراز زلفیں کھولتی ہے یعنی جب رات ہوتی ہے اور چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے تو دور سے آنے والی جھرنوں کے پانی کی دور سے آنے والی آواز خوبصورت لگتی ہے ۔ شام کے وقت ہمالہ کی وادیوں میں ایسی خاموشی چھا جاتی ہے کہ گفتگو کو اُس پر قربان کیا جا سکتا ہے ۔ انسان عموماً خاموشی کی بجائے گفتگو کو پسند کرتا ہے تاکہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو لیکن اقبال کہتے ہیں کہ ہمالیہ کی وادیوں میں خاموشی ہی اچھی لگتی ہے ۔ ایسے میں درخت اس طرح ساکت و جامد ہو جاتے ہیں جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں ۔

شام کے وقت کہسار پر شفق کا گلابی رنگ کا نپتا پھرتا ہے ۔ شاعر نے ڈوبتے ہوئے سورج اور اس کی وجہ سے کم اُونچی پہاڑیوں سے نسبتاً بلند پہاڑیوں کی طرف دھوپ کے سفر کی وجہ سے پیدا ہونے والی حرکات کو ظاہر کیا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ شام کی سرخی مائل دھوپ، دھوپ نہیں لگتی بلکہ اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے جیسے قدرت نے ہمالہ کے چہرے پر غازہ مل دیا ہو اور یہ غازہ بہت اچھا لگتا ہے ۔

۵ اے ہمالہ داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا ۔ ۔ ۔

حلِ لغات
مسکن : رہنے کی جگہ ، **آبائے انساں :** موجودہ انسانوں کے آباء و اجداد یعنی قدیم زمانے کے لوگ ۔

وضاحت
اے ہمالہ ! تُو اس وقت کی کوئی کہانی سُنا جب پہلے پہل انسان نے تیری وادیوں میں اپنی زندگی کا آغاز کیا ۔ تُو اس سیدھی سادی زندگی کی کہانی بتا جس میں کسی طرح کے تصنع اور بناوٹ کو کوئی دخل نہیں تھا اور لوگ فطری تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے تھے ۔

ظاہر ہے کہ ہمالہ بے زبانی کے باعث اس طرح کی کوئی کہانی یا داستان نہیں سنا سکتا لہٰذا اقبال اپنے تصور اور تخیل کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے تصور سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو مجھے اُن صبحوں اور شاموں سے آشنا کر جن میں ہمارے بزرگوں نے زندگیاں بسر کیں ۔ گو اُن کے اور ہمارے درمیان بہت سا زمانی فاصلہ ہے لیکن ، اے تصور تو گردشِ شام و سحر

کو اُلٹا چلا کر ان فاصلوں کو سمیٹ سکتا ہے۔

'ہمالہ' کی تخلیق کے دور میں اقبال "وطن پرست" شاعر تھے۔ اس بند کی ایک خوبی یہ ہے کہ اقبال وطن پرست شاعر ہونے کے باعث انسانی زندگی کے آغاز کا اوّلیں مقام ہمالہ کو تصور کرتے ہیں اور یہ خیال ہندو دیومالا سے بہت قریب ہے۔

گُلِ رنگیں

(۲۴)

تعارف

علامہ اقبال کی ابتدائی دور کی نظموں میں سے ہے۔ یہ نظم پہلے پہل مئی ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اس نظم کے چھ بند تھے۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت دو بند قلمزد کر دیئے گئے۔ اِس کے علاوہ جا بجا ترمیمات بھی کی گئیں۔ قلمزد کئے ہوئے اشعار سرودِ رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری میں درج کئے گئے ہیں۔

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل: کسی مشکل مسئلے کے باعث پیدا ہونے والی پریشانی سے واقف و آگاہ؛ **شورشِ محفل**: بزم کے ہنگامے؛ **بزمِ ہستی**: کائنات، دنیا۔

وضاحت

اے رنگین پھول! تو نے کبھی کسی مشکل مسئلے کا سامنا نہیں کیا۔ کسی الجھن نے تیری رنگین پتیوں پر خراش نہیں لگائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً تیرے پہلو میں دل نہیں ہے۔ اُردو اور فارسی شاعری میں محبوب کو پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ تشبیہ کی وجہ حسن و نزاکت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ پھول اور محبوب دونوں کو چاہنے والوں کے جذبات کی پروا نہیں ہوتی اس لئے زمانے بھر کی مشکلات سے محفوظ رہتے ہیں۔

شاعر اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اے پھول تُو محفل میں تو موجود ہے لیکن محفل (اس دنیا) کے ہنگاموں سے بے تعلق ہے۔ اِسی بناء پر اس دنیا میں جتنی فراغت اور فرصت تجھے میسر

ہے وہ مجھے حاصل نہیں ۔ ظاہر ہے کہ انسان بے شمار پریشانیوں سے دوچار رہتا ہے جب کہ پھول کو قدرت نے یہ حس عطا نہیں کی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دنیا میں کچھ نہ کچھ پا لینے اور حاصل کرنے کی تمنّا کے باعث بے تاب رہتا ہوں جبکہ تو دل نہ رکھنے کے باعث تمناؤں اور آرزوؤں سے آزاد ہے ۔

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

آئین : طریقہ، دستور، قاعدہ ؛ **نگاہِ چشم صورت بیں** : ظاہر کو دیکھنے والی نظر ؛ **دستِ جفا جو** : ظلم کرنے والا ہاتھ ؛ **گلچیں** : پھول توڑنے والا ؛ **دیدۂ حکمت** : سائنسی اندازِ فکر ؛ **دیدۂ بلبل** : بلبل کی آنکھ مراد ہے عاشقانہ اندازِ نظر ۔

وضاحت

اقبال پھول سے اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا طریقہ یہ نہیں ہے کہ شاخ سے پھول توڑ لیا جائے ۔ اس لئے کہ یہ طریقہ اُن لوگوں کا ہے جو ظاہر پرست ہوں اور محض حسنِ صورت سے بہل جائیں ۔ اے پھول ! افسوس ہے کہ تو جس ہاتھ کو پھول توڑنے والا ہاتھ سمجھ رہا ہے وہ ظلم ڈھانے والا ہاتھ نہیں ہے ۔

شاعر پھول کو اطمینان دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ نہ تو میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو پھول توڑ کر خوش ہوتے ہیں اور نہ میرا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو تیرے وجود کے اسرار و رموز جاننے کیلئے تجھے شاخ سے جدا کرتے ہیں ۔ مجھے سائنسی علوم کے ان ماہرین سے بھی کوئی تعلق نہیں جو پھول کی پتی پتی جدا کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں ۔ مَیں تو تیرا نظارہ بلبل کی طرح عاشق بن کر کرتا ہوں اور تیرے حسن کی تعریف کرتا ہوں ۔

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

مستور : چھپا ہوا ؛ **برگِ ریاضِ طور** : کوہ طور کے باغ کی پتی مراد باغِ جنت ؛ **پریشان** : بکھرنا بھٹکنا ؛ **زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو** : جستجو کے ذوق کی تلوار کا زخمی، مراد ہے وہ شخص جسے تلاش و جستجو مسلسل پریشان رکھے ۔

وضاحت

اقبال پھول کی پتیوں کو اُس کی زبانیں قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ خدا نے تجھے سینکڑوں زبانوں سے نوازا ہے لیکن اس کے باوجود تو گفتگو کرنے کی بجائے خاموش رہتا ہے ۔ پھول کی خاموشی سے شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ پھول کے دل میں کوئی اہم راز ہے جس کو چھپانے کے لئے وہ گفتگو پر خاموشی کو ترجیح دیتا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے پھول ! تو بھی جنت میں کھلنے والا مقدس پھول ہے اور میں بھی وہیں سے تعلق رکھتا ہوں

کیونکہ آدم کو تخلیق کر کے پہلے جنت میں رکھا گیا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ہم دونوں ایک ہی وطن سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں اپنے وطن سے دور ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میری اور تمھاری کیفیت مختلف ہے۔ تم اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے ہو اور میں خوشبو کی طرح جا بجا بھٹکتا پھرتا ہوں۔ کچھ پا لینے کے ذوق و شوق نے مجھے بھٹکنے اور پریشان رہنے پر مجبور کیا ہوا ہے۔

ع یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو - - -

حلِ لغات

سامانِ جمعیت : دل جمعی یعنی اطمینان کا باعث ، **جگر سوزی** : کوشش و کاوش ، **چراغِ خانۂ حکمت** : علم و دانش اور عقل و شعور کا چراغ ، مراد ہے دنیا کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کی کوشش ، **شمعِ جہاں افروز** : دنیا کو روشن کرنے والی شمع : **توسنِ ادراکِ انساں** : عقلِ انسانی کا گھوڑا مراد انسانی شعور ، **خرامِ آموز** : چلنا سکھانے والا ، متحرک کرنے والا۔

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ پھول کے مقابلے میں انسان کا مقدر بھٹکنا اور پریشان رہنا ہی ہے۔ لیکن یہی پریشانی انسان کے لئے اسبابِ اطمینان فراہم کرتی ہے۔ یہی جدوجہد اور کوشش و کاوش انسان کی عقل و دانش میں اضافہ کرتی اور اُسے حیات و کائنات کے پیچیدہ مسائل سمجھنے پر اکساتی ہے۔ اگرچہ انسان عام مظاہرِ کائنات کے مقابلے میں کمزور اور بے طاقت ہے لیکن اس کی یہی ناتوانی اس کی قوت و طاقت کا سرچشمہ بھی ہے۔ انسان اگرچہ سمجھ نہ آنے والے کائنات کے مسائل کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتا ہے لیکن اُس کی یہی حیرت جمشید کے پیالے کی طرح انسان کو ہر طرح کے رازوں سے واقف کرتی ہے جس طرح جمشید اپنے پیالے میں آنے والے واقعات کا عکس دیکھ لیتا تھا۔ یعنی انسان ان رازوں کو جاننے کی تگ و دو کرتا ہے۔ یہ مسلسل تلاش پورے زمانے کو روشنی فراہم کرتی ہے۔ اور انسانی عقل و شعور کو مزید ایک قدم آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

نظم "گل رنگیں" میں علامہ اقبال انسان کا تقابل پھول سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر شئے پرسکون ہے لیکن انسان بے تاب اور بے چین ہے۔ یہ بے تابی تلاش و جستجو کے جذبے کی وجہ سے ہے اور تلاش و جستجو کا یہی جذبہ انسان کو مسلسل کائنات کے رازوں کو جاننے پر مائل کرتا ہے۔ اگر انسان اس جذبے سے محروم ہوتا تو وہ بھی دیگر مظاہرِ فطرت کی طرح ارتقاء کے مراحل طے نہ کر سکتا۔

عہدِ طفلی

(۲۵)

تعارف "عہدِ طفلی" جولائی ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی۔ ابتدا میں اس کے پانچ بند تھے۔ بانگِ درا کی اشاعت کے وقت تین بند قلمزد کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ بعض مصرعوں میں جزوی ترمیمات بھی کی گئیں۔

ع تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے - - -

حلِ لغات دیارِ نو: نئی اور نامانوس جگہ، آغوشِ مادر: ماں کی گود؛ حرفِ بے مطلب: بے معنی بات، شورشِ زنجیرِ در: دروازے کی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ

وضاحت علامہ اقبال ایک بچے کی حیثیت سے اپنے بچپن کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بچپن میں میرے لیے یہ دنیا نئی اور نامانوس تھی اور ماں کی گود ہی میرے لئے کائنات کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہر متحرک چیز میرے لئے دلچسپی کا باعث بن جاتی تھی اور میں خود بھی اپنی زبان نہیں سمجھتا تھا اس لئے کہ میری زبان سے بے معنی اور بے ربط لفظ ادا ہوتے تھے۔

اگر بچپن میں کوئی چیز مجھے تکلیف پہنچاتی تھی تو دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے سے میں خاموش ہو جاتا تھا۔ یعنی میں اس شور میں محو ہو کر اپنی تکلیف بھول جایا کرتا تھا (روتے ہوئے بچے کو عموماً کنڈی کھٹکھٹا کر یا کسی دوسرے طریقے سے آواز پیدا کر کے بہلایا جاتا ہے۔)

ع تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر - - -

حلِ لغات دروغِ مصلحت آمیز: وہ جھوٹ جو کسی خاص مصلحت کے تحت بولا جائے یہ ترکیب شیخ سعدی کی ایک حکایت سے لی گئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ مصلحت کے تحت بولا جانے والا جھوٹ اس سچ سے بہتر ہے جو فتنہ پیدا کرنے کا موجب بن جائے

(دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز) **ذوقِ استفسار** : جاننے کا شوق

وضاحت میں دیر تک چاند کی طرف دیکھتا رہتا تھا اور کٹے پھٹے یا ہلکے بادلوں کے درمیان کسی طرح کی آواز کے بغیر چاند کا سفر مجھے اچھا لگتا تھا (بادل چلتے ہیں، ان کی وجہ سے چاند بھی چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے) میں جب اپنے عزیز و اقارب سے چاند کے بارے میں مختلف سوال پوچھتا تھا اور وہ جواب میں اس مصلحت کے تحت غیر حقیقی باتیں بیان کیا کرتے تھے کہ ابھی سائنسی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، تو میں حیران رہ جاتا۔

اس دور میں آنکھ صرف اس بات کے لیے وقف تھی کہ مختلف اشیاء کو دیکھتی رہے اور ہونٹ ہر وقت گفتگو کرنے پر تیار رہتے تھے یعنی میں ہر وقت بولتا رہتا تھا۔ دل کو ہر وقت نئی نئی باتیں جاننے کا شوق رہتا تھا۔

اقبال نے اس نظم میں بھی انسان کے اسی بنیادی جذبے اور جوہر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جس کا مرکز و محور تلاش و جستجو ہے اور جو بچپن سے انسان کو ودیعت ہو جاتا ہے۔ اور اس کے تمام تر ذہنی ارتقاء کا ذمہ دار ہے۔

مرزا غالب

(۲۶)

تعارف یہ نظم سب سے پہلے ستمبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ بانگ درا کی اشاعت کے وقت نظرِ ثانی کے دوران بعض ترمیمات کی گئیں۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا - - -

حلِ لغات **فکرِ انساں** : انسانی عقل و شعور ؛ **روشن ہوا** : واضح ہوا ؛ **پرِ مرغِ تخیل** : تخیل کے پرندہ کا پر مراد انسانی تخیل ؛ **رسائی** : پہنچ ؛ **پنہاں** : چھپا ہوا، پوشیدہ ؛ **مستور** : چھپا ہوا۔

وضاحت

اقبال، غالب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ انسان پر تیری وجہ سے یہ بات عیاں اور واضح ہوئی کہ انسان کا تخیل کہاں تک پرواز کر سکتا ہے اور خاک پر رہنے والے انسان کی قوتِ متخیلہ کی کہاں تک پہنچ ہے۔ یعنی انسانی تخیل کے کمالات کو غالب کی شاعری کا مطالعہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اے غالب شاعری کی محفل میں تیرا وجود روح کی حیثیت رکھتا ہے اور جس طرح روح موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آتی بعینہٖ تیری موجودگی کے باوجود تو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ پوشیدگی کی ایک وجہ تو خود غالب کا روح قرار دیا جانا ہے جو اپنی لطافت کے باعث نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ غالب کا عہد اس عظیم شاعر کو سمجھنے اور اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے سے قاصر رہا۔

اے غالب! تیری آنکھ اُس حسن کو دیکھنا چاہتی ہے جو زندگی کا جوہر بن کر دنیا کی ہر چیز میں چھُپ ہوا ہے۔ یعنی غالب زندگی کے مسائل و معاملات اور انسانی نفسیات کا شاعر ہے اور اقبال کے نزدیک یہی بات غالب کو دیگر اردو شعرا پر فوقیت بخشتی ہے۔

۵ محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار — — —

حلِ لغات

بربط : ایک باجا جس کی شکل بطخ کے سینے سے مشابہ ہوتی ہے مراد ہے نغمہ، شاعری ؛ کشتِ فکر : فکر کی کھیتی، غور و فکر ؛ مضمر: پوشیدہ، چھپی ہوئی ؛ تابِ گویائی : بولنے کی طاقت۔

وضاحت

اے غالب! جس طرح ندی کے نغموں سے پہاڑوں کی خاموش فضا کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح زندگی اور کائنات کا دامن تیری شاعری سے بھرا ہوا ہے۔ تیری قوتِ متخیلہ کے پردے میں قدرتِ خداوندی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی غالب کی شاعری کے ذریعے قدرت کے اسرار و رموز عیاں ہوتے ہیں اور تیری فکر کی کھیتی یعنی شاعری سے بے شمار سرسبز و شاداب اور دل و نگاہ کو طمانیت بخشنے والی دنیائیں پیدا ہوتی ہیں۔

زندگی تیری تحریر یعنی شاعری میں چھپی ہوئی ہے۔ اس مصرع کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ غالب نے لفظوں کے ذریعے جو شوخ پیکر تراشے ہیں وہ زندگی آمیز ہیں اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ غالب نے پُر لطف انداز میں زندگی کے حقائق پیش کئے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ غالب نے جو تصویری پیکر تراشے ہیں وہ اس قدر زندہ اور حقیقی ہیں کہ اُن پر تصویر کا گمان نہیں گذرتا۔ اس لئے کہ تصویر ساکت و جامد ہوتی ہے جبکہ غالب

کے شعری پیکر، بولتے اور گفتگو کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اِس مصرع کے ذریعے اقبال نے دراصل شاعری اور مصوری کے فرق کو بھی واضح کر دیا ہے۔ مصور اپنے مو قلم سے جتنی عمدہ تصویر بنائے لیکن وہ بہر حال جامد و ساکت ہی ہو گی جبکہ شاعر کی تصویریں متحرک بھی ہوتی ہیں اور یہ خوبی غالب کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر - - -

حلِ لغات

نطق: بولنے کی قوت و قدرت، لبِ اعجاز: لفظی معنی معجزہ دکھانے والے ہونٹ مراد شاعری، ثریا: آغاز سرما میں نظر آنے والے چھ چھوٹے چھوٹے ستاروں کا جھرمٹ، تصدق: قربان، نثار، خندہ زن: ہنسنے والا، مذاق کرنیوالا تحقیر کرنے والا آرامیدہ: سویا ہوا یعنی دفن کیا ہوا۔ ویمر: جرمنی کا ایک شہر جہاں مشہور شاعر گوئٹے دفن ہے۔

وضاحت

اے غالب! تیری معجزے دکھانے والی شاعری پر انسانی قدرت کلام کو بہت ناز اور فخر ہے۔ تیرے تخیل کی اُونچی اڑان پر ستاروں کا جھرمٹ ثریا بھی حیرت زدہ ہے۔ اقبال کے نزدیک غالب جس انداز میں شاعری کرتا ہے وہ اتنا دلکش اور خوبصورت ہے کہ خود مضمون اُس پر نثار اور فدا ہوتا ہے۔ غالب نے اپنے بارے میں خود بھی یہی دعویٰ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعرِ خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اقبال کا خیال ہے کہ غالب نے ایسی خوبصورت شاعری کی ہے کہ اب غنچۂ دلی، گلِ شیراز کا مذاق اڑا رہا ہے۔ بعض شارحینِ اقبال کے نزدیک غنچۂ دلی سے مراد غالب اور گلِ شیراز سے مراد خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی ہیں۔ اس کے علاوہ ان دو تراکیب کے معنی علی الترتیب زبانِ اُردو اور زبان فارسی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ غالب کی بدولت اردو جیسی کم ترقی یافتہ زبان میں بھی ایسی شاعری ہو چکی ہے جس کے سامنے فارسی شاعری پھیکی اور بے رنگ لگتی ہے۔

اقبال اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس قدر عظیم شاعر اس دلّی میں دفن ہے جو اجڑ چکی ہے۔ لیکن ویسا ہی عظیم شاعر گوئٹے دہلی سے ہزاروں میل دور جرمنی کے مشہور شہر ویمر

میں محوِ خواب ہے۔ علامہ اقبال نے آرنلڈ کی ایک نظم سے یہ مصرع اخذ کیا ہے۔ آرنلڈ کا مصرع ہے۔ Goethe in veimmer sleeps ۔ گوئٹے جرمن زبان کا مشہور شاعر ہے جس کی شاعری میں غالب ہی کی طرح تخیل کی بلند پروازی کے کمالات نظر آتے ہیں۔ اس لئے اکثر ناقدین نے اسے غالب کا ہم پلہ شاعر قرار دیا۔ اتفاق یہ ہے کہ یہ دونوں شاعر تقریباً ایک ہی زمانے کے تھے لیکن ذرائع رسل و رسائل اور ذرائع ابلاغ نہ ہونے کے باعث ایک دوسرے سے بالکل ناواقف تھے۔ گوئٹے ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور اس نے 1838ء میں انتقال کیا علامہ اقبال نے اپنا فارسی شعری مجموعہ "پیامِ مشرق" گوئٹے کے "دیوانِ مغرب" ہی کے جواب کے طور پر لکھا۔

ع لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ـ ـ ـ

حلِ لغات لطفِ گویائی: بولنے کا لطف مراد فصیح و بلیغ شاعری ؛ ہمسری: برابری ؛ فکرِ کامل: پختہ فکر، فکر کے اصطلاحی معنی اس انسانی قوت کے ہیں جو معلوم باتوں میں غور و تدبر کر کے نامعلوم باتیں دریافت کرتی ہے۔ غور و خوض کی صلاحیت نظارہ آموز: دیکھنے کا طریقہ بتانے والا ؛ نگاہ نکتہ بیں: بھید تلاش کرنے والی نظر، نظارہ آموزِ نگاہ نکتہ بیں سے یہاں مراد غالب ہیں۔ منت پذیر: احسان قبول کرنے والا شانہ: کنگھی ؛ دلسوزی: دل جلانا، محنت و کاوش

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اب کسی شاعر کے لئے اس وقت تک میدانِ شاعری میں غالب کی برابری کرنا ممکن نہیں ہے جب تک وہ فکر و تخیل کی قوتوں سے بہتر طریق پر کام لینے کے قابل نہ ہو۔ اقبال اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے غالب اب ہندوستان کی زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ یعنی اب اس میں تجھ جیسے عظیم شاعر پیدا نہیں ہو رہے حالانکہ ابھی اردو کے گیسو کنگھی کے محتاج تھے یعنی اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی اور یہ شمع یعنی زبانِ اُردو کسی پروانے کی محنت و کاوش کی ضرورت مند تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی اردو نے ارتقاء کے تمام مراحل طے نہیں کئے اور اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے تجھ جیسے شاعر کی ضرورت تھی۔

ع اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ـ ـ ـ

حلِ لغات گہوارۂ علم و ہنر: علم و ہنر کا جھولا، مراد علم و ادب کی پرورش کرنیوالا۔

بام و در : چھت اور دروازے مراد عمارت ۔

وضاحت اقبال دہلی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے دہلی تو صدیوں سے علم وفن کا مرکز رہی ہے ۔ جیسے جیسے علماء، شعراء اور فنکار تری خاک سے اُٹھے اور پھر تجھ ہی میں دفن ہو گئے، اُن کے ماتم میں ترے در و دیوار گریہ کناں ہیں ۔ اگرچہ تیری مٹی میں سورج اور چاند کی طرح مشہور و معروف اور موتیوں کی سی قدر و قیمت رکھنے والی بیشمار شخصیات دفن ہیں لیکن سچ بتا کیا تجھ میں غالب جیسا کوئی دوسرا شخص بھی دفن ہے ؟ اقبال نے آخری شعر کے دونوں مصرعوں میں استفہام انکاری کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے ۔ گویا خود ہی واضح کر دیا ہے کہ غالب جیسا کوئی شخص خاکِ دہلی میں دفن نہیں، غالب سب سے عظیم ہے اور منفرد بھی ۔

کمال یہ ہے کہ اقبال اگرچہ شاعر تھے اور انھوں نے غالب کے حضور شاعرانہ انداز میں منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے ۔ اس کے باوجود اس نظم میں کلامِ غالب کی وہ تمام خصوصیات آگئی ہیں جنکا ذکر غالب کے بڑے بڑے ناقدین کے ہاں ملتا ہے مثلاً تخیل کی بلند پروازی، فکر و فلسفہ، جدتِ ادا، انتخابِ الفاظ کا سلیقہ، شوخی و ظرافت، رموزِ فطرت اور انسانی فطرت و نفسیات وغیرہ ۔

ابرِ کہسار

(۲۷)

تعارف "ابرِ کہسار" نومبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تو دس بندوں پر مشتمل تھی ۔ نظرِ ثانی میں صرف چار بند رکھے گئے ۔ بعض مصرعوں اور شعروں میں جزوی ترامیم بھی کی گئیں ۔ محذوف شعر باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں جمع کر دیے گئے فرہنگ اقبال مرتبہ نسیم امروہوی میں لکھا ہے کہ "نومبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں دس بند شائع ہوئے تھے"؛ سنہ کے تعین میں کتابت کی غلطی واضح ہے ۔

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا ۔ ۔ ۔

حلِ لغات فلک بوس : آسمان چومنے والا، بہت بلند ؛ گل پاش : پھول بکھیرنے والا ؛ مسکن : رہنے کی جگہ ؛ بن : جنگل ؛ مخمل : سبز رنگ کا قیمتی اور نفیس کپڑا ۔

وضاحت پہاڑوں کی چوٹیوں پر چھایا ہوا بادل کہتا ہے کہ میں اس قدر بلند مقام پر رہتا ہوں کہ آسمان کو چومتا اور چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہوں ۔ میں پہاڑوں پر رہنے والا بادل ہوں اور زمین پر پھول بکھیرتا ہوں ۔ میں کبھی کسی صحرا پر برستا ہوں اور کبھی گلستان میں ڈیرے ڈال دیتا ہوں ۔ دراصل شہر و ویرانہ ہو یا سمندر اور جنگل یہ سب میرے ہیں اور میں ان پر بارش برساتا ہوں جس کی وجہ سے ان میں پھول کھلتے ہیں ۔ اگر میں کسی وادی میں آرام کرنا چاہوں تو پہاڑ پر اگا ہوا سبزہ میرے لیے بستر کا کام دیتا ہے ۔

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا ۔ ۔ ۔

حلِ لغات دُر افشاں : موتی بکھیرنا ؛ ناقہ : تیز چلنے والی اونٹنی ؛ شاہدِ رحمت : خدا کی رحمت کو جوش میں لانے والا محبوب ؛ حدی خواں : نغمہ گانے والا ؛ غم زدا : تکالیف مٹانے اور ختم کرنے والا ؛ شانۂ موجۂ صرصر : ہوا کی موجوں سے بننے والی کنگھی یعنی ہوا ؛

وضاحت میں ابرِ کہسار ہوں اور قدرت نے مجھے موتی بکھیرنا سکھایا ہے ۔ موتی سے مراد بارش کے قطرے ہیں جو اپنی شکل وصورت کے باعث موتی قرار دیئے جا سکتے ہیں اور جو کسانوں کے نزدیک اپنی قدر وقیمت کے اعتبار سے موتیوں جیسے ہی ہوتے ہیں ۔ ابرِ کہسار کہتا ہے کہ قدرت نے مجھے اس اونٹنی کا حُدی خواں بننے کی تربیت بھی دی ہے جس پر رحمتِ باری سوار ہے ۔ معنی یہ ہیں کہ میں برستا ہوں تو رحمتِ باری ہی کے باعث ۔ یہ مصرع استعارہ بالکنایہ کی بہترین مثال ہے ۔ شاعر نے پہلے ایک محبوب پیدا کیا، محبوب کی رعایت سے محمل اور ناقہ کا ذکر کیا گیا ۔ اسی طرح ناقہ کو تیز رفتاری سے سرگرم سفر ہونے کے لئے نغمے گانے والے کی موجودگی لازم آئی ۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ بادل کسان کے دکھے ہوئے دل کے غموں کو دور کرتا ہے ۔ اس لئے کہ بادل اُس کی فصل اور پیداوار میں اضافے کا سبب بنتے ہیں ۔ بادل گلستان میں رہنے والے نوجوانوں یعنی سرمست و سرشار اور رنگین کوشش لوگوں کی محفل کو رونق بخشتا ہے ۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ بادل زندگی کے چہرے پر گیسو بن کر بکھر جاتا ہے۔ یعنی جس طرح محبوب کے چہرے پر بکھری ہوئی زلفیں اُس کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں اسی طرح بادل اور بارش کے سبب پیدا ہونے والے سبزہ و گل زمین کے حسن و زیبائی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ بادل ہواؤں کی وجہ سے مزید بکھر نہیں پاتے۔ اگر بکھریں تو ہوا انھیں پھر اکٹھا کر کے برسنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

دیدۂ امید : امید رکھنے والی آنکھ ؛ **لبِ جو** : ندی کے کنارے ؛ گرداب : بھنور ؛ **مزرعِ نوخیز** : تازہ اُگی ہوئی کھیتی ؛ **زادۂ بحر** : سمندر سے پیدا ہونے والا ؛ **پروردۂ خورشید** : سورج کا پالا ہوا۔

وضاحت

بعض اوقات کسان میرے برسنے کے انتظار میں رہتے ہیں اور میں انہیں دور ہی دور سے بن برسے ترساتا ہوا گزر جاتا ہوں اور اکثر بستیوں پر سے برسے بغیر ہی گزر جاتا ہوں۔ اگر کبھی کسی ندی کے کنارے پہنچ کر زور سے برستا ہوں تو نہر کے پانی میں بھنور پڑنے لگتے ہیں۔

بادل نئی اُگی ہوئی فصلوں اور کھیتوں کی آس ہے یعنی یہ کھیتیاں اُس کے رحم و کرم پر ہیں۔ شاعر نے بادل کو سمندر سے پیدا ہونے والا اور خورشید کا پالا ہوا قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی بدولت سمندروں کا پانی بھاپ بن کر اڑتا اور بادل کی صورت اختیار کرتا ہے۔

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

قلزم : سمندر ؛ **قم** : کھڑے ہونے کا حکم، حضرت عیسٰیؑ کا معجزہ جس کے ذریعے وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے (قم باذن اللہ) **شبستاں** : امراء کے رات گزارنے کی جگہ، امراء کی عشرت گاہ۔

وضاحت

بادل کہتا ہے کہ پہاڑوں سے نکلنے والے معمولی سے چشمے میں صرف میری مسلسل اور زوردار بارش کی وجہ سے سمندر جیسا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ میری وجہ سے گرمی کے مارے ہوئے پرندے سکھ کا سانس لے کر نغمے گانے پر مائل ہوتے ہیں میری وجہ سے پامال سبزہ پھر سے پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ یعنی بارش برستی ہے تو سوکھے ہوئے سبزے

میں ننھے برے سے جان پڑ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت عیسٰیؑ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ بادل کہتا ہے کہ میری ہی وجہ سے پھول کھلتے ہیں۔
میری ہی برکت سے پہاڑ کے دامن میں بنے ہوئے کسانوں کے جھونپڑے بھی امراء کی عشرت گاہوں کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں۔ یعنی بارشوں کے سبب فصلیں اچھی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے غرباء کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایک مکڑا اور مکھی

(۲۹)

تعارف علامہ اقبال کی یہ نظم بچوں کے لئے لکھی گئی اُن نظموں کے سلسلے کی نظم ہے جو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایماء پر لکھی گئی تھیں۔ یہ نظم ایک مغربی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے۔ "ایک مکڑا اور مکھی" تیئیس اشعار پر مشتمل تھی۔ نظرثانی میں آٹھ شعر قلمزد کر دیئے گئے جو روزگارِ فقیر جلد دوم میں شائع ہو گئے ہیں۔

وضاحت نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مکڑے نے مکھی کو دیکھا تو اُسے اپنے قریب بلانے اور پھر اُسے اپنی خوراک بنانے کی غرض سے باتیں بنانا شروع کر دیں۔ کبھی کہا کہ تم اس راستے سے روز گذرتی ہو لیکن میرے گھر نہیں آتی حالانکہ ہم ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔ سو تمہیں محبت و یگانگت بڑھانے کے لئے میرے گھر آنا چاہئے۔ کبھی کہا کہ میرے گھر میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو تمہیں دکھانے کے لائق ہیں۔ اگر تم انہیں دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ لیکن جب مکھی کسی صورت میں مکڑے کی باتوں میں نہ آئی تو وہ آخری حربے کے طور پر مکھی کی خوشامد کرنے لگتا ہے اور اس کے حسن کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔ اپنی آنکھوں، کلغی اور گاتے کی تعریفیں سنکر مکھی یہ بھول گئی کہ مکڑا اُس کا دشمن ہے اور اُسے کھانے کے لیے حیلے بہانے تراش رہا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی مکھی مکڑے کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اس کے قریب پہنچتی ہے وہ اُسے پکڑ لیتا ہے۔

نظم کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو دشمن کی خوشامدانہ باتوں میں نہیں آنا چاہیئے کہ بہرحال ان باتوں سے بھی آخر کار نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کسی اور بات سے متاثر ہو یا نہ ہو لیکن اپنی جھوٹی سچی تعریف سے فوراً خوش ہوتا ہے اور یہی چیز اُس کے لئے ضرر رساں ہوتی ہے۔

ایک پہاڑ اور گلہری

(۳۱)

تعارف اقبال نے یہ نظم بچوں کے لئے لکھی ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال مشہور شاعر ایمرسن کی ایک نظم "The mountain and the squirrel." سے ماخوذ ہے۔ ابتداء میں اس کے کل چوبیس شعر تھے۔ نظرثانی میں قلمزد کئے گئے اشعار روزگار فقیر جلد دوم میں دیئے گئے ہیں۔

وضاحت علامہ اقبال نے ایک پہاڑ اور گلہری کے مکالمے کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز بیکار پیدا نہیں کی گئی۔ اللہ تعالےٰ نے اگر پہاڑ کو بڑا بنایا ہے تو یہ بھی اس کی حکمت اور مصلحت ہے اور اگر گلہری کو چھوٹا پیدا کیا ہے تو اس میں بھی اس کا کوئی اسرار ہے۔ پہاڑ کو اپنی بڑائی اور بلندی پر غرور نہیں کرنا چاہیئے اور گلہری کے چھوٹا ہونے پر اُس کی تحقیر و تذلیل نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر شے کو اپنی مصلحت کے تحت بڑا یا چھوٹا بنایا ہے اور اسی اعتبار سے اُن کے فرائض و واجبات مقرر کر دیئے ہیں۔ کوئی ایک چیز کسی دوسری چیز کے فرائض ادا کرنے سے قاصر ہے۔

اس نظم کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو فخر و غرور یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے فرائض و واجبات ادا کرنے چاہئیں۔

ایک گائے اور بکری

(۳۲)

تعارف "ایک گائے اور بکری" بھی بچوں کے لئے لکھی گئی نظم ہے۔ اس کا مرکزی خیال بھی اقبال نے ایک مغربی شاعر سے لیا ہے۔ ابتداء میں یہ نظم اکتالیس اشعار پر مشتمل تھی۔ بانگِ درا میں صرف انتیس شعر درج ہیں۔ باقی روزگار فقیر جلد دوم میں شائع ہو چکے ہیں۔

وضاحت نظم کی ابتداء میں اقبال نے ایک دلآویز منظر پیش کیا ہے جس میں ایک گائے اور بکری کی ملاقات ہوتی ہے۔ بکری گائے کا حال پوچھتی ہے تو گائے اپنے مالک یعنی انسان کی شکایت شروع کر دیتی ہے۔ ایک حد تک دیکھا جائے تو گائے کی یہ شکایات درست بھی ہیں البتہ گائے نے ان سہولتوں اور آسانیوں کو فراموش کر دیا جو انسان کی وجہ سے اُسے حاصل ہوئیں۔ بکری گائے کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے کہتی ہے کہ بیشک انسان کے طرزِ عمل سے پالتو جانوروں کو بڑی تکلیفیں پہنچتی ہیں لیکن پالتو جانوروں پر اس کے احسانات بھی بہت ہیں۔ مثلاً انسان ہی کی بدولت اُن کی جانیں محفوظ ہیں اور انھیں بے خوف وخطر پیٹ بھر خوراک میسر آجاتی ہے۔ اگر انسان نہ ہوتا تو جنگل کی بظاہر آزاد زندگی میں اُن کے لئے کتنے خطرے ہوتے۔ گائے بکری کی ان دانشمندانہ باتوں کی سچائی کو تسلیم کر لیتی ہے۔

اس نظم کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو کسی حال میں بھی شکوہ و شکایت کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ بہت سی پریشانیوں اور مصائب کے باوجود انسان کو مسرتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ شکایت کرتے ہوئے ان احسانات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے۔

بچے کی دُعا

(۳۴)

تعارف "بچے کی دعا" بھی علامہ اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جس کا بنیادی خیال ابتدائی

نے کسی اور جگہ سے اخذ کیا ہے۔ اس نظم میں ایک بچہ دعا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری دلی آرزو اور خواہش دُعا بن کر میرے ہونٹوں پر آگئی ہے اور دُعا یہ ہے کہ میری زندگی اس دنیا میں شمع کی مانند ہو یعنی جس طرح شمع اپنے اردگرد کی تاریکیوں کو ختم کر کے ماحول کو منور کر دیتی ہے اسی طرح میں بھی زمانے سے تاریکی کے خاتمے کا سبب بن جاؤں۔ میری وجہ سے دنیا کے اندھیرے ختم ہو جائیں اور ہر طرف روشنی پھیل جائے۔ بطورِ خاص میری وجہ سے میرے وطن کو فائدہ پہنچے اور ویسے ہی میں اس کی زیب و آرائش کا سبب بن جاؤں جیسے پھول گلشن کی زینت کا سبب بنتا ہے۔

بچہ کہتا ہے کہ میری زندگی میں پروانے کی سی بیتابی اور بے قراری آجائے۔ فرق یہ ہو کہ پروانے عام شمع کے گرد منڈلاتے ہیں جبکہ میرا مرکز و محور دنیائے علم ہو۔ خدا مجھے یہ توفیق دے کہ میں غریبوں، دکھیاؤں اور کمزور لوگوں کے کام آؤں۔ اے اللہ میری دعا ہے کہ میں ہر طرح کی برائی سے بچا رہوں اور نیک کام کروں۔

اس نظم کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نظم ہر صبح تقریباً تمام پاکستانی سکولوں میں دعا کے طور پر پڑھی جاتی ہے۔

ہمدردی

(۳۵)

تعارف بانگِ درا میں پیش کی گئی تصریح کے مطابق "ہمدردی" کا بنیادی خیال "ولیم کوپر" کی ایک نظم سے لیا گیا ہے۔ کوپر کی نظم کا عنوان THE NIGHT-INGALE AND THE GLOW WORM ہے۔ اقبال نے بنیادی خیال اس نظم سے اخذ کیا ہے مگر اس کا اختتام بدل ڈالا ہے۔

وضاحت اس نظم میں علامہ اقبال نے بتایا ہے کہ ایک بلبل دن بھر اپنے آشیاں سے دور رہا۔ شام کا اندھیرا چھا گیا تو اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اب وہ گھر

کیسے پہنچے۔ وہ اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ ایک جگنو اُس کے پاس آیا اور کہا کہ خداوند تعالےٰ نے مجھے چراغ دیا ہے اس کی روشنی میں مَیں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔

نظم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو عام زندگی میں لوگوں کی بےغرض خدمت کو اپنا شعار بنانا چاہیئے۔

ماں کا خواب

(۳۶)

تعارف "ماں کا خواب" بھی علامہ اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی اس کا بنیادی خیال بھی ایک مغربی شاعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

وضاحت علامہ اقبال اس نظم میں ایک ایسی ماں کا خواب بیان کرتے ہیں جس کا لڑکا فوت ہو چکا ہے اور جو اپنے بیٹے کے فراق میں رات دن روتی رہتی ہے۔ ماں خواب دیکھتی ہے کہ وہ کسی تاریک اور ڈراؤنی جگہ کھڑی ہے اور سبز کپڑے پہنے ہوئے بہت سے بچے وہاں سے گذر رہے ہیں۔ ان بچوں کے ہاتھوں میں چراغ ہیں جو جل رہے ہیں۔ اس جماعت میں وہ اپنے بیٹے کو بھی دیکھتی ہے کہ اُس کے بیٹے کے ہاتھ میں بھی چراغ ہے لیکن وہ جل نہیں رہا ہے۔ ماں اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر اُس کے بچھڑنے کی شکایت کرتی ہے۔ جواب میں بچہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگرچہ تو میری جدائی میں روتی ہے لیکن تیرے رونے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا البتہ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ تیرے آنسوؤں کی وجہ سے میرا چراغ بجھ گیا ہے۔

نظم کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی عزیز کے انتقال پر افسوس اور رنج قدرتی بات ہے۔ لیکن اسے قدرت کا قانون اور منشائے ایزدی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے۔ ہماری آہ و زاری سے مرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

پرندے کی فریاد

(۳۷)

تعارف علامہ اقبال کی یہ نظم بھی مشہور انگریزی شاعر "کوپر" کی نظم "On a Gold-finch starved to death in his cage" کا آزاد اُردو ترجمہ ہے۔ مولانا مہر کی تحقیق کے مطابق یہ نظم فروری ۱۹۰۷ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نسیم امروہوی کے مطابق اس نظم کے کل شعر اکیس تھے جن میں گیارہ شعر بانگِ درا میں شائع ہوئے دس شعر قلمزد کر دیئے گئے جبکہ مولانا مہر کے مطابق اشعار کی کل تعداد بیس تھی۔ یہ تمام شعر سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

وضاحت اِس نظم میں ایک قیدی پرندہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب میں آزاد تھا اور بہار کے موسم میں گلستان کے دوسرے پرندوں کے ساتھ مل کر گایا کرتا تھا۔ اب میں پنجرے میں قید ہوں اور مجھے وہ آزادی میسر نہیں جس کی وجہ سے میں آزادانہ اپنے گھونسلے میں آجایا کرتا تھا۔ جب گلشن میں شبنم پڑنے اور پھولوں کے کھلنے کی کیفیت یاد آتی ہے تو مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ قیدی پرندہ اپنے ساتھی پرندے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت اور حسین تھا اور اس کی وجہ سے میرے گھونسلے میں رونق تھی۔ اب اس کے چہچہانے کی آواز میرے قیدخانے تک نہیں پہنچتی۔ اے کاش میری رہائی میرے اختیار میں ہوتی۔

قیدی پرندہ اپنی قسمت کا گلہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے ساتھی تو اپنے وطن میں ہیں اور میں یہاں قید میں پڑا ہوں۔ گلشن میں بہار آئی ہوئی ہے۔ نئے نئے پھول کھل رہے ہیں لیکن میں قید میں پڑا اپنی قسمت کی شکایتیں کر رہا ہوں۔ اے اللہ! میں اپنے غموں کا قصہ کسے سناؤں؟ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں قید کی حالت میں مر نہ جاؤں۔

قیدی پرندہ اپنی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب سے گلشن سے جدا ہوا ہوں اُس وقت سے میرا دل غم برداشت کر رہا ہے اور یہی صدمہ میرے دل کو کھائے جا رہا ہے۔

میری شکایتوں کو سننے والے اسے گانا نہ سمجھیں بلکہ یہ تو میرے غمزدہ دل کی فریاد ہے۔ آخر میں قیدی پرندہ اپنے صیاد کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تو مجھے آزاد کردے اور اگرچہ میں بے زبان ہوں اس کے باوجود تجھے دعائیں دوں گا۔

نظم کا حاصل یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمت ہے جو جانوروں کو بھی عزیز ہے۔ اِس کے علاوہ یہ کہ ہمیں چیزوں کے ظاہر پر نظر رکھنے کی بجائے حقیقتِ حال کو بھی سمجھنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ جسے ہم نغمہ سمجھتے ہوں وہ نالہ و فریاد ہی ہو۔

خفتگانِ خاک سے استفسار

(۳۷)

تعارف پہلی بار فروری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ مخزن میں بھی اس کے تین ہی بند شائع ہوئے تھے لیکن بانگِ درا کی اشاعت کے وقت بہت سے شعر حذف کر دیئے گئے جبکہ جزوی ترامیم کے علاوہ کچھ نئے اشعار کا اضافہ بھی کیا گیا۔

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقابِ روئے شام ۔ ۔ ۔

حلِ لغات خفتگانِ خاک: مٹی میں سوئے ہوئے۔ مرنے والے۔ استفسار: سوال۔ سیہ پوشی: کالا لباس پہننا مراد تاریکی کا پھیلنا۔ ساحرِ شب: رات کا جادوگر۔ دیدۂ بیدار: جاگنے والی آنکھ۔ آوازِ درا: گھنٹی کی آواز۔ نفور: نفرت کرنے والا۔ حرماں نصیبی: ناکامی و نامرادی۔ خفتگانِ کنجِ تنہائی: تنہائی میں سونے والے۔

وضاحت علامہ اقبال نے رات کی تصویر کھینچتے ہوئے کہا کہ روشنی پیدا کرنے والا سورج چھپ گیا اور شام کے چہرے سے نقاب اٹھ گئی۔ کائنات کے کندھوں پر شام کے بال بکھر گئے گویا شام ہوگئی۔ شام کے باعث اندھیرا پھیل رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سیاہ لباس مرنے کے غم کی وجہ سے پہنا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ماتم کے

دوران میں عموماً سیاہ لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے بتا بھی دیا کہ دراصل ساری دنیا سورج غروب ہونے کا ماتم کر رہی ہے۔ ایسے میں آسمان گفتگو کرنے والے ہونٹوں پر جادو کر رہا ہے اور رات کا جادوگر جاگنے والی آنکھوں پر جادو کر کے اُنھیں سلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یعنی آہستہ آہستہ تاریکی کے ساتھ ساتھ ہر طرف خاموشی بھی چھا رہی ہے اور لوگ سونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ صرف جاندار ہی نہیں بلکہ ہوا بھی خاموش ہے البتہ اس سارے پرسکون و پُرسکوت ماحول میں کہیں سے گھنٹی کی آواز آ رہی ہے۔ ایسے عالم میں میرا بے چین اور دُنیا سے نفرت کرنے والا دل مجھے زندگی کے ہنگاموں سے دور کھینچ لایا ہے اور میں قبرستان میں مرجانے والوں کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا منظر دیکھنے کے لیے قبروں کے درمیان آ بیٹھا ہوں۔

اِس بند کا کمال یہ ہے کہ اس میں مرنے والوں کا اور قبرستان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اِس منظر کشی میں الفاظ بھی ایسے لائے گئے ہیں جو ماحول سے پوری مطابقت رکھتے ہیں مثلاً گیسو کا بکھرنا، سیاہ لباس پہننا، ماتم، خاموشی اور لوگوں کا سونا وغیرہ۔

تھم ذرا بیتابیِ دل! بیٹھ جانے دے مجھے

حلِ لغات

حیرت خانۂ امروز و فردا: حال و مستقبل کے حیران کن عجائبات کا گھر۔ بیکار عناصر: عنصروں یعنی ہوا، آگ، مٹی اور پانی کی جنگ جس کے باعث موت اور زندگی ظہور میں آتی ہیں۔ ولایت: مملکت، دنیا۔ رشتہ و پیوند: تعلق۔ معیشت: معاشی، روزی۔ اندیشۂ رہزن: لوٹنے والوں کا خوف۔ خشت و گِل: اینٹ اور گارا یعنی سامانِ تعمیر۔

وضاحت

شاعر قبرستان میں پہنچتا ہے تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں اور وہ بیتاب ہو جاتا ہے۔ بیتابی کا سبب بعض سوالات ہیں جو وہ مُردوں سے پوچھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ مُردوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے غفلت کی شراب پینے والو یعنی اپنے سود و زیاں اور فرائض و واجبات سے غافل ہو جانے والو! تم اپنی دنیا کے بارے میں بتاؤ، کیا وہاں بھی روزانہ ایسے ہی معجزے اور حیران کن واقعات پیش آتے ہیں جو اس دنیا کا معمول ہیں اور کیا تمھاری دنیا میں بھی موت و حیات اور فنا و بقا کا یہی سلسلہ جاری ہے جو اس دنیا میں ہے۔ کیا اس دنیا میں بھی لوگ مبتلائے غم ہوتے ہیں اور کیا انسان وہاں بھی مجبور و بے بس ہے۔ کیا وہاں بھی لوگ لاحاصل قربانیاں دیتے ہیں جس طرح اس دنیا میں شمع کے روشن ہونے پر پروانہ اپنی جان لٹا

دیتا ہے۔ کیا اس دنیا میں بھی عشق و محبت کی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ کیا وہاں بھی شعر و شاعری کا ایسا ہی بازار گرم ہے جس طرح یہاں۔ یہاں تو مختلف تعلقات اور آلائشیں انسان کے لیے تکلیف دہ ہیں۔ کیا اُس دنیا میں بھی یہی صورت ہے۔ اِس جہان میں تو انسان کو رزق حاصل کرنے کے لئے ہزاروں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کیا اس دنیا میں بھی انسان ان تفکرات سے آزاد نہیں۔ یہاں تو انسانوں کو اپنا گھر بنانے کے لیے ہزار ہا جتن کرنا پڑتے ہیں کیا وہاں بھی انسان کو مکان بنانے کے لئے سامانِ تعمیر یا مٹی اور گارے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہاں تو انسان انسانیت اور آدمیت کے تقاضوں کو بھول کر مختلف تعصبات کا شکار ہو گیا ہے کیا اُس دنیا میں بھی اختلافات موجود ہیں اور کیا اُس دنیا میں بھی ایک دوسرے کے غم کا احساس نہیں کیا جاتا اور لوگ دردِ دل سے عاری ہیں۔

ع باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے۔ ۔ ۔

حلِ لغات

منزلِ آرام : آرام کرنے کی جگہ **؛ معصیت سوزی** : گناہوں کا جلانا **؛ تادیب** : اصلاحِ احوال کے لئے دی جانے والی سزا۔ **ہست و بود** : بود و باش **لَن ترانی** : لفظی معنی تُو نہیں دیکھ سکتا۔ حضرت موسےٰؑ کے واقعے کی جانب اشارہ ہے جب انھوں نے کوہ طور پر جا کر اللہ تعالےٰ کا جلوہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہیں یہی جواب دیا گیا تھا **؛ قتیلِ ذوقِ استفہام** : جاننے کا شیدائی **؛ کشور** : سلطنت، مملکت۔ **گنبدِ گرداں** : گردش کرتا ہوا آسمان۔

وضاحت

علامہ اقبال قبرستان میں مُردوں سے اپنے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جنت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ آیا یہ مرنے والوں کے لیے آرام کرنے کی جگہ ہے یا یہاں یہ وہ خدا کے بے نقاب جلوے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح کیا جہنم کا مقصد گناہوں کو جلانا اور اس طرح لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔ علامہ اقبال سوال کرتے ہیں کہ اس دنیا میں تو انسان اپنے مادی جسم کے ساتھ چلتا پھرتا ہے کیا اُس دنیا میں انسان مادی جسم کی قید سے آزاد ہو کر اُڑتا پھرتا ہے۔ اور یہ کہ جس چیز کو ہم موت کہتے ہیں وہ کیا ہے۔ انسانی دنیا میں تو یہاں کی بود و باش اور گذران پریشانی کا باعث بنتی ہے، کیا وہاں انسان اس فکر سے آزاد ہے۔ اس دنیا میں انسان کا علم بعض حدود کا پابند ہے کیا وہاں بھی اسی طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔ اقبال پوچھتے ہیں کہ کیا اُس دنیا میں انسان اپنے محبوبِ حقیقی کے دیدار سے محروم ہے اور کیا اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں

وہاں بھی وہی جواب دیتے ہیں جو حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر دیا گیا تھا۔ یعنی کیا انسان وہاں بھی خدا کے دیدار سے محروم رہے گا۔ اِس دنیا میں انسان تلاش وکاوش میں تسکین محسوس کرتا ہے۔ کیا مرنے کے بعد بھی اس کا یہ بنیادی جوہر اُس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ نئی نئی چیزوں کو جاننے کے شوق میں مبتلا رہتا ہے کیا اُس دنیا میں بھی نفرت اور تعصب کی وجہ سے تاریکیوں اور اندھیروں کا دور دورہ ہے۔ یا وہاں محبت اور بھائی چارے نے روشنی پھیلا رکھی ہے

اے مرنے والو! اس گردش کرتے ہوئے آسمان سے باہر کیا کیا راز پائے جاتے ہیں۔ موت انسان کے دل میں مستقل طور پر چبھنے والا ایک کانٹا ہے۔ کیا اس دنیا سے جانے والا کوئی شخص واپس آکر ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہے۔

شمع و پروانہ

(۴۰)

تعارف نظم شمع و پروانہ اپریل ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ تب یہ بارہ اشعار پر مشتمل تھی۔ نظرِ ثانی میں چار شعر حذف کر دیئے گئے۔ یہ شعر باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔ سرودِ رفتہ میں بعض ترمیم شدہ مصرعوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

۱ پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں - - -

حل لغات سیماب وار: پارے کی طرح۔ بیتاب و بے قرار: آزار، دکھ، تکلیف۔ تفتہ دل: جس کا دل دُکھا ہوا ہو یعنی عاشق۔

وضاحت علامہ اقبال شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے شمع تجھ میں ایسی کونسی خوبی ہے جس کی وجہ سے پروانہ تجھے چاہتا ہے اور یہ چھوٹا سا بے قرار پرندہ تجھ پر فدا ہونے کا آرزومند ہے۔ تیری کونسی ادا اسے پارے کی طرح بے تاب و متحرک رکھتی ہے۔ کیا تو نے اسے عشق کے طور طریقے سکھا دیئے ہیں۔ تو جہاں جلتی ہے یہ وہیں آکر تیرا طواف شروع کر دیتا ہے۔ کیا تیری نگاہ کی بجلی نے اسے جلا دیا ہے۔ یہ تیرے شعلوں میں جل کر مرتا ہے اور مرنے کی تکلیف کو بھی اپنے لئے عین راحت

تصور کرتا ہے ۔ کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ تیرا شعلہ اسے ہمیشگی کی زندگی عطا کر دیتا ہو ۔

اے شمع اگر اِس غموں سے بھری ہوئی دنیا میں تیری روشنی نہ ہو تو اس دکھیا دل پروانے کی خواہش پوری نہ ہو سکے ۔ اس کی عبادت یہی ہے کہ یہ تیرے شعلے کے سامنے جل کر ڈھیر ہو جائے ۔ دراصل اس کا چھوٹا سا دل جل مرنے کا مزا جانتا ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے پروانے کے دل میں بھی حسنِ حقیقی یعنی اللہ تعالےٰ کے عاشقوں کا سا جوش و خروش موجود ہے ۔ یعنی پروانے کا عشق بھی عاشقانِ الٰہی جیسا ہی ہے گویا شمع چھوٹے سے کوہِ طور کی مانند ہے جبکہ پروانہ حضرت موسیٰؑ کی مثال ہے جنھوں نے کوہ طور پر اللہ کا جلوہ دیکھا تھا ۔ اقبال اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروانے کو بھی روشنی کا تماشا دیکھنے کا شوق ہے اور گو یہ ذرا سا کیڑا ہے لیکن باشعور انسان کی طرح روشنی کا تمنائی ہے ۔

عقل و دِل

(۱۴)

تعارف علامہ اقبال کی یہ نظم "قادیانیوں" کی طرف سے پیغامِ بیعت کے جواب میں خطِ منظوم کے طور پر شائع ہوئی تھی ۔ پہلی بار مئی ۱۹۰۲ء کے مخزن میں چھپی ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے مطالبِ بانگِ درا میں اِس نظم کے کل اشعار کی تعداد اکتالیس بتائی ہے لیکن سرودِ رفتہ میں یہ تعداد چالیس لکھی ہے ۔ جبکہ سرودِ رفتہ میں کل ستائیس اشعار درج کئے گئے ہیں بانگ درا میں شامل تیرہ اشعار کو ملا کر کل تعداد چالیس ہی بنتی ہے ۔ یہی تعداد باقیاتِ اقبال مرتبہ عبدالواحد میں ملتی ہے ۔ نظرِ ثانی میں پہلا بند مکمل طور پر حذف کر دیا گیا جبکہ دوسرے بند کے بھی آٹھ شعر نکال دیئے گئے ۔ دیگر جزوی ترامیم کے علاوہ نظم کا عنوان بھی بدل دیا گیا ۔

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا ـ ـ ـ

حلِ لغات رسا : پہنچ رکھنے والی ، خجستہ پا : مبارک قدم، باعثِ برکت ، مفسر : تفسیر اور تشریح کرنے والی ، غیرتِ لعلِ بے بہا : انتہائی قیمتی لعل سے بڑھ کر ۔ مظاہر : ظاہری آثار ، معرفت : ذاتِ باری کی پہچان ، سدرہ : لفظی معنی بیری ،

اصطلاحی معنوں میں بہشت کا وہ درخت یا وہ مقام جس سے آگے فرشتے نہیں جا سکتے اور جو حضرت جبریل کا مقام ہے۔

وضاحت ایک دن عقل دل سے مخاطب ہوئی اور کہا کہ جو لوگ راستہ بھول جائیں یا گمراہ ہو جائیں میں انھیں راستہ دکھاتی ہوں۔ اگرچہ میں زمین پر رہتی ہوں لیکن میری پرواز اس قدر بلند ہے کہ آسمان بھی میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اسی سے تجھے میری پہنچ اور اڑان کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ میرا کام لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا ہے اور اس طرح دیکھا جائے تو میری حیثیت وہی ہے جو حضرت خضرؑ کی ہے۔ (خضرؑ کے بارے میں عام طور پر یہ روایت مشہور رہے کہ وہ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں اور دنیا میں تمام سبزی و شادابی انھیں کی مرہونِ منت ہے اور انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہے۔ قرآن شریف کی سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کا واقعہ بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خضرؑ دانائی و بصیرت کے ضمن میں حضرت موسیٰؑ سے بھی آگے تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ خضرؑ کو نبوت کا منصب حاصل نہیں ہے بلکہ یہ اہلِ تصوف کا ایک مقام ہے۔ جیسے ابدال، قطب اور غوث وغیرہ)

عقل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے کہ میں زندگی اور اس کے پوشیدہ بھیدوں کی تشریح اور وضاحت کرتی ہوں۔ خداوندِ تعالیٰ کی نشان میرے ذریعے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ عقل مزید کہتی ہے کہ دل تو صرف خون کا ایک قطرہ ہے جب کہ میں انتہائی قیمتی سرخ پتھر کے لئے بھی باعث رشک ہوں۔

دل نے عقل کی تمام باتیں سنیں اور کہا کہ جو کچھ تو نے کہا وہ سب درست ہے لیکن تجھے غور کرنا چاہیئے کہ دنیا میں میری یعنی دل کی بھی کیا حیثیت ہے؟ میں مانتا ہوں کہ تو زندگی اور اس کے بھیدوں کو جانتی ہے لیکن میں تو خود اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ تیرا واسطہ کائنات کی صرف ظاہری اشیاء اور ان چیزوں کے ظاہری آثار سے ہے جبکہ میں ان کی حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں۔ اقبال نے عقل اور عشق کا یہی فرق ایک اور جگہ یوں واضح کیا ہے۔

ے
خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہگزر ہے

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے

دل کہتا ہے کہ اے عقل تو نے دنیا میں علم پھیلایا ہے اور کائنات کے رازوں کو منکشف کیا

لیکن خدا تعالیٰ کی پہچان صرف میری وجہ سے ممکن ہے ۔ یہ کام عقل کے بس میں نہیں ۔ علامہ اقبال نے عقل کی اس خرابی کا ایک اور جگہ یوں ذکر کیا ہے ۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دل کہتا ہے کہ عقل کے ذریعے حاصل ہونے والا علم جب درجۂ کمال تک پہنچتا ہے تو اس کا نتیجہ بے قراری اور اضطراب ہے ۔ اور اس اضطراب کا علاج میرے پاس ہے ۔ یعنی تو انسانوں کو اشیاء کے ظاہری پہلوؤں سے آگاہ کر کے مزید پیچ و تاب میں مبتلا کر دیتی ہے جبکہ میں اشیاء کی حقیقت واضح کر کے انسانی ذوقِ جستجو کی تسکین کرتا ہوں ۔

اے عقل میں تسلیم کرتا ہوں صداقت کی محفل تیری وجہ سے روشن ہے لیکن حسن کی محفل میں روشنی میری وجہ سے ہے ۔ صداقت کے لغوی معنی سچائی اور راست بازی کے ہیں لیکن یہاں پر وہ آفاقی اصول اور قانون مراد ہیں جو منطق و استدلال کی ہر کسوٹی پر پورے اترتے ہیں اور جنھیں انسان نے عقل کی مدد سے دریافت کیا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس طرح کے قواعد و ضوابط بنانے میں عقل انسان کی مدد کرتی ہے لیکن حسن کی تلاش و جستجو صرف عشق اور دل کا وظیفہ ہے ۔

دل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ عقل محض زمان و مکاں سے متعلق ہے یعنی اس کی پرواز صرف وہاں تک ہے جہاں تک حواسِ خمسہ اس کی مدد کریں جبکہ دل ایسا پرندہ ہے جو سدرہ کو اپنی منزل بناتا ہے ۔ سدرہ وہ مقام ہے جہاں زمان و مکان کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ دل کہتا ہے کہ میری عظمت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں اللہ تعالےٰ کے عرش کی حیثیت رکھتا ہوں یعنی اللہ تعالےٰ انسان کے دل میں رہتا ہے اسی وجہ سے دل کو عرش قرار دیا گیا ۔

"عقل و دل" علامہ اقبال کی شاعری کے پہلے دور کی نظم ہے لیکن اپنے مرکزی خیال اور موضوع کے باعث اس کا تعلق اُن نظموں سے بنتا ہے جو تیسرے دور میں لکھی گئیں ۔ اس لیے کہ اس میں فلسفۂ خودی کے بنیادی نقش و نگار بھی موجود ہیں اور عقل و عشق کے بارے میں وہ رویہ بھی ملتا ہے جس نے اقبال کے ہاں معرکۂ عقل و عشق کو جنم دیا ۔ یہاں پر غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بعض ناقدین علامہ اقبال کو عقل کا مخالف تصور کرتے ہیں لیکن صرف اسی نظم کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دیگر مسائل و موضوعات کی طرح اس ضمن میں بھی فکرِ اقبال نے توازن کی بنیادی خوبی کو برقرار رکھا ہے ۔

صدائے درد

(۴۲)

تعارف مخزن میں صدائے درد کے سنہ اشاعت کے بارے میں محققین اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ یوسف سلیم چشتی کے مطابق یہ نظم جون سنہ ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی، نسیم امروہوی کے نزدیک اس کا سنہ اشاعت جون سنہ ۱۹۰۳ء ہے جبکہ عبدالواحد معینی اور محمد عبداللہ قریشی کے نزدیک یہ نظم جون سنہ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ مولانا مہر نے سرودِ رفتہ اور مطالبِ بانگِ درا میں یہی ماہ و سالِ اشاعت لکھا ہے اور یہی درست بھی ہے۔ نسیم امروہوی کے مطابق اس نظم کے کل شعر نواسی تھے نظرِ ثانی میں صرف اکہتر رکھے گئے لیکن یہ رائے کسی طور قابلِ تسلیم نہیں ہے، مولانا مہر نے لکھا ہے کہ کل تیس شعر تھے۔ گیارہ شعر پہلے بند میں تھے اور انیس دوسرے بند میں۔ بانگِ درا میں صرف نو شعر شامل ہیں جو دو بندوں پر مشتمل ہیں۔

صدائے درد علامہ اقبال کی پہلی نظم ہے جس میں وطن پرستی سے متعلق نظریات وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ۔۔۔

حلِ لغات **کل پڑنا**: چین اور آرام ملنا، **محیطِ آبِ گنگا**: دریائے گنگا کا پانی، **قربِ فراق انگیز**: دوری بڑھانے والی قربت، **نغمہ پیرائی**: نغمے گانا مراد تحریر و تقریر، **اختلاط**: میل جول۔

وضاحت علامہ اقبال اہلِ ہندوستان میں نا اتفاقی اور اس کے نقصانات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اہلِ ملک کا نفاق دیکھ کر کڑھ رہا ہوں اور مجھے کسی طرح بھی چین و آرام میسر نہیں۔ ایسے میں شاعر راحت کا صرف ایک ہی پہلو دیکھتا ہے کہ وہ دریائے گنگا میں ڈوب جائے اور اس طرح وہ اُس کرب انگیز کیفیت سے نجات حاصل کرلے جو اہلِ ہند کے باہمی اختلافات کے باعث اُس کا مقدر ہو چکی ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ایسی جگہ ہے جہاں کے لوگوں میں حد درجہ تفرقہ پایا جاتا ہے اور یہاں کی مختلف قومیں ایک دوسرے کے قریب رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور ہیں اور اصل میں ایک ساتھ رہنا ہی نفرت کا سبب ہے۔ علامہ اقبال کے

اس مصرع کا مطلب ہندوستان کے طول و عرض میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک ہی جگہ رہنے کے باعث ان میں خیالات و عمل کی وحدت پیدا ہونی چاہیئے تھی لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک ہی کھلیان کے دانے ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہنا چاہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جس ملک کے رہنے والے بھائی چارے اور باہمی اخوت سے ناآشنا ہوں اس ملک میں شاعری کرنا اور لوگوں کو متحدہ مقاصد کی طرف بلانا بے لطف اور کارِ فضول ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ میں تو اہلِ ہند میں قربِ مکانی کی بجائے فکر و عمل کی وحدت کا خواہاں ہوں اور ایسے میل جول سے گھبراتا ہوں جو دریا کی موجوں اور کناروں کے ملاپ کی طرح تصادم کی کیفیت پیدا کرے۔

دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں - - -

حلِ لغات دانۂ خرمن نما: وہ دانا جس سے کھلیان کی کیفیت معلوم ہو سکے؛ شاعرِ معجز بیان: بیان یا کلام کے ذریعے معجزے دکھلانے والا شاعر یعنی بہت ہی اچھا شاعر؛ خود نما: اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا، مغرور؛ آتشِ پیکار: لڑائی جھگڑے کی آگ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ایک دانے سے پورے خرمن کا حال اور کیفیت معلوم کی جا سکتی ہے اسی طرح شاعر بھی پوری قوم کا آئینہ ہوتا ہے لیکن جس طرح خرمن کی تباہی سے دانے کا انفرادی وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر قوم ہی نہ ہو تو پھر اس کا شاعر کہاں سے آئے گا۔ گویا علامہ اقبال کے نزدیک جب تک لوگ اپنے اختلافات بھول کر حصولِ مقاصد کے لیے متحد نہیں ہو جاتے اُس وقت تک، ایک ہی ملک میں رہنے کے باوجود وہ قوم نہیں بن سکتے۔ وہ انسانوں کے متفرق گروہ ہی رہتے ہیں اور ایسے گروہوں میں اچھے شاعر پیدا نہیں ہوا کرتے۔ اقبال کا خیال ہے کہ جب تک حسن کی تحسین کرنے والے نہ ہوں اُس وقت تک حسن خود کو نمایاں نہیں کیا کرتا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح محفل کے بغیر شمع نہیں جلتی۔ گویا اقبال کے نزدیک شاعر کی حیثیت وہی ہے جو حسن اور شمع کی ہے اور چونکہ علامہ اقبال کے نزدیک ہندوستانی ایک قوم نہیں بن سکے لہٰذا انھیں شعر گوئی ترک کر کے خاموش ہو جانا چاہیئے اور قدرت نے انھیں جو صفت یا صلاحیت عطا کی ہے اُسے ختم کر دیا جائے۔

شاعر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بدقسمتی سے میں نے ایسے وقت شاعری شروع کی جب ہندوستان یہاں کے باسیوں کی باہمی لڑائی کی وجہ سے جل چکا ہے۔

آفتاب

(۴۳)

تعارف یہ نظم پہلی بار اگست ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظم کے ساتھ علامہ اقبال کا تمہیدی نوٹ بھی چھپا تھا جس کی وجہ سے نظم کی حقیقی معنویت سمجھنے میں مدد ملتی ہے علامہ اقبال نے لکھا تھا۔

"ذیل کے اشعار "رگ وید" کی نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو "گایتری" کہتے ہیں۔ یہ دُعا عبودیت کی صورت میں اُن تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدے سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل والنحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتا چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنا پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ زبانِ سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا ہے جس کے لیے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے۔ لیکن اصل میں اسی لفظ سے مراد اس آفتاب سے ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیاء کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے اللہ نور السمٰوات والارض اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ افلاطونِ الٰہی کے مصری

پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں دقت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور روحانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروفِ علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نراین اپنشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کے ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔"

۵ اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو ـ ـ ـ ـ

حلِ لغات

روح و روانِ جہاں: زمانے کی روح (روح اور رواں ہم معنی الفاظ ہیں) **شیرازہ بند**: جلد باندھنے والا، ربط پیدا کرنے والا؛ **دفترِ کون و مکاں**: دنیا کا رجسٹر مراد کائنات؛ **نمود**: ظاہر ہونا؛ **ہست و بود**: دنیا؛ **ثبات**: استقلال، قرار، قیام، موجودگی؛ **ضیائے شعور**: عقل و فہم کی روشنی؛ **ساماں طراز**: ترتیب دینے والا؛ **یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز**: بلندی و پستی میں رہنے والوں کا خدا، پروردگار، پالنے والا؛ **زائیدگانِ نور**: نور سے پیدا ہونے والے مراد فرشتے؛ **تاجدار**: بادشاہ۔

وضاحت

علامہ اقبال سورج سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اس دنیا کی حقیقی روح تو ہی ہے۔ یعنی تیرے ہی دم سے یہ دنیا قائم ہے اور اس ساری کائنات میں تیری ہی وجہ سے ضبط و تنظیم قائم ہے۔ اے آفتاب! بقا و فنا یعنی زندگی و موت کے اظہار و نمائش کی حقیقی وجہ تو ہی ہے اور تیری ہی وجہ سے اس دنیا کی چہل پہل اور رونق قائم ہے۔ تیری ہی وجہ سے یہاں پر تخلیق و ترتیب کا عمل جاری و ساری ہے اور تیرے ہی فیض سے ہر چیز میں زندگی موجزن ہے۔ تیری ہی وجہ سے ہر شے کو استقلال حاصل ہے اور تیرا ہی سوز و ساز زندگی کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ اے آفتاب! تو زندگی میں کبھی دل، کبھی خرد، کبھی تڑپتی اور حرکت کرتی

ہوئی روح اور عقل و فہم کی صورت میں موجود ہے۔ یعنی انسان میں یہ مندرجہ بالا جملہ صلاحیتیں صرف تیری وجہ سے بروئے کار آتی ہیں اور اپنے فرائض ادا کرتی ہیں۔

اقبال دعائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے آفتاب ہمیں فہم و فراست کی روشنی عطا کر اور ہماری فہم و بصیرت کو اپنے نور سے منور کر دے۔ اس دنیا کو ترتیب دینے اور اس میں نظم پیدا کرنے والی تیری ہی ذات ہے اور تو ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا خدا ہے۔ ہر ذی روح میں تیرا ہی کمال جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ بے جان اشیاء مثلاً پہاڑ وغیرہ بھی تیرے ہی فیضان سے قائم و دائم ہیں۔ ہر شے کو پالنے والا تو ہے یہاں تک کہ فرشتوں کا بادشاہ بھی تو ہی ہے۔ تو آغاز و انجام اور اوّل و آخر کی قید سے آزاد ہے۔ یعنی تیری ذات ازلی و ابدی ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

واضح ہو کہ اس نظم میں آفتاب سے مراد ہماری دنیا کا سورج نہیں ہے بلکہ وہ ہستی ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی توضیح طلب ہے کہ اس نظم میں علامہ اقبال کے ذاتی نظریات و خیالات کو کوئی دخل نہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی ایک مقدس دعا کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

شمع

(۴۴)

تعارف شمع پہلی مرتبہ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی۔ اُس وقت اس کے چالیس شعر تھے۔ بعد ازاں جزوی ترمیمات کے علاوہ گیارہ شعر حذف کر دیئے گئے۔ ان میں سے دس شعر سرودِ رفتہ میں شامل ہیں جبکہ ایک شعر روزگارِ فقیر جلد دوم میں شائع ہو چکا ہے۔

۱ بزمِ جہاں میں مَیں بھی ہوں اے شمع! دردمند ـــ ـــ ـــ

حل لغات فریاد در گرہ: ہر وقت فریاد کرنے پر آمادہ ؛ **صفتِ دانۂ سپند**: ہرمل کے دانے کی طرح ؛ **گل فروش**: پھول بیچنے والا ؛ **اشک شفق گوں**: شفق جیسے آنسو یعنی خون کے آنسو ؛ **ہم کنار**: ہم آغوش، قریب ؛

وضاحت علامہ اقبال شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے شمع میں بھی تیری طرح درد مند اور دکھیا

ہوں اور ہرمل کے دانے کی طرح ہمہ وقت نالہ و فریاد اور آہ و زاری پر آمادہ رہتا ہوں ۔ ہرمل کے دانے کو آگ میں ڈالا جائے تو اُس سے چٹخنے کی آواز آتی ہے جسے شاعر نے ہرمل کی فریاد سے تعبیر کیا ہے ۔ گویا شاعر کہتا ہے کہ جس طرح ہرمل آگ میں گرتے ہی آواز پیدا کرتا ہے اسی طرح میں بھی ہر وقت نالہ و فریاد پر آمادہ رہتا ہوں ۔ شاعر کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح عشق نے شمع کو باطنی جلن اور گرمی عطا کی ہے اسی طرح عشق نے شاعر کو بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا ہے ۔

اقبال خطاب جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے شمع تو کسی عشرت کدے میں جلے یا کسی مزار پر روشنی کر رہی ہو یعنی خواہ تو مسرت و شادمانی کے جذبے سے سرشار ہو خواہ مبتلائے غم ہو تجھے ہر حال میں آنسو بہانے پر مجبور رہنا پڑتا ہے ۔ شمع کے جلنے پر پگھلے ہوئے موم کے جو قطرے گرتے ہیں ، شاعر نے انھیں شمع کے آنسو قرار دیا ہے ۔

؎ یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

یک بیں : سب کو برابر دیکھنے والی ؛ عاشقانِ راز : قدرت کے بھیدوں کے عاشق مایۂ آشوب امتیاز : تفریق اور اختلاف کا فتنہ پیدا کرنے والی ؛ دود سیاہ : کالا دھواں ۔

وضاحت

اے شمع تو قدرت کے رازوں کے شیدائیوں کی طرح یک بیں ہے یعنی جس طرح یہ لوگ اچھے برے اور کھوٹے کھرے میں تمیز کئے بغیر سب کو مساوی درجہ دیتے ہیں اسی طرح تو بھی سب کے ساتھ برابری اور مساوات کا سلوک کرتی ہے ۔ جبکہ میری نگاہ اُس دولت سے مالا مال ہے جو امتیازات اور تفریق و تفرقہ پیدا کرنے کا سبب بن جائے ۔ یعنی میں حقائق حیات کا مشاہدہ غیر جانبدار ہو کر نہیں بلکہ مختلف تعصبات کے حوالے سے کرنے کا عادی ہوں ۔

اِس شعر میں لطف یہ ہے کہ شمع کا صرف ایک ہی شعلہ ہوتا ہے اور اگر اسے شمع کی آنکھ فرض کر لیا جائے تو وہ واقعی یک بیں قرار پائے گی ۔ بہر حال علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے شمع تو امتیازات سے دامن بچائے ہوئے ہے جبکہ میری نظر اختلاف و افتراق کے ہنگاموں میں الجھی ہوئی ہے ۔ تری روشنی کعبے اور بت خانے دونوں کو برابر منور کئے ہوئے ہے جبکہ میں کعبے اور بت خانے میں فرق روا رکھتا ہوں ۔

اے شمع تیرے جلنے کے باعث جو دھواں نکلتا ہے وہ آہ کی مانند ہے ۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیرے بظاہر بے جان جسم میں کوئی دل چھپا ہوا ہے ۔

؎ جلتی ہے تو کہ برقِ تجلی سے دور ہے ۔ ۔ ۔

حلِ لغات جلتی ہے : کڑھتی ہے، غمزدہ ہوتی ہے ۔ سوزِ دروں = اندرونی یا باطنی جلن ۔ سیماب وار : پارے کی طرح ۔ ناز : چونچلا، غمزہ، ادا، جان کر کوئی ایسا عمل کرنا جس سے عاشق کا دل تڑپ جائے ۔ بے نیاز : بے پروا، محبوبِ حقیقی ۔

وضاحت اے شمع ! تُو تو اس بات پر کڑھ رہی ہے کہ تو روشنی کے اصل منبع سے دور ہے جبکہ تجھے دیکھنے والے تیری اس جلن کو روشنی خیال کرتے ہیں ۔ اِس شعر میں کمال یہ ہے کہ شمع کے لیے لفظ "جلتی ہے" استعمال ہوا ہے جو اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں پورا اترتا ہے اقبال کہتے ہیں کہ اے شمع تو جلتی ہے لیکن تیری بدقسمتی یہ ہے کہ تجھے اپنے جلنے کا پتا نہیں ہے ۔ اگرچہ تو آنکھ رکھتی ہے لیکن اپنی باطنی جلن کو نہیں دیکھ سکتی ۔ جبکہ میری کیفیت یہ ہے کہ میں بے چینی اور بیتابی کے باعث پارے کی طرح تڑپ رہا ہوں اور اپنی اس اضطراری کیفیت کا سبب بھی جانتا ہوں ۔ یہ میرے محبوبِ حقیقی کا ایک خاص انداز تھا کہ اُس نے مجھے میرے جلنے اور پگھلنے کا احساس عطا کر دیا ۔

؎ یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار ۔ ۔ ۔

حلِ لغات آگہی : سمجھ، شعور ۔ خوابیدہ : سوئے ہوئے ۔ امتیازِ رفعت و پستی : اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق ۔ بُستان : بوستان کا مخفف مراد باغ ۔ اصل : جڑ، بنیاد ۔ کشاکش : کھینچ تان ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے آگہی اور ذات کا جو شعور دیا گیا ہے یہ اگرچہ بظاہر ایک معمولی سی چنگاری نظر آتا ہے لیکن اس میں ہزاروں آتشکدے موجود ہیں ۔ یعنی بہت زیادہ حرارت و گرمی پوشیدہ ہے ۔ یہی آگہی ہے جس کے باعث اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق قائم ہے ۔ یہی آگہی ہے جو پھول کی خوشبو اور شراب کی مستی میں الگ الگ شناخت اور پہچان قائم کرتی ہے ۔ اسی آگہی کی بدولت باغ بلبل، پھول اور خوشبو کا فرق قائم ہے اور مختلف مظاہرِ قدرت کا الگ الگ تشخص موجود ہے ۔ یہ آگہی ہی مختلف افراد کے درمیان اختلافات کا باعث بن جاتی ہے ۔

؎ صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق ۔ ۔ ۔

حلِ لغات صبحِ ازل : کائنات کی تخلیق کا لمحہ ۔ دل ستاں : دل چھیننے والا ۔ آوازِ کُن : کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حکم "ہو جا" کے تحت ساری کائنات کو پیدا کیا ۔ اللہ کے اس حکم کی طرف اشارہ ہے ۔ تپش آموز : تڑپ سکھانے والا ۔ خوابِ پریشاں : بکھرا ہوا خواب ۔

حجابِ وجود: جسم کا پردہ ؛ **زیبِ درختِ طور:** کوہِ طور کے درخت کے لائق ؛ **غربت کا غمکدہ:** مراد دنیا ۔

وضاحت

جب کائنات تخلیق ہوئی اور حُسن نے عشق کو اپنا گرویدہ بنانا چاہا تو "کُن" کی آواز نے عاشق کی روح میں ایک تڑپ پیدا کر دی ۔ اس روز عاشق یعنی انسان کو یہ حکم دیا گیا کہ اب خدا کے حکم یعنی "کُن" کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رونق دیکھ اور اپنی بصیرت و بصارت سے سینکڑوں ایسے خواب دیکھ جو بکھرے ہوئے ہیں اور جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ واضح رہے کہ صوفیا ۔ اس دنیا کو ہمیشہ سے ایک خواب ہی قرار دیتے ہیں ۔ مثلاً خواجہ میر درد کہتے ہیں ۔

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ، جو سنا افسانہ تھا

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے پیدا کر کے میرے وجود اور جسم کو ایک پردا بنا دیا گیا ہے ۔ یعنی میرے وجود ہی نے مجھے اپنی حقیقت سے بے خبر اور غافل کر دیا ۔ یوں گویا میری تخلیق اور ظہور کے باعث حقیقتِ ازل سے میرے ہجر کا آغاز ہو گیا ۔ پہلے میں ہر طرح کی قید سے آزاد تھا لیکن اب مجھے قید کر دیا گیا ہے ۔ وہ دور گزر گیا جب میرا گھر یا مقام کوہِ طور کے درخت پر تھا یعنی جب میں کسی حجاب اور پردے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھا کرتا تھا ۔ دراصل یہ شعر وحدت الوجود کے اس اہم اور بنیادی نظریے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی رو سے انسان سمیت ہر شے خدا کی ذات کا حصہ تھی ۔ جیسا کہ غالب بھی کہتا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیا کی تخلیق کے ساتھ ہی وہ دور ختم ہو گیا اور اب تو صورت یہ ہے کہ میں قید میں ہوں اور بدقسمتی سے اپنے قفس ہی کو چمن تصور کر رہا ہوں ۔ البتہ اپنے وطن کی یاد کبھی کبھی مجھے غمگین کر دیتی ہے اور یہ یاد کبھی فکر و نظر کے شوق کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کچھ پانے کی خواہش کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے ۔ یعنی کبھی تو میں محبوبِ حقیقی کے بارے میں غور و فکر کرتا اور سوچتا ہوں اور کبھی اُسے پانا چاہتا ہوں ۔

اے شمعِ انتہائے فریبِ خیال دیکھ - - -

حلِ لغات

انتہائے فریبِ خیال: تصور یا گمان کی سمت غلطی ؛ **مسجودِ ساکنانِ فلک:** جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا یعنی انسان ۔ **ثریا نشاں:** بہت بلند ؛ **آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں:** کائنات کا انتظام کرنے والی ہستی کی طبیعت سے مناسبت رکھنے والا ؛

مآل: انجام، نتیجہ۔ **چشم غلط نگہ:** غلط دیکھنے والی آنکھ۔ **طوقِ گلو:** گلے کی زنجیر۔ **اسیرِ فریب نگاہ:** نظر کے دھوکے کا قیدی۔ **ناز:** ادا، یہاں مراد محبوب۔ **نیاز:** یہاں مراد عاشق۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اے شمع تو ہمارے تصور اور خیال کی غلطی کا اندازہ کر کہ ہم فانی انسان خود کو اس کائنات کی مستقل ہستی تصور کرنے لگے ہیں۔ اُس انسان کا یہ انجام کسقدر افسوسناک ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ میں اب اپنی حقیقت یعنی خدا سے بہت دور ہوں اس کے باوجود میں بہت بلند ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طبیعت سے مکمل طور پر مناسبت رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خدا نے مجھے پیدا کیا تو اس نے مجھے کائنات کے تمام مظاہر پر فوقیت دی۔ گو میری پاک اور منزہ روح کو مٹی کے جسم میں قید کر دیا گیا ہے اور میرا ظاہری وجود بہت ارزاں اور کم قیمت ہے لیکن اس میں مقید روح بہت قیمتی ہے۔ اقبال نے ان تین شعروں میں رعایت لفظی کا کمال دکھا دیا ہے۔ مضمون کی رعایت سے ناظم، باندھنا، تحریر، دیوان اور بندش وغیرہ کتنے ہی لفظ آ گئے ہیں۔ اس پر مستزاد بندش کا سست ہونا اور مضمون کی بلندی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کی اس بلندی کے باوجود اس کی غلط بیں نگاہ نے اُسے غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہاں پر جتنے لوگ ہیں وہ سب کے سب اپنی حقیقت کو فراموش کر کے ذاتی شعور کا اظہار چاہتے ہیں اور یوں دنیا میں امتیاز و افتراق کی خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے۔

وقت کی گذران کا ایک سلسلہ ایک بڑی رسی کی مانند ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی گردن کے لیے بنایا ہے یعنی انسان وقت کا اسیر ہے۔ اگرچہ مجھے بحیثیتِ انسان اپنی منزل تک پہنچنے کا شوق ہے لیکن میں اپنے راستے سے بھٹک چکا ہوں اور میں اپنی نگاہوں کے دھوکے میں آ گیا ہوں جنھوں نے حقیقت کو میری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ حالانکہ اس کائنات میں شکاری کی حیثیت بھی میری ہی ہے اور جال کا وہ دائرہ بھی میں خود ہی ہوں جو ستم ڈھانے کے لیے بچھایا گیا ہے۔ حرم کی چھت بھی میں خود ہوں اور اس چھت پر بیٹھے ہوئے پرندے کی حیثیت بھی میری ہی ہے۔ بہت کچھ غور و فکر کرنے کے باوجود بھی یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ اس دنیا میں میری حقیقت کیا ہے؟ میں حسن ہوں یا جسم و جان کو پگھلا دینے والا عشق۔ میں محبوب ہوں یا میری حیثیت ایک عاشق کی ہے۔

اسی بنا پر مجھے اس امر کا اندیشہ ہے کہ میرے ہونٹ اور زبان کہیں پھر وہی پرانا راز نہ کہہ دیں جس کے بعد پھانسی اور موت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشارہ حسین بن منصور حلاج کی طرف ہے جس نے وحدت الوجودی نظریات کے باعث "انا الحق"، یعنی "میں خدا ہوں"، کا نعرہ لگایا اور جسے

سولی پر لٹکا دیا گیا ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے ازل کے رازوں سے پردہ اٹھا دیا تو میرا انجام بھی وہی ہوگا جو منصور بن حلاج کا "انا الحق" کہنے پر ہوا تھا۔

ایک آرزو

۴۶

تعارف نظم "ایک آرزو" دسمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی ۔ بانگِ درا میں اس کے بیس شعر شامل ہوئے ہیں۔ یہ نظم ترکیب بند ہیئت کے ایک بند کی مانند ہے۔ جب یہ نظم مخزن میں شائع ہوئی تھی تو دو بندوں پر مشتمل تھی اور اس کے اشعار کی تعداد بیس تھی نظر ثانی میں دوسرا بند اور پہلے بند کے پانچ شعر حذف کر دیئے گئے ۔

ایک آرزو بانگ درا میں ایک مستقل نظم کے طور پر شامل ہے جبکہ حمید احمد خان نے اپنی کتاب اقبال، شخصیت و شاعری میں یہ صراحت کی ہے کہ "ایک آرزو" سیمیوئل راجرز کی نظم "A WISH" کا آزاد ترجمہ ہے۔

۵ دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب - - -

حلِ لغات دل بجھنا: مایوس ہو جانا، دل میں کسی اُمنگ اور آرزو کا نہ رہنا؛ شورش: ہنگامہ؛ فدا: نثار، قربان؛ عزلت: تنہائی؛ کانٹا نکلنا: خلش کا دور ہونا؛ جہاں نما: دنیا دکھانے والا؛ اشارہ ہے جام جمشید کی طرف جس کے ذریعے جمشید ساری دنیا کے حالات معلوم کر لیتا تھا۔ جلوت: بزمِ محفل۔ خلوت: تنہائی؛ کھٹکا نہ ہونا: ڈر نہ ہونا؛ درا: گھنٹی ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں دنیا کے ہنگاموں سے اکتا گیا ہوں اور ایسی صورت میں جبکہ دل ہر طرح کی امنگوں سے خالی ہو گیا ہو، انجمن آرائی کا لطف بھی کیا رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل ہر طرح کے ہنگاموں سے متنفر ہو چکا ہے اور میں ایسی خاموشی کا متلاشی ہوں جس پر گفتگو بھی قربان ہو جائے ۔ واضح رہے کہ انسان فطری طور پر خاموشی کی نسبت گفتگو کو پسند کرتا ہے ۔ لیکن مایوس و افسردہ شخص کے دل کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ شور و غل سے دور کسی گوشۂ

تنہائی میں وقت گذارنا چاہتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میں خاموشی کو پسند کرتا ہوں۔ اسی بناء پر میری یہ خواہش ہے کہ میں شہر کی ہنگامہ خیز زندگی کو چھوڑ کر کسی پہاڑ کے دامن میں چلا جاؤں اور وہاں اپنا جھونپڑا بنالوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ہر طرح کے غموں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرلوں اور تنہائی میں اس طرح اپنا وقت گذار لوں کہ ہر طرح کے غموں کی خلش میرے دل سے دور ہو جائے۔ پہاڑ کے دامن میں چڑیوں کے چہچہانے سے نغموں کا سا لطف پیدا ہو رہا ہو اور چشمے کے پانی کے بہنے کی وجہ سے ایسی دلفریب آوازیں پیدا ہو رہی ہوں جیسے کوئی باجا بجا رہا ہو۔ کلیوں کے چٹکنے کی معمولی سی آواز میرے لیے کسی کا پیغام ثابت ہو اور جس طرح جمشید کا پیالہ اُسے ساری دنیا کے حالات بتا دیا کرتا تھا، اِس طرح پھولوں اور کلیوں کے یہ ذرا ذرا سے ساغر میرے لئے جامِ جہاں نما بن جائیں اور ان کے چٹکنے کی آوازوں سے میں ساری دنیا کے حالات جان لوں۔

اِس میں شاعر دراصل کہنا یہ چاہتا ہے کہ میں دنیا کے حالات کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے فکر مند نہیں ہوں بلکہ کلیوں کا چٹکنا اور پھولوں کا کھلنا ہی میرے لیے کل کائنات ہوگی اور یہی میری دلچسپیوں کا مرکز ہوگا۔

شاعر کہتا ہے کہ ایسی زندگی ہر طرح کے تکلفات سے پاک ہوگی اور میں سونے کے لیے آرام دہ بستر کی بجائے اپنے ہاتھ کو اپنا تکیہ بناؤں گا اور وادیٔ کوہ میں اگے ہوئے سبزے کو اپنا بچھونا تصور کروں گا اور میری اس تنہائی میں ایسا انداز ہوگا کہ اس کے مقابلے میں محفلوں کا تصنع اور تکلف ہیچ ہوگا۔

علامہ کہتے ہیں کہ میں اِس ماحول میں اپنے آپ کو اِس طرح مدغم کر دوں گا کہ بلبل تک مجھ سے اُنس و محبت محسوس کرنے لگیں گے اور اس کے ننھے سے دل میں میری طرف سے کوئی خوف یا ڈر نہ ہوگا۔

اب اقبال دامنِ کوہ میں بہنے والی ندی کا ذکر کرتے ہوئے منظر نگاری کا کمال دکھاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ندی کے دونوں کناروں پر سر سبز و شاداب درخت اِس انداز اور اِس ترتیب سے کھڑے ہوں جیسے انھوں نے صف باندھ رکھی ہے۔ اِس کے علاوہ ندی کے صاف و شفاف پانی میں ان کی خوبصورت تصویر بھی منعکس ہو رہی ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ اِس کہسار کا نظارہ اس قدر دلکش ہو کہ ندی کا صاف پانی بھی موج کی صورت میں اٹھ اٹھ کر اس منظر کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہو۔ واضح ہو کہ پانی میں موجیں اور لہریں اٹھتی ہیں تو ان کا پانی ندی کی عام سطح سے قدرے بلند ہو جاتا ہے۔ اس سے شاعر نے یہ مضمون باندھا ہے۔ اِس شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل کو بڑی خوبصورتی سے برتا گیا ہے

شاعر کہتا ہے کہ وادیٔ کوہ میں سبزہ اِس انداز میں اگا ہوا نظر آتا ہے جیسے وہ زمین کی گود میں محوِ خواب

ہو۔ اس کے علاوہ سطح زمین پر پھیلا ہوا پانی مختلف جھاڑیوں کے درمیان میں سے چمک رہا ہو۔ ندی کے کنارے اُگے ہوئے پھولوں کی ٹہنی اِس انداز میں پانی کو چھو رہی ہو جیسے وہ پانی کو چھو نہیں رہی بلکہ ندی کے صاف وشفاف پانی کو آئینہ سمجھ کر اس میں اپنے حسُن کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ شعر بھی صنعتِ حسنِ تعلیل کی بڑی عمدہ مثال ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ پہاڑ کی اس وادی میں جب شام ہو تو ہر طرف پھیلنے والی شفق پھولوں کو بھی سرخی مائل سنہرا لباس پہنا دے۔ جب راتوں کو سفر کرنے والے لوگ تھک جائیں تو میرے جھونپڑے میں جلنے والا چراغ ان کو آبادی کا نشان بتا کر ان کے دلوں میں امید کی کرن روشن کر دے۔ اس ماحول میں جب آسمان بادلوں سے گھرا ہوا ہو اور چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہو، بجلی کے چمکنے سے ان مسافروں کو میرا جھونپڑا نظر آجائے اور صبح کو اذان دینے والی کوئل جب نغمے گائے تو میں بھی اس کا ساتھی بن جاؤں اور اس کے ساتھ گانے گاؤں۔ مَیں صبح کو بیدار ہونے کے لئے مسجد میں ہونے والی اذان اور مندر میں بجنے والے ناقوس کا محتاج نہ ہوں بلکہ میرے جھونپڑے کے سوراخ کے ذریعے اندر آنے والی روشنی مجھے صبح کا بتا دیدے اور علی الصبح جب پھول شبنم سے تر ہو جائیں۔ ہیں آنسوؤں سے وضو کروں اور آہ و زاری کے ذریعے دُعا کروں۔

اِس پرسکوت ماحول میں میرے نالے اور آہ و زاری اس قدر بلند ہو کر ستاروں کے قافلے کے لئے بھی گھنٹی کی آواز ثابت ہو۔ واضح رہے کہ اگلے زمانے میں سفر شروع کرنے سے قبل ایک گھنٹی بجائی جاتی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ اب قافلہ سفر شروع کرنے والا ہے اور لوگ تیار ہو کر شریکِ سفر ہو جاتے تھے۔ گویا شاعر کہنا چاہتا ہے کہ میرے نالوں کی آواز کے ساتھ ستارے اپنا سفر شروع کریں۔

اقبال کہتے ہیں کہ میری آہ وزاری شاید ہر درد رکھنے والے دل کو رونے پر مجبور کر دے اور جو لوگ خوابِ غفلت کے باعث بیہوش ہیں، انھیں عمل کی طرف مائل کر دے۔

خیال رہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کے ہر دور میں اُن کے بنیادی موضوعات تقریباً بدلتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا شعر و فن کا تصور ہر دور میں ایک ہی رہا یعنی اس کے ذریعے درماندہ و پسماندہ قوم و ملّت کی خدمت کی جائے مثلاً وہ دوسرے دور میں کہتے ہیں ؎

مَیں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اسی طرح تیسرے دور کا ایک شعر ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

آفتابِ صُبح

(۲۸)

تعارف یہ نظم مسدس ہیئت میں ہے۔ پہلی بار "خدنگ نظر" لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی وقت اس نظم کے آٹھ بند تھے۔ بانگِ درا میں دو بند حذف کر دیئے گئے اور ایک بند بڑھا دیا گیا۔ حذف شدہ بند باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔

؎ شورشِ میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو ۔ ۔ ۔

حلِ لغات **شورشِ میخانۂ انساں** : انسان کے میخانے کے ہنگامے، وہ میخانہ جہاں انسان کے ہنگامہ برپا ہیں مراد دنیا۔ **زینتِ بزمِ فلک** : آسمان کی محفل کی رونق۔ **دُرِ گوشِ عروسِ صبح** : صبح کی دلہن کے کان کا موتی۔ **سیمائے اُفق** : افق کی پیشانی۔ **داغِ مدادِ شب** : رات کی تاریکی کا داغ۔ **چشمِ ظاہر** : ظاہری آنکھ۔ **چشمِ باطن** : حقیقی آنکھ، دل کی آنکھ۔ **زنجیرِ تعلق** : تعلقات کی زنجیر۔ **زیر و بالا** : اعلیٰ و ادنیٰ۔ **سرشک آباد** : آنسوؤں سے تر۔ **بستۂ رنگِ خصوصیت** : کسی خاص جماعت سے وابستگی اور تعلق۔ **عقدۂ اضداد** : دنیا کے اختلافات کی مشکل۔ **حسنِ عالم آرا** : دنیا کو سجانے والا حُسن۔ **زحمت کشِ ہنگامۂ عالم** : دنیا کے مصائب برداشت کرنے والا۔ **ہمسر** : برابر۔ **یک ذرۂ خاکِ درِ آدم** : انسان کے دروازے کی خاک کا ایک ذرہ۔ **نورِ مسجودِ ملک** : وہ نور جسے فرشتوں نے سجدہ کیا، مراد انسان۔ **منت پذیر** : احسان اٹھانے والا۔ **کشودِ عقدۂ مشکل** : مشکلات کی گرہ کھولنا، مراد مشکلات دور کرنا۔ **دردِ استفہام** : پوچھنے اور جاننے کا درد۔

وضاحت علامہ اقبال سورج سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے سورج تو انسانی دنیا کے ہنگاموں سے بہت بلند ہے۔ بلند ان معنوں میں بھی کہ وہ زمین سے بہت دور ہے اور

ان معنوں میں بھی کہ سورج کو انسانی دنیا کے حالات و واقعات سے کوئی تعلق نہیں ۔ علامہ سورج کو ساغر سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو ایسا پیالہ ہے جس سے انسان کی محفل یعنی دنیا کی رونق قائم ہے ۔ سورج کو موتی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو صبح کی دلہن کے کان کو زینت بخشنے والا موتی ہے ۔ تو اس قدر خوبصورت زیور ہے کہ تجھ پر اُفق کی پیشانی بھی ناز کرتی ہے ۔ یعنی جب تو طلوع ہوتا ہے تو افق کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں ۔ اے سورج تو طلوع ہوتا ہے تو دنیا سے رات کی تاریکی رخصت ہو جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ ستارے بھی حرفِ غلط کی طرح غائب ہو جاتے ہیں ۔ واضح رہے کہ غلطی سے بن جانے والا یا غلط بن جانے والا نقش ہر حال مٹا دیا جاتا ہے ۔

اے آفتاب! جب تو طلوع ہوتا ہے، دنیا کی آنکھوں سے نیند ختم ہو جاتی ہے ہماری نظروں میں روشنی بھر جاتی ہے یعنی آنکھیں ہر شے کو دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں ۔ لیکن تیری روشنی ہماری ظاہری آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے حالانکہ میں تو اُس نظارے کا خواہاں ہوں جس کی بدولت میرے دل کی آنکھ کھل جائے اور میں اسرارِ حیات و کائنات کو بے پردہ دیکھنے کے قابل ہو جاؤں ۔

میں آزادی کا خواہاں تھا لیکن اس دنیا میں میرا یہ شوق پورا نہ ہوا ۔ تمام زندگی مختلف قسم کے دنیوی تعلقات نے مجھے اپنا اسیر بنائے رکھا ۔ تیری روشنی دنیا میں ہر اعلیٰ و ادنیٰ، پست و بلند اور اپنے و بیگانے کے لئے ہے ۔ مجھے بھی ایسی ہی آنکھ درکار ہے جو تمام امتیازات سے پاک ہو کر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ میری آنکھ ایسی ہونی چاہیئے جو غیروں اور بیگانوں کے غم میں آنسوؤں سے بھیگ جائے اور مختلف اقوام و ملل میں تفریق کرنے کی تکلیف انگیز روش سے بلند ہو ۔

میں ایسی زبان چاہتا ہوں جو کسی خاص گروہ یا جماعت کے رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو، میں تمام انسانیت کو اپنی قوم تصور کروں اور ساری دنیا میرا وطن ہو ۔ میرے دل کی آنکھ پر اللہ تعالےٰ کی قدرتوں کے راز منکشف ہو جائیں اور میرا تخیل آسمان تک رسائی رکھتا ہو ۔ مجھے اس دنیا کے تفرقے پریشان نہ کریں اور مجھے ہر چیز میں ایسا حسن نظر آئے جو میرے عشق کو مزید بڑھا دے ۔

اگر کسی پھول کی پتی کو بھی تکلیف پہنچے تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگیں ۔ یعنی میں یہ معمولی سا صدمہ اور دُکھ بھی محسوس کروں ۔ میرے دل میں محبت کی ایسی چنگاری پیدا ہو جس کی روشنی کے سبب مجھ پر حقائقِ عالم منکشف ہو جائیں ۔ میرا دل محض دل نہ ہو بلکہ اسے آئینے کی حیثیت حاصل ہو ۔ جس میں قدرت کے محبوب یعنی مناظرِ فطرت کا حسن نظر آسکے ۔ مجھے انسانی ہمدردی کے علاوہ کوئی شے پریشان نہ کرے ۔

اے سورج اگر تو دنیا کے ہنگاموں اور مصائب کو برداشت نہیں کرتا تو اس میں بڑائی اور تفاخر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اے سورج اگر تو اپنے حسن سے آگاہ اور واقف نہیں ہے تو پھر تو یقیناً انسان کی برابری نہیں کرسکتا۔ انسان اس دنیا میں ہمیشہ مصروفِ نظارہ رہا ہے اور کوشش و سعی کرتا رہا ہے لیکن تو آنے والی کل اور اس کل کی صبح کے احسان اٹھانے میں لگا رہا۔ مطلب یہ ہے کہ سورج کے سفر کا آغاز ہر آنے والی صبح سے ہوتا ہے۔

ہمارے یعنی انسان کے دل میں اُس روشنی کو پانے کی آرزو ہے جو حقائقِ عالم کو بے نقاب کردے۔ ہمارے دل میں تلاش و جستجو اور کوشش و کاوش کا جذبہ موجود ہے۔ تجھے اندازہ نہیں ہے کہ مشکلات کو حل کرنے اور انھیں برداشت کرنے میں کس قدر مزا ہے۔ اے خورشید تو کچھ جاننے اور پوچھنے کی لذت سے محروم ہے اور قدرت کے رازوں کی جستجو میں جو لطف پنہاں ہے تو اس سے بھی ناواقف ہے۔

دردِ عشق

(۵۰)

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آب دار تو — — —

حلِ لغات

گہرِ آبدار: خوبصورت قیمتی موتی؛ نامحرم: ناواقف، ناآشنا؛ آشکار: ظاہر؛ محفلِ نو: نیا زمانہ مراد موجودہ عہد؛ چمنِ ہست و بود: کائنات، دنیا، خود نمائی: اپنے آپ کو ظاہر کرنا؛ منت پذیر: احسان اٹھانے والا؛ اشکِ جگر گداز: جگر کو پگھلا دینے والے آنسو؛ گویا: بولنا، گفتگو کرنا؛ آوازِ نے: بانسری کی آواز؛ نکتہ چیں: تنقید کرنے والا؛ حیرتِ علم آفریدہ: علم کی وجہ سے پیدا ہونے والی حیرت؛ نگہ نارسیدہ: حقیقت تک نہ پہنچ سکنے والی آنکھ؛ دیدۂ حکمت پسند: دانشمندوں اور فلسفیوں کا اندازِ نظر؛ کشتۂ نظارۂ مجاز: ظاہری مناظر کا شیدا؛ خلوت سرائے راز: کائنات کی وہ حقیقت جو ہر طرح کے قیاسات سے عاری ہے۔

وضاحت

اے عشق سے حاصل ہونے والے درد، تو نہایت قیمتی اور خوبصورت موتی ہے۔ لہٰذا تجھے چاہیئے کہ تو ناواقفوں اور ناقدر دانوں کے سامنے ظاہر نہ ہو، کیونکہ

وہ تیری قدر و منزلت نہ کر سکیں گے۔ جہاں تو رہتا ہے وہ جگہ ہزار ہا پردوں میں چھپی ہوئی ہے جبکہ موجودہ زمانے کے لوگ صرف ظاہر پرست ہیں لہٰذا نہ وہ تجھے دیکھ سکتے ہیں نہ تیری قدر و منزلت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ تری قدر کرتے تھے لیکن اب تو زمانے میں ایک نیا نقطۂ نگاہ رواج پا گیا ہے یعنی یہاں پر نئے نئے خیالات فروغ پا رہے ہیں جن کی موجودگی میں تیرے لیے اپنا اظہار کرنا بے مزا اور بے لطف ہے۔ ایسے میں تجھے چاہیئے کہ تو اپنے اظہار کے لئے بے چین اور مضطرب نہ ہو، اس سلسلے میں تجھے بلبل کے نالوں تک کا احسان نہیں اٹھانا چاہیئے کہ اس طرح بھی تیرا اظہار ہو جائیگا۔ تجھے چاہیئے کہ عشق کی لذت سے لالے کو بیگانہ کر دے۔ شبنم کا رونا جو تیرا ایک اور مظہر ہے تو اس میں بھی اپنی شمولیت ترک کر دے کہ بہرحال اس طرح بھی تیرے اظہار کی ایک صورت نکلتی ہے۔ اے عشق! بہتر یہ ہے کہ تیرا راز کہیں سینے کے اندر چھپ جائے اور وہ بھی اس طرح کہ جگر کو پگھلا دینے والے آنسو بھی اس کے اظہار کا سبب نہ بنیں۔ اسی طرح پُرخلوص شاعر کو بھی اپنی زبان نہیں کھولنی چاہیئے۔ بانسری کی تان سے بھی ہجر و فراق اور محبوب سے دوری کی شکایت سامنے نہیں آنی چاہیئے۔ واضح رہے کہ یہ سب علائم عشق سے متعلق ہیں اور عشق انہی کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال عشق کو چھپنے کا مشورہ اس لئے دے رہے ہیں کہ اُن کے نزدیک موجودہ زمانہ محض نکتہ چینی کرنے اور عیب تلاش کرنے کا دور ہے لہٰذا اقبال عشق کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو جس دل میں رہتا ہے اپنے آپ کو وہیں چھپا کر رکھ۔

اے عشق! تجھے یہ امر محسوس کرنا چاہیئے کہ حیرت پیدا کرنے والا علم تجھ سے غفلت برت رہا ہے اور موجودہ زمانے کی حقیقت کا سراغ نہ لگا سکنے والی آنکھ تیری متلاشی نہیں ہے۔ اس لیے تجھے بھی چاہیئے کہ تو اُن کی پروا نہ کرے اور عشق سے غافل خیالات کو تلاش و جستجو میں لگا رہنے دے۔ اس طرح موجودہ عہد کے دانشمندوں اور فلسفیوں کو حیرت میں ڈوبا رہنے دے۔ اقبال عشق سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ ایسا نہیں ہے جہاں تو پھول کھلا سکے اور جہاں تیری قدر کی جا سکے۔ اسی لئے عہد حاضر کی محفل تیرے اظہار کے لائق نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ صرف ظاہری نظاروں پر فریفتہ ہے جبکہ تیری نگاہ کا مقصد وہ راز اور وہ بھید ہیں جو کائنات کی حقیقت سے متعلق ہیں۔

اس دنیا میں دل جنھیں درد عشق سے معمور ہونا چاہیئے تھا، خیالات و فکر کے نشے میں چور ہیں اور آج کے حکیموں یعنی اہلِ عشق نے عشق کو نظرانداز کر کے اپنے لئے اور چیزوں کو طور قرار دے رکھا ہے اشارہ ہے حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی طرف جو حقیقتِ عظمیٰ کی تلاش میں کوہ طور پر گئے تھے اور دیدارِ خداوندی سے مشرف باد ہوئے تھے۔ ان کے مقابلے میں آجکل کے عشاق طور کو نظرانداز کر کے دیگر چیزوں کو اہمیت

گلِ پژمردہ

(۵۱)

تعارف بانگِ درا میں گلِ پژمردہ کے چھ شعر دیئے گئے ہیں جبکہ باقیاتِ اقبال میں گیارہ شعر مزید ملتے ہیں جو نظرِ ثانی میں قلمزد کر دیئے گئے تھے۔ یہ شعر روزگارِ فقیر حصہ دوم میں بھی درج ہیں۔

۱
کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں ۔۔۔

حل لغات گلِ پژمردہ : مرجھایا ہوا پھول ؛ **گہوارۂ جنباں** : حرکت کرتا ہوا جھولا ؛ طبلۂ عطار : عطر فروش کا صندوقچہ ؛ **دیدۂ گریاں** : روتی ہوئی آنکھ ؛

وضاحت علامہ اقبال مرجھائے ہوئے پھول کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے پھول کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اِس حالت میں جبکہ تیری بُو رخصت ہو چکی ہے، رنگ اڑ گیا ہے اور پتیاں بکھر گئی ہیں۔ تجھے بلبل کے دل کی آرزو اور بلبل کا محبوب کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بادِ نسیم تیرے لئے جھولے کا کام کرتی تھی اور گلستان میں تجھے مسکراتا ہوا پھول قرار دیا جاتا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا تیری خوشبو سے خود کو معطر کرتی تھی اور تیرے اِس احسان کا اعتراف بھی کرتی تھی۔ تیری د سے پورا باغ اس طرح معطر رہتا تھا جس طرح عطر بیچنے والے کا صندوقچہ خوشبو سے بھرا ہوتا ہے۔

لیکن اب تیری حالت پر میری آنکھیں رو رہی ہیں۔ یعنی تیرے اجڑنے اور برباد ہونے کا مجھے سخت افسوس ہے۔ تیری اداسی کی کیفیت میں میرا ویران دل چھپا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو حالت ہجر و فراق کے باعث میرے دل کی ہے، وہی کیفیت گلشن سے جدا ہونے کے بعد تیری بھی ہو گئی ہے اپنے محبوبِ حقیقی سے بچھڑنے کے بعد جس طرح میں برباد ہوا ہوں تو میری اس بربادی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اگر میری زندگی کو خواب فرض کر لیا جائے تو تُو اس کی تعبیر ہے۔

بانس کی طرح میں بھی اپنے نیستاں کی کہانی سناتا ہوں۔ نیستاں اُس جنگل کو کہتے ہیں جہاں بانس اُگتے ہیں جن سے بانسری بنائی جاتی ہے۔ تو میری داستان غور سے سن، میں ہجر و فراق کی شکایت کر رہا ہوں۔

یہ نظم بھی علامہ اقبال کے صوفیانہ خیالات پر مبنی ہے۔ انھوں نے یہ امر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح پھول اپنی شاخ سے جدا ہونے کے بعد مرجھا جاتا ہے اسی طرح انسانی روح بھی اپنے محبوب حقیقی سے جدا ہونے کے باعث مضمحل و مایوس رہتی ہے۔

سیّد کی لوحِ تربت

(۵۲)

تعارف سیّد کی لوحِ تربت، جنوری ۱۹۰۳ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ مخزن میں اس نظم کے تیس شعر شائع ہوئے۔ بانگِ درا کی اشاعت کے دوران میں نظرثانی کرتے ہوئے بائیس شعر قلم زد کر دیئے گئے۔ جو باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ چھ شعر مزید لکھے گئے بانگِ درا میں اِس نظم کے کل اشعار کی تعداد چودہ ہے۔

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر - - -

حلِ لغات **لوحِ تربت**: قبر کی تختی، وہ کتبہ جسے وفات پانے والے شخص کے بارے میں معلومات لکھ کر قبر پر لگایا جاتا ہے۔ **تارِ نفس**: سانسوں کا سلسلہ۔ **نغمہ پیرا**: نغمے گانے والا، مراد شاعر۔ **سنگِ تربت**: قبر پر لگایا جانے والا پتھر۔ **گرویدۂ تقریر**: گفتگو کا عاشق، بات کرنے کی طرف مائل۔ **مدبر**: تدبیر کرنے والا۔ **اربابِ سیاست**: امورِ سلطنت چلانے والے لوگ۔ **بیم و ریا**: خوف اور منافقت۔ **قوتِ فرماں روا**: حکمراں۔ **خامۂ معجز رقم**: باکمال تحریریں لکھنے والا قلم، معجزے دکھانے والا قلم۔ **جامِ جم**: جمشید کا پیالہ، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے ذریعے جمشید کو تمام دنیا کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔ **تلمیذِ رحمانی**: اللہ کا شاگرد، اشارہ ہے قرآن پاک کی ایک آیت کی طرف جس میں شاعر کو تلمیذ الرحمن کہا گیا ہے۔ **اعجاز**: معجزہ۔ **خرمنِ باطل**: جھوٹ کا کھلیان۔ **شعلۂ آواز**: مراد تحریر و تقریر، گفتگو۔

وضاحت اِس نظم میں شاعر نے سرسید احمد خاں کا پیغام اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے۔ سرسید کی قبر کا کتبہ زبانِ حال سے ہندوستان کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ

تم ابھی قید حیات میں ہو اس لیے ذرا غور سے دیکھو کہ میں نے ایک ویرانے میں ایک شہر بسایا ہے، جہاں کے طلبہ اور اساتذہ اب آزادی سے محوِ تحریر و تقریر ہیں اور ویرانے میں رونق آگئی ہے۔ میں اپنی زندگی میں جس قسم کے تعلیمی ادارے کا تصور کیا کرتا تھا اور جس کی تعمیر و ترقی کے لئے میں نے بیحد محنت کی تھی اب میری محنت کا پھل اس ادارے کی بارونق محفلوں کی شکل میں سب کے سامنے موجود ہے۔ سر سید احمد خاں کہتے ہیں کہ میری قبر پر لگی ہوئی پتھر کی تختی اب گفتگو کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ ذرا اپنی آنکھ کھول، اور لوح مزار پر جو کچھ لکھا ہے اُسے غور سے دیکھ۔

علامہ اقبال کو سر سید احمد خاں کی لوح مزار سے جو پیغام ملتا ہے اُس کا لب لباب یہ ہے کہ اگر تو کوئی مذہبی رہنما ہے اور تو دنیا میں دین کی تعلیم عام کرنا چاہتا ہے تو قوم کو ترک دنیا کا سبق نہ سکھانا بلکہ باعمل زندگی گذارنے کی طرف مائل کرنا تاکہ وہ باقی اقوام سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ تو فرقہ وارانہ اختلافات سے اپنی زبان کو پاک رکھے۔ اس لیے کہ ان اختلافات کے شدید ہونے سے ایسے ہنگامے پیدا ہو سکتے ہیں جو تباہی و بربادی پھیلانے میں قیامت کے ہنگامے کو بھی مات کر دیں۔ تیری تحریروں سے مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ اس کے علاوہ تیری تحریر و تقریر سے کسی کی دل آزاری بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ فرقہ واری اور مذہبی اختلافات سے متعلق مباحث اور ہندو مسلم کے تاریخی اختلافات ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب ان قصوں کو چھیڑنا مناسب نہیں اس لیے کہ اب یہ اپنا اثر کھو چکے ہیں اور جو افسانے اپنا اثر زائل کر چکے ہوں ان کا ذکر بھی لاحاصل ہوتا ہے۔

اگر تو سیاست دان ہے اور قوم کی بہتری و بھلائی کے لیے تدابیر کرنے والا شخص ہے تو تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قوم کے سیاسی لیڈروں کے لیے جرأت مندی اتنی ہی ضروری اور مفید ہے، جتنا حضرت موسیٰؑ کے لیے اُن کا عصا اہم تھا جس کی بدولت انھوں نے خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون تک کو زیر کیا۔ سیاسی لیڈر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں وہ اپنا مافی الضمیر بلاخوف و خطر بیان کر دے۔ اس لیے کہ اگر انسان کی نیت درست ہے اور وہ واقعتاً بھلائی اور فلاح کے کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اُسے کسی سے زک اور نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ جو صاحب ایمان لوگ ہوں اُن کے دل ہر طرح کے خوف اور منافقت سے پاک ہوتے ہیں اور اسی بنا پر اس قسم کے لوگ نہایت بے خوفی کے ساتھ حکمرانوں کے سامنے بھی سچ بولنے سے گریز نہیں کرتے۔[1]

---

[1] نوٹ: سر سید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کر کے انگریزوں کو سچی باتیں بتائی تھیں، جس سے انھیں اس زمانے میں جان کا خطرہ بھی ہو سکتا تھا مگر انھوں نے دلیری سے کام لیا اور ڈرے نہیں)

اگر تم معلم مذہب و اخلاق اور سیاسی رہنما کی بجائے شاعر و ادیب ہو اور تمھارے ہاتھ میں ایسا قلم ہے جو اپنی تحریر کے ذریعے معجزے دکھا سکتا ہے اور تمھارا دل اس قدر پاک وصاف اور ذاتی اغراض سے پرواہ ہے جیسا کہ جمشید کا ساغر تھا تو تمھیں بھی اپنی زبان یعنی شاعری اور نثر کو فضول باتوں سے پاک رکھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ تم براہ راست اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہو۔ اسی لئے تیری آواز اور شاعری کو بے عزت، بے وقعت اور غیر موثر نہیں ہونا چاہیئے۔ اے شاعر تجھے اپنے اشعار کے معجزے سے ان لوگوں کو بیدار کر دینا چاہیئے جو خواب غفلت کا شکار ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تیرا فرض ہے کہ تو اپنی شاعری سے باطل کے اثاثے کو تباہ و برباد کر دے۔

یہ نظم اقبال کے نزدیک اہل ہند کے لئے سرسید احمد خاں کے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کی رہنمائی کا فرض، مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کے علاوہ شاعروں اور ادیبوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال نے سرسید کے پیغام کے طور پر ان طبقوں کو مخاطب کیا ہے اور انھیں ان کا وظیفہ و منصب بھی بتایا ہے۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ جب علامہ نے یہ نظم کہی اُس وقت مذہبی رہنماؤں، سیاست دانوں اور شعراء میں یہ امراض عام طور پر پائے جاتے تھے جن سے اس نظم میں بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

اس نظم کا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس نظم میں سرسید کے جن خیالات کو پیش کیا ہے، آخر عمر میں سرسید احمد خاں خود ان کو مسترد کر چکے تھے اور انھوں نے مختلف تلخ تجربات کے بعد ہندو مسلم علیحدگی پر زور دیا تھا۔

ایک امر اور قابلِ وضاحت ہے اور وہ یہ کہ "سید کی لوحِ تربت" کے دوسرے بند کے چھٹے مصرعہ میں لفظ "نہ" دو مرتبہ آیا ہے۔ دوسرا "نہ" کاتب نے غلطی سے لکھ دیا ہے۔ اصل مصرعہ یوں ہے

"دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے"

ماہِ نو

(۵۳)

تعارف اس نظم کے کل سولہ شعر تھے ۔ نظرِ ثانی میں نو اشعار قلمزد کر دیئے گئے جو باقیاتِ اقبال میں کسی حوالے کے بغیر درج ہیں ۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ۔ ۔ ۔

حلِ لغات **غرقاب** : پانی میں ڈوب جانا ۔ **نیل** : نیلا آسمان ۔ **روئے آب** : پانی کی سطح پر ۔ **طشتِ گردوں** : آسمان کا لگن مراد آسمان ۔ **خونِ ناب** : خالص خون مراد وہ سرخی جو شام کے وقت شفق کی صورت میں افق پر پھیل جاتی ہے ۔ **سیم خام** : کچی سفید رنگ کی چاندی ، بے منت : احسان اٹھائے بغیر ۔ سیارہ : سیر کرنے والا مراد وہ تمام اجرامِ فلکی جو حرکت کرتے ہیں ۔ ثابت : ساکن مراد وہ تمام اجسام فلکی جو حرکت نہیں کرتے ۔ چاند کو سیارۂ ثابت نما اس لیے کہا کہ وہ آسمان کی وسعتوں میں متحرک رہتا ہے لیکن انسانی آنکھ اس کی حرکت کو محسوس نہیں کر سکتی ۔

وضاحت علامہ اقبال شام کے وقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سورج کی کشتی ٹوٹ کر آسمان کی نیلی وسعتوں میں ڈوب گئی ۔ البتہ اس کا ایک ٹکڑا اب بھی آسمان کی وسعتوں میں تیرتا پھرتا ہے ۔ واضح رہے کہ نئے چاند یعنی ہلال کو سورج کی کشتی کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا قرار دیا گیا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایسے میں یوں لگتا ہے جیسے آسمان کے طشت میں شفق کا خالص خون ٹپک رہا ہے ۔ یا پھر قدرت نے اپنے نشتر سے سورج کو زخمی کر کے اس کا خون بہا دیا ہے یعنی چاروں طرف سرخی پھیل رہی ہے ۔ ایسے میں آسمان پر چمکنے والا پہلی رات کا چاند اس بالی کی طرح لگتا ہے جو آسمان نے شام کی دلہن سے چرالی ہے ۔ یا پھر اس چاند کو آسمان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے نیلے پانی میں تیرنے والی سفید چاندی کی مچھلی سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے ۔ اس شعر میں دلہن کی رعایت سے چاند کو بالی قرار دیا گیا ۔ اسی طرح آسمان کے نیلے رنگ کی وجہ سے پانی کا ذکر کیا گیا اور پانی کی رعایت سے نئے چاند کو مچھلی قرار دیا گیا ۔ یہ استعارات بہت خوبصورت ہیں ۔

اقبال خورشید کی کشتی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ، عروس شام کی بالی یا پھر سیم خام کی مچھلی یعنی پہلی رات کے چاند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرا قافلہ کسی گھنٹی کی آواز کا احسان اٹھائے بغیر رواں دواں ہے

اور تو اپنا سفر اتنی خاموشی سے طے کرتا ہے کہ انسان تیری آواز نہیں سن سکتے۔ تو کبھی تو گھٹ کر چھوٹا ہو جاتا ہے کبھی بڑا۔ یہ بتا کہ تیرا وطن کدھر ہے اور تو کس ملک کی طرف جاتا ہے۔ اے چاند تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل۔ اب مجھے پوری نہ ہونے والی آرزوؤں کی چبھن بہت بے چین کئے ہوئے ہے۔ میں نور اور روشنی چاہتا ہوں اور اس تاریک ملک میں میرا دل نہیں لگتا۔ اگر اس دنیا کو ایک مدرسہ فرض کیا جائے تو یہاں میری کیفیت اُس بچے کی سی ہے جو یہاں سے بھاگ جانے کے لیے حد سے زیادہ بے چین اور بیقرار ہے۔

انسان اور بزم قدرت

(۵۴)

تعارف اس نظم کی اہمیت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس میں پہلی بار اُس فلسفہ خودی کے بنیادی خدوخال پیش کئے جو بعد ازاں اُن کی فکر اور شاعری کا مرکزی نقطہ قرار پایا۔

۵ صبح خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے ـ ـ ـ

حلِ لغات خورشیدِ درخشاں: چمکتا ہوا سورج ؛ بزمِ معمورۂ ہستی: زندگی سے بھری ہوئی محفل مراد دنیا، کائنات ؛ پرتوِ مہر: سورج کا سایہ، سورج کی روشنی

سیمِ سیال: بہتی ہوئی چاندی، حد درجہ صاف و شفاف ؛ خلد: بہشت، جنت ؛ وَالشّمس: قسم ہے سورج کی۔ قرآن پاک کے تیسویں پارے کی سورۃ کے ابتدائی الفاظ جن میں اللہ تعالیٰ نے سورج کی قسم کھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کی عظمت کی قسم اس بناء پر کھائی ہے کہ کائنات کی ساری رونق اور سرسبزی و شادابی سورج ہی کی وجہ سے ہے ؛ سطوت: شان و شوکت، عظمت، برتری ؛ بامِ گردوں: آسمان کی چھت مراد آسمان ؛ صحنِ زمین: زمین کا صحن مراد زمین ؛ بود و نبود: وجود و عدم، زندگی اور موت ؛ صحیفہ: آسمانی کتاب ؛ تفسیر: شرح ؛ پابندِ مجاز: ظاہر پرست۔

وضاحت جب صبح کو چمکتا ہوا سورج نکلا، میں نے دنیا اور اس کے دیگر مظاہر سے سوال کیا کہ تمھاری ساری روشنی سورج کے سائے اور اس کے عکس کی وجہ سے

ہے۔ دریاؤں میں چاندی کی مانند صاف وشفاف اور سفید پانی بہہ رہا ہے۔ سورج نے تیری ایک ایک چیز کو منور کر رکھا ہے۔ تیرے لیے سورج کی وہی حیثیت و اہمیت ہے جو کسی محفل میں شمع کی ہوتی ہے یعنی جس طرح شمع نہ ہو تو محفل تاریک ہو جائے گی اور اس کا لطف جاتا رہے گا بالکل اسی طرح اگر سورج نہ ہو تو دنیا بھی اپنی تمامتر دلچسپیوں سے محروم ہو جاتے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس کائنات کے باغات اور گلستاں دراصل جنت کے باغات کی تصویر پیش کرتے ہیں یعنی اتنے ہی حسین اور دلآویز ہیں اور یہ سبھی قرآن شریف کی سورۃ والشمس کی تفسیر و وضاحت پیش کرتے ہیں۔ یعنی یہ سارا حسن اور خوبصورتی دراصل سورج کی وجہ سے ہے۔ یہاں پر پھولوں نے سرخ لباس پہن رکھا ہے جبکہ درختوں کے لباس کا رنگ سبز ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو پھولوں اور درختوں کے رنگ کی وجہ سے انھیں سرخ اور سبز پریاں قرار دیا جا سکتا ہے۔

اے دنیا تیرے آسمان کے خیمے کے گرد جو جھالر ہے وہ سنہری ہے یعنی سورج کی منعکس ہوتی ہوئی روشنی نے آسمان کو چاروں طرف سے سنہری کر دیا ہے اور یہ سب کچھ اُن بادلوں کے ٹکڑوں کی وجہ سے ہے جو افق تا افق پھیلے ہوئے ہیں۔ آسمان پر پھیلی ہوتی شفق کی سرخی دیکھنے میں بہت اچھی لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شام کے پیالے میں کسی نے سرخ رنگ کی شراب انڈیل دی ہو۔

اے دنیا تیرا مرتبہ بہت بلند ہے اور تیری شان بہت اُونچی ہے۔ تیری ہر چیز پردۂ نور میں چھپی ہوئی ہے یعنی روشن و منور ہے۔ صحیح کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی تیری عظمت و برتری اور شان و شوکت کے گیت گا رہی ہے۔ سورج کے نیچے پوری کائنات میں تاریکی اور اندھیرے کا نشان تک بھی نہیں ملتا یعنی کہیں معمولی سی تاریکی بھی نہیں ہے۔ لیکن میں یعنی انسان اسی کائنات میں سورج کے نیچے اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ لیکن کائنات کے دیگر مظاہر کے مقابلے میں اسے بدقسمتی نے گھیر رکھا ہے۔ انسانی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یوں معلوم ہوگا جیسے یہ نور اور روشنی سے دور اندھیروں میں گھرا ہوا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کائنات میں رہتے ہوئے بھی انسان کے دن، مقدر اور اعمال تاریکیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

جب میں نے (کہنے والے نے) اپنا سوال مکمل کر لیا تو جواب کے طور پر ایک آواز سنائی دی جس کے بارے میں یہ پتا نہ چل سکا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ علامہ کے سوال کے جواب میں آسمان کی بلندیوں پر رہنے والی کوئی چیز بولی یا پھر کسی زمین کے رہنے والے

نے جواب دیا۔ بہرحال اس آواز نے اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے انسان میرا عدم و وجود سورج کی بجائے تیری ذات سے وابستہ ہے۔ تیرا وجود اس کائنات کے لئے باغبان اور مالی کی حیثیت رکھتا ہے یعنی میرا حسن تو تیرا مرہونِ منت ہے۔ حسن کی محفل تُو ہے۔ یہ مظاہر فطرت تو محض تیری تصویر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عشق کی الہامی کتاب کی حیثیت تو تجھے حاصل ہے کائنات اور اس کی چیزیں تو تیری تشریح و وضاحت کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال نے یہی خیال ایک اور جگہ یوں پیش کیا ہے۔

بزمِ ہستی اپنی آرائش پہ تُو نازاں نہ ہو!!
تُو تو اِک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

وہ آواز اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے کہ میرے بگڑے ہوئے کاموں کو تو نے بنایا اور سنوارا ہے جو بوجھ میری طاقت و قوت سے باہر تھا اس کو صرف تو نے اٹھایا اور یوں میری مشکل حل کر دی۔ تلمیحاً اُس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"اور ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ البتہ انسان نے اسے اٹھالیا۔ بیشک وہ ظلوم و جہول ہے۔"

میر تقی میر نے اسی خیال کو یوں پیش کیا ہے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

وہ آواز مزید کہتی ہے کہ میری ہستی تو سورج کی روشنی کی محتاج ہے یعنی اگر سورج طلوع نہ ہو تو نہ صرف ہر شے کی رونق ختم ہو جائے بلکہ ان کا وجود بھی باقی نہ رہے۔ لیکن اے انسان تیرا جوہر سورج کا محتاج نہیں ہے۔ سورج نہ ہو تو میرے گلشن ویران ہو جائیں اور جس جگہ کو انسان عشرت گاہ تصور کرتا ہے وہ قید خانے میں بدل جائے۔

اے بالکل واضح اور نمایاں بھید کو نہ سمجھ سکنے والے اور مختلف تمناؤں اور آرزوؤں کے جال میں پھنس جانے والے انسان! افسوس ہے کہ تو غفلت کی وجہ سے ظاہر پرست ہو گیا ہے۔ اگر تو حقیقت حال پر نظر رکھتا تو تجھے معلوم ہوتا کہ تیری حیثیت محبوب و مطلوب کی ہے لیکن تو خود طالب بن کر عاجزی کرنے لگا۔ حالانکہ اگر تو خود اپنی حقیقت اور اہمیت سے واقف ہو جائے تو پھر تیری

سیاہ بختی اور تیرہ نصیبی بھی ختم ہو جائے ۔ یعنی اگر تو اپنی اِس حیثیت کو جان لے کہ تو زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے تو پھر اِس کائنات کا محکوم ہونے کی بجائے حاکم بن جائے ۔ نظم کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ موجود ہے وہ محض انسان کے دم قدم سے ہے ۔

پیامِ صُبح

(۵۶)

تعارف "پیامِ صبح" علامہ اقبال کی طبع زاد نظم نہیں ہے ۔ جیسا کہ انھوں نے خود بھی وضاحت کر دی ہے ۔ اس نظم کا بنیادی خیال مشہور امریکی شاعر "لونگ فیلو" کی ایک نظم سے اخذ کیا گیا ہے ۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے بقول لونگ فیلو کی نظم کا عنوان "THE DAY BREAK" ہے ۔ اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا ۔ ۔ ۔

حلِ لغات افشاں : مقیش یا گوٹے کی کترن جسے عورتیں زیبائش کے لیے ماتھے پر چنتی ہیں ۔ یہاں پر مراد ستارے ؛ صبحِ خنداں : مسکراتی ہوئی صبح ۔ والنّور : قسم ہے روشنی کی ۔ قرآن پاک کی چوبیسویں سورۃ کے ابتدائی الفاظ جن میں اللہ تعالیٰ نے روشنی کی قسم کھائی ہے ، مراد ہے سورج ۔ تاجِ زر : سنہری تاج ۔ شمعِ شبستاں : عشرت گاہ میں جلنے والی شمع ۔ خوابیدگانِ دیر : بت خانے میں سوئے ہوئے لوگ ۔ خورشیدِ درخشاں : چمکتا ہوا سورج ۔ شہرِ خموشاں : مراد ہے قبرستان ۔

وضاحت جب رات کے ماتھے پر بکھری ہوئی افشاں کی روشنی ماند پڑ گئی یعنی ستارے ڈوب گئے اور رات ختم ہو گئی تو زندگی ہنستی مسکراتی صبح کا پیغام لائی یعنی صبح ہو گئی ، پہلے مصرع میں شاعر نے عمل تجسیم سے کام لیا ہے ۔ یعنی رات کو عورت تصور کیا گیا جس کا حسن بڑھانے کے لیے افشاں چنی گئی ۔ اس مصرع میں ایک اور لطف انگیز پہلو یہ ہے کہ شاعر نے بظاہر روشنی اور اجالے کے رخصت ہونے کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن درحقیقت خاتمہ رات اور اس کی تاریکیوں کا ہو رہا ہے ۔ یہ معنوی طور پر تضاد کی بہترین صورت ہے ۔ بہرحال شاعر کہتا ہے کہ صبح ہوئی تو زندگی نے آشیانے میں

سوئی ہوئی بلبل کو جگا دیا اور اسی طرح کھیت کے کنارے سونے والے کسان کو خواب سے بیدار کر کے کام کرنے کے لیے تیار کر دیا۔ رات کو تاریکی نے جو جادو کر دیا تھا سورج کے ذریعے اسے توڑا اور عشرت گاہوں میں جلنے والی شمعوں کے سنہری تاج چوری کر لیے یعنی شمعوں کو گل کر دیا۔ شمع کا گل ہونا بجائے خود صبح کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔

جو لوگ بت خانوں میں سوئے ہوئے تھے اُن پر جگانے والا جادو پڑھا تاکہ وہ بیدار ہو جائیں۔ اور برہمن کو چمکتے ہوئے سورج کا پیغام پہنچا دیا۔ زندگی مسجد میں اذان دینے والے سے آکر یوں مخاطب ہوئی کہ کیا تجھے سورج کے طلوع ہونے کا ڈر نہیں ہے یعنی سورج کے نکلنے کے بعد نہ اذان دی جا سکے گی اور نہ نماز ادا ہو سکے گی۔ پھر زندگی گلشن میں آئی اور غنچوں کو چٹکنے کا حکم دیا اس لیے کہ گلشن کی زندگی انہیں پر موقوف ہے۔ پھر زندگی صحرا کی طرف گئی اور یہاں پر اہل قافلہ کو یہ پیغام دیا کہ وہ ابھی سے اپنے سفر کا آغاز کر دیں اس لیے کہ تھوڑی دیر بعد ہی گرمی کے باعث صحرا کا ایک ایک ذرہ جگنو بن کر چمک اُٹھنے والا ہے۔ یعنی گرمی اس قدر ہو جائے گی کہ پھر قافلے والوں کے لیے سفر کرنا ممکن نہ ہو گا۔

آخر میں زندگی قبرستان کی طرف گئی اور یہاں کی خاموش فضا کو دیکھ کر کہنے لگی کہ تم سب لوگ ابھی آرام سے سوتے رہو۔ میں پھر تمہارے پاس آؤں گی اور ساری دنیا کو سلانے کے بعد تمہیں خواب سے بیدار کر دوں گی۔ مطلب یہ کہ قیامت کے دن جب تمام دنیا فنا کے گھاٹ اتر جائے گی تب ہر مردہ نئے سرے سے زندہ ہو گا۔

عشق اور موت

(۵۷)

تعارف

علامہ اقبال کی یہ نظم انگریزی کے مشہور شاعر ٹینی سن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے بقول انگریزی نظم کا عنوان LOVE AND DEATH ہے۔ یہ نظم نومبر ۱۹۰۳ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظر ثانی میں چھ شعر قلمزد کر دیئے گئے تھے جو باقیات اقبال اور سرود رفتہ میں درج ہیں۔

ے سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی ۔۔۔

حلِ لغات سہانی : خوشگوار، پرکیف ؛ **تاجِ زر** : سنہری تاج ؛ **پیرہن** : لباس ؛ **تابندگی** : چمک دمک ؛ **تشنہ کام** : پیاسا ؛ **ملک** : فرشتہ ؛ **آشکارا** : عیاں، ظاہر ؛ **قضارا** : اتفاقاً ؛ **قضا** : موت ؛ **رختِ ہستی** : زندگی کا لباس ؛ **جادوئے نیستی** : موت کا جادو ۔ **نورِ مطلق** : وہ نور جو ہر قید سے آزاد ہے مراد اللہ تعالیٰ ۔

وضاحت علامہ اقبال نے اِس نظم کے پہلے بند میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی لمحات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ دلکش وقت تھا جب کائنات تخلیق ہو رہی تھی ۔ زندگی کی کلی ابھی ادھ کھلی تھی اور مکمل پھول کے مرتبے پر فائز نہیں ہوئی تھی یعنی زندگی کے امکانات ظاہر نہیں ہوئے تھے ۔ اگر ایک طرف سورج کو کرنوں کا سنہری تاج یعنی حدت و حرارت اور روشنی مل رہی تھی تو دوسری طرف چاند کو نور عطا کیا جا رہا تھا ۔ شام کے لیے کالا لباس تجویز کیا جا رہا تھا ۔ کالے لباس سے مراد اندھیرا ہے ۔ اسی طرح ستاروں کو یہ سکھایا جا رہا تھا کہ وہ دنیا میں کیسے جگمگائیں گے ؟ زندگی کا پودا ابھی اتنا تناور نہیں ہوا تھا صرف اس کے پتے نکل رہے تھے ۔ کہیں کہیں کوئی کلی کھلی ہوئی تھی ۔ فرشتے شبنم کو آنسوؤں کی طرح گرنے کی تعلیم دے رہے تھے اور پھول مسکرانا سیکھ رہے تھے ۔ شاعر کے دل کو درد دیا جا رہا تھا اور انسان نے ابھی تک اجتماعی زندگی یعنی قبیلوں اور قوموں کی صورت میں رہنا نہیں سیکھا تھا ۔ پہلے پہل کالی گھٹا نے آسمان کو ڈھانپا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کوئی حور چوٹی کے بال کھولے کھڑی ہو ۔ ابھی دنیا میں زمین و آسمان اور مکان و لامکاں کے امتیازات پیدا نہیں ہوئے تھے ۔

ے غرض اِس قدر یہ نظارا تھا پیارا ۔۔۔

وضاحت خلاصۂ گفتگو یہ کہ یہ منظر اس قدر حسین و دلکش تھا کہ خود دیکھنے والے بھی نظارے کا حصہ بن کر رہ جاتے تھے یعنی از حد حیران ہو جاتے تھے ۔ آسمان پر اڑنے والے فرشتے اپنی اپنی اڑان آزما رہے تھے اور اُن کے ماتھے سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں واضح رہے کہ فرشتوں کو نوری مخلوق قرار دیا جاتا ہے ۔ انھیں اڑنے والے فرشتوں میں ایک فرشتہ عشق کا بھی تھا اور اِس کا کام ساری دنیا کی رہنمائی اور قیادت تھا ۔ یہ فرشتہ بہت ہی زیادہ مضطرب اور بے چین تھا ۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ فرشتہ نہ ہو پارا ہو ۔ یہ فرشتہ سیر کے لیے جنت کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اتفاقاً اِس کی موت سے ملاقات ہوگئی ۔ عشق کے فرشتے نے اِس سے سوال کیا کہ آخر تو کون ہے ؟

اور تیرا کام کیا ہے ؟ میری آنکھیں تجھے دیکھنا نہیں چاہتیں۔ عشق کا سوال سن کر موت نے جواب دیا کہ میں موت کا فرشتہ ہوں اور میرے نام ہی سے میرا کام ظاہر ہو جاتا ہے ۔ میں زندگی کا خاتمہ کرتی ہوں اور زندگی کی چنگاری بجھا دیتی ہوں ۔ میری آنکھوں میں موت کا جادو ہے اور اس کا ایک اشارہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے ۔ لیکن دنیا میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو آگ کی حیثیت رکھتی ہے اور میں اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی ۔ موت کے فرشتے نے عشق کو آگ قرار دیتے ہوئے خود کو پارا قرار دیا ہے ۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پارے کو قرار تو ویسے بھی نہیں ہوتا لیکن اگر اسے آگ میں ڈال جائے تو پارا اڑ جاتا ہے ۔

موت اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ ہستی یعنی عشق چنگاری کی صورت انسان کے دل میں رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے بہت پسند کرتا ہے ۔ یہ انسان کی آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکتی ہے اور آنسو بھی ایسے جو درد انگیز ہونے کے باوجود بہت پسندِ خاطر ہوتے ہیں ۔

جب عشق کے فرشتے نے موت کے فرشتے کی یہ گفتگو سنی تو وہ ہنسنے لگا ۔ عشق کے فرشتے کی ہنسی بجلی بن کر موت پر گری اور جس طرح اندھیرا روشنی میں نہیں ٹھہر سکتا اسی طرح موت کا فرشتہ بھی موت کے گھاٹ اتر گیا اور یوں موت اپنی تقدیر کا شکار ہو گئی ۔ پرلطف بات یہ ہے کہ عشق اور موت کے ضمن میں علامہ اقبال کے نظریات دورِ آخر تک تقریباً یہی رہے ۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے ۔

ے فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

ے ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

ے مردِ خدا کا عمل ، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات ، موت ہے اس پر حرام

زہد اور رندی

(۵۹)

تعارف 'زہد اور رندی' دسمبر ۱۹۰۳ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اِس کے تیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں تین شعر قلمزد کر دیئے گئے تھے جو باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی ــــ

حلِ لغات **شہرہ**: چرچا، شہرت۔ **صوفی منش**: فقیر۔ **اعالی**: اعلیٰ کی جمع یعنی معزز لوگ۔ **ادانی**: ادنیٰ کی جمع یعنی کمتر درجے کے لوگ۔ **مضمر**: پوشیدہ، چھپے ہوئے۔ **دُرد ِخیالِ ہمہ دانی**: سب کچھ جاننے کے خیال کی تلچھٹ مراد سب کچھ جاننے کا زُعم۔ **تشیع**: شیعہ عقائد **تفضیل**: فضیلت، بڑائی۔ **خاک اڑانا**: برباد کرنا۔ **عار**: نفرت۔ **خفقانی**: سودائی۔ **نغز بیانی**: اعلیٰ و عمدہ بیان۔ **احبّا**: احباب کی جمع دوست۔ **زرہِ قربِ مکانی**: مکان کی قربت کی وجہ سے۔ **تواضع**: جھکنے کی کیفیت، احترام و ادب کرنا۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں تمھیں ایک مولوی صاحب کی کہانی سناتا ہوں اور خیال رہے کہ مقصود شاعری کا کمال دکھانا نہیں ہے بلکہ صرف حقیقتِ حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ان مولوی صاحب کی دینداری اور درویشی کا بہت چرچا تھا جس کی وجہ سے ہر چھوٹا بڑا اُن کی عزت کرتا تھا۔ یہ مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ صوفیانہ مسلک میں شریعت اسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح تحریر و تقریر میں استعمال ہونے والے الفاظ میں معنی چھپے ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح لفظ اور خیال کی علیحدگی ممکن نہیں اسی طرح شریعت اور تصوف کو بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مولوی صاحب بہت زیادہ متقی اور پرہیزگار تھے۔ اس کے علاوہ اپنی علمیت کے بارے میں انھیں یہ خیال تھا کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ مولوی صاحب اپنے روحانی کمالات کا خود ہی ذکر کیا کرتے تھے۔ اس طرح انھیں یہ خیال تھا کہ اُن کے مریدوں کی تعداد بڑھے گی۔ یہ مولوی صاحب ایک مدت سے میرے پڑوسی تھے اور یوں گویا مجھ جیسے دنیا دار انسان کے ساتھ اس پرہیزگار شخص کے بہت پرانے تعلقات تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے ایک جاننے والے سے پوچھا کہ اقبال علم معانی و علم

شعر کا بہت بڑا ماہر ہے۔ اِسے فنِ شعر پر اس قدر عبور ہے کہ اپنے عہد کا کلیم ہمدانی کہا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ کلیم ہمدانی شاہجہاں کا درباری شاعر تھا جسے ملک الشعراء کا خطاب بھی ملا۔

مولوی صاحب نے اقبال کے جاننے والے سے پوچھا کہ مجھے یہ بتائیے کہ اقبال دینی احکام کی پابندی کس حد تک کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باعث اس کا عقیدہ کچھ اس طرح کا ہو گیا ہے کہ وہ ہندو کو کافر نہیں کہتا۔ اِس کے علاوہ اس کے مذہبی خیالات پر قدرے شیعہ عقائد کا اثر بھی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو دیگر خلفائے راشدین پر فضیلت دیتا ہے یہ گانے اور موسیقی کو بھی عبادات کا حصّہ سمجھتا ہے اور یوں مذہب کی تذلیل کرتا ہے ہمارے پرانے شاعروں کی طرح حُسن فروشوں کے پاس جانے سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگر رات کو گانا سنتا ہے تو صبح کو اٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ اِس تضاد میں جو بھید ہو سکتا ہے وہ مجھ پر آج تک واضح نہیں ہوا۔ لیکن میں نے اپنے مریدوں سے سنا ہے کہ اس طرح کے تناقض کے باوجود اِس کا دامن گناہوں سے پاک ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اقبال کی شخصیت میں بہت سے متضاد رویّے جمع ہو گئے ہیں۔ اگر اس کا دل علم و حکمت کا خزانہ ہے تو اس کی طبیعت میں دیوانگی کا اثر بھی ہے۔ یہ شخص دنیاداری سے بھی واقف ہے اور شریعت کی حقیقت سے بھی آگاہ۔ اس کے علاوہ اگر اس سے تصوف پر گفتگو کی جائے تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارے سامنے دوسرا منصور موجود ہے۔ اشارہ ہے حسین بن منصور حلاج کی طرف جس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا۔

مولوی صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم پر اقبال کی حقیقت نہیں کھل سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اقبال دنیا میں کسی اور طرح کے اسلام کی بنیاد رکھے گا۔ غرض مولوی صاحب کی یہ گفتگو بہت دیر تک جاری رہی۔ اور چونکہ ہمارے شہر میں باتیں بہت تیزی سے پھیلتی ہیں لہٰذا میں نے بھی اپنے دوستوں کے ذریعے اپنے بارے میں مولوی صاحب کی یہ گفتگو سُن لی۔

اِس کے بعد ایک روز مولوی صاحب سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو یہی پرانا موضوع چھڑ گیا۔ کہنے لگے کہ یہ شکایت میں نے صرف محبت کی وجہ سے کی تھی۔ محبت کی وجہ سے میرا فرض تھا کہ آپ کو شریعت سے آگاہ کر کے آپ کی اصلاح کروں۔ میں نے کہا کہ آپ کی باتوں سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے یقیناً ہمسائیگی کے باعث یہ آپ کا حق تھا۔ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ درست

ہے بلکہ آپ کے آگے جھکنے اور آپ کی تعظیم کرنے کے لیے میری جوانی بھی آپ کے سامنے بڑھاپے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ خیال رہے کہ بڑھاپے میں بھی انسان کی کمر کمزوری کے باعث جھک جاتی ہے۔

بہرحال اقبال نے کہا کہ اگر آپ میری حقیقی کیفیت سے واقف نہیں ہیں تو اس میں آپ کی علمیت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس لئے کہ اپنے خیالات کی گہرائی کے باعث اپنی حقیقت سے میں خود بھی واقف نہیں ہوں۔ میری خواہش بھی ہے کہ کسی دن اقبال سے میری ملاقات ہو۔ میں نے اس کی جدائی میں بہت آنسو بہائے ہیں۔ یقین کیجئے کہ میں خود بھی اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہوں اور یہ بات بالکل درست ہے۔ حقیقت یہی ہے۔ میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا محض حقیقتِ حال بتا رہا ہوں۔

اس نظم میں علامہ اقبال نے واقعہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ نہایت دیانت کے ساتھ اپنی زندگی کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اپنی شاعری کے دورِ اوّل میں علامہ اقبال نہ خود اپنی ذات کے میلانات و رجحانات سے واقف ہو سکے تھے اور نہ اپنی شاعری کے منصب و وظیفے سے۔ دورِ اوّل کی بہت سی نظمیں اُن کے اِس مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

شاعر

(۶۱)

تعارف تین اشعار پر مشتمل یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ حضرت علامہ اقبال نے اس مختصر سی نظم میں قوم کے مختلف طبقوں کے مقابلے میں ایک ایسے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے جو قوم کے لیے دردِ دل رکھتا ہو اور جس کی شاعری کا واحد مقصد و مدعا قوم کی ترقی و اصلاح ہو۔

حلِ لغات ے قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم ۔۔۔

منزلِ صنعت : صنعتی ترقی ے رہ پیما : راستہ طے کرنے والے ے

دست و پائے قوم : قوم کے ہاتھ پاؤں مراد ہے محنت کش طبقہ۔ **محفل نظم حکومت** : حکومت کا نظام چلانے والا گروہ۔ **چہرۂ زیبا** : خوبصورت چہرہ۔

وضاحت حضرت علامہ اقبال اِس نظم میں کسی قوم کو ایک زندہ جاوید جسم تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح جسم کا ہر حصہ اپنے کام کے اعتبار سے اہم ہوتا ہے، بالکل اسی طرح کسی قوم کے مختلف طبقات کی اہمیت ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر قوم کو ایک جسم فرض کیا جائے تو قوم کے مختلف افراد اس جسم کے اعضاء قرار پائیں گے۔ ان مختلف افراد میں سے جو لوگ صنعت و حرفت کے میدان میں کام کرتے ہیں اور قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ وہ قوم کے ہاتھ پاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جو لوگ نظام حکومت چلاتے ہیں اور نظم و نسق سے متعلق ہیں وہ قوم کے خوبصورت چہرے کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی جس طرح کسی شخص کے حسن و خوبصورتی کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے اسی طرح کسی قوم کی خوبیوں کا اندازہ اس کے حاکموں اور حکمرانوں کی صلاحیتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ایک رنگیں نوا شاعر قوم کی آنکھ کی حیثیت رکھتا ہے ایسی آنکھ جو دیکھنے اور بُرے بھلے کی تمیز کی اہلیت رکھتی ہو۔ واضح رہے کہ اقبال نے شاعر کے لیے رنگیں نوائی کی شرط عائد کی ہے یعنی یہ شاعر دل لبھانے والے نغمے لکھے۔ ایسے نغمے جبھی تخلیق ہوں گے جب شاعر مالی منفعت کی بجائے کامل اخلاص کے ساتھ قوم کے دُکھ درد میں شریک ہو اور تہہ دل سے قومی مقاصد اور قومی امنگوں میں شامل ہو۔

اقبال نے شاعر کی یہ خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ آنکھ دیکھنے اور نیک و بد میں تمیز کرنے کے علاوہ جسم کے کسی بھی عضو کو پہنچنے والی تکلیف محسوس کرتی ہے اور اس پر آنسو بہاتی ہے۔ اسی طرح قوم کا کوئی طبقہ کسی بھی طرح کی مصیبت میں مبتلا ہو تو شاعر اس تکلیف کو محسوس کرتا اور اپنے کلام میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح گویا یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاعر قوم کا بے حد ہمدرد ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ سچا اور مخلص شاعر قوم کے تمام طبقوں کا ہمدرد ہوتا ہے۔

نوٹ : علم سیاسیات میں "ریاست" کی ابتداء کے مختلف نظریات بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ ORGANIC THEORY OF THE STATE کہلاتا ہے۔ جس کی رو سے انسانی جسم اور ریاست کے نظام میں مماثلت بیان کی جاتی ہے۔ اقبال نے اِسی

نظریے سے مدد لے کر قوم اور جسمانی اعضاء میں مماثلت بیان کی ہے۔

دل

(۶۱)

تعارف اِس نظم کے تعارف میں تمہیدی نوٹ کے طور پر مطالبِ بانگِ درا میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

" اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے اٹھارویں سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۰۳ء میں بارہ بند کی ایک نظم پڑھی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ نظم عوام میں " فریادِ اُمت " کے نام سے مشہور ہوئی اور کتابچے کی شکل میں الگ بھی چھپ گئی تھی ۔ بانگِ درا مرتب کرتے وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فریادِ امت میں سے گیارہ بند حذف کر دیئے اور صرف تیسرا بند باقی رکھا، جس کا عنوان معنویت کے علاوہ ردیف کی رعایت سے دل تجویز فرمایا "

قلمزد کئے جانے والے تمام اشعار سرودِ رفتہ میں دیئے گئے ہیں۔

حلِ لغات قصۂ دار و رسن : لفظی معنی تختے اور رسی کی کہانی مراد پھانسی دا اشارہ ہے منصور حلاج کے واقعے کی طرف جنہیں " انا الحق " کا نعرہ لگانے کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی تھی ۔ بازیٔ طفلانہ : بچوں کا کھیل، بہت معمولی کام ۔ التجائے ارنی : اپنا جلوہ دکھانے کی درخواست ، حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے ۔ قرآن شریف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر گئے تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا ۔ جادۂ ملک بقا : ہمیشہ زندہ رہنے والے ملک میں پہنچانے والا راستہ ۔ خطِ پیمانہ : شراب کی مقدار سے پیالے پر بننے والی لکیر ۔ مزرع : کھیتی ۔ گنجِ گرانمایہ : قیمتی خزانہ ۔ کاشانہ : گھر لغزش : غلطی ۔

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل ۔ ۔ ۔ ۵

وضاحت علامہ کہتے ہیں کہ جان دینا دنیا کے عام لوگوں کے لیے خواہ کتنا ہی مشکل کام ہو لیکن اہلِ دل یعنی عشاق کے لیے یہ کام بچوں کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں

دکھنا۔ یعنی بہت آسان ہے۔ اگر دل کی داستان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے جلوے دیکھنے کی شدید خواہش اس داستان کا جلی عنوان ہے۔ یعنی شاعر کے نقطۂ نظر سے ایسے کام جو ایک پیغمبر کو بیہوش کر دیں اور جن کی بنا پر پہاڑ جل کر سُرمہ بن جائیں، دل کے لیے بہت آسان ہیں۔

؎ یارب اِس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال دل کو ساغر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ دل جو شرابِ عرفان و معرفت سے بھرا ہوا ہے، اس کے ساغر کی شراب کی کیا کیفیت ہو گی؟ گویا پہلے مصرع میں شاعر نے ایک سوال کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے خود ہی کہا ہے کہ ساغرِ دل کی شراب تو شراب اِس ساغر پر دکھائی دینے والی لکیر بھی انسان کے لیے بقائے دوام اور ہمیشگی کی طرف لے جانے والے راستے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی اگر انسان دل اور عشق کو اپنا رہنما بنائے تو اُسے دوام عطا ہو جائے گا۔ عشق کی یہی خصوصیت ہے جو قبل ازیں نظم "عشق اور موت" میں وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی اور بعد کے ادوار میں کی جانے والی شاعری میں بھی عشق کی اِس خصوصیت کا ذکر کیا گیا مثلاً ؎

فرشتۂ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

؎ ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

؎ مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اِس پر حرام

؎ ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی کھیتی جل گئی تو دل یعنی عشق کا دانہ پیدا ہو کر ایک تناور درخت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس شے کو جس نے ظاہری علائقِ دنیوی کو جلا کر عشق کے پیدا ہونے کا سبب بنایا، رحمت کا بادل کہوں یا اُس کو عشق کی حیات سوز بجلی قرار دوں؟ حیات سوز بجلی اِس لیے کہ اس نے دل میں موجود علائقِ دنیوی کو خاکستر کر دیا اور بجلی یہی کام کرتی ہے۔ اسی طرح ابرِ رحمت اس بنا پر کہ اس کی وجہ سے عشق کا پودا اگا اور تناور درخت بنا۔ یہ فریضہ ابرِ رحمت کا تھا۔

ے حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال فرہاد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے فرہاد تو نے تمام عمر تیشہ بدست ہو کر کوہِ بے ستوں کو کاٹنے اور جوئے شیر لانے میں گذار دی ۔ اس کے باوجود تو اپنے محبوب کو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کے لیے تو نے یہ ساری مشقت برداشت کی اور اسی سلسلے میں ناکامی اور مایوسی کا شکار ہو کر تجھے خودکشی کرنا پڑی ۔ اگر تو کوہِ بے ستوں کی بجائے اپنے دل کا ویرانہ کھودتا تو یقین کامل ہے کہ تجھے حسن کا قیمتی خزانہ ضرور مل جاتا اور تو یوں ناکام و نامراد نہ ٹھہرتا ۔ مراد ہے کہ خدا دل میں بستا ہے جہاں اسے تلاش کیا جا سکتا ہے ۔ واضح ہو کہ اس دور میں علامہ اقبال وحدت الوجودی افکار سے متاثر تھے ۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے اشعار اس نقطہ نظر کے ترجمان ہیں مثلاً ے

ے جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

ے حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

ے ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

ے ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

ے عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اے اللہ آخر میرے دل میں کون رہتا ہے ؟ مجھے کبھی تو اس پر عرش کا گمان گذرتا ہے اور کبھی کعبے کا دھوکا ہوتا ہے ۔ اقبال نے بظاہر تو یہ سوال کیا ہے لیکن درحقیقت خود ہی اس کا جواب بھی دیدیا ہے ۔ یعنی مجھے اپنے دل پر عرش اور کعبے کا گمان اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالےٰ رہتا ہے ۔ پر لطف بات یہ ہے کہ یوں تو اللہ تعالےٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن عرشِ معلےٰ ، کعبۃ اللہ اور قلبِ مومن اُس کے خاص ٹھکانے ہیں چونکہ دل میں بھی خدا رہتا ہے اس لیے اس پر عرش اور کعبے کا دھوکا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ۔

ے اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں اور میرا دل دونوں مجنوں اور سودائی ہیں۔ لیکن دل کے جنون اور میری دیوانگی میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ دل کسی اور کا دیوانہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا عاشق ہے اور میں اپنے دل کو محبوب رکھتا ہوں۔ دل کو محبوب رکھنا اس لیے بجا ہے کہ عشقِ باری تعالیٰ سے معمور ہونے کے باعث دل از خود ایک نہایت قیمتی اور گرانمایہ چیز بن جاتی ہے۔ یعنی اقبال کے نزدیک دل کی اصل قدر و قیمت اس وجہ سے ہے کہ وہ خدا کے عشق سے معمور ہے۔

ے تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو ۔ ۔ ۔

وضاحت اے نادان زاہد، تو اس بات کو نہیں سمجھتا کہ دل کا راہِ راست سے کچھ دیر کے لئے بھٹک جانا برائی نہیں۔ کیونکہ بھٹکنے کے بعد دل جب سیدھے راستے پر آتا ہے تو اس کے دوبارہ بھٹک جانے کا خطرہ نہیں رہتا۔ اس لیے اس بھول پر سینکڑوں سجدے نثار کئے جا سکتے ہیں۔

ے خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ کہتے ہیں کہ عشق میں جلنے والے دل کی راکھ اس مرتبے پر فائز ہو جاتی ہے کہ اگر اسے خاک کے ڈھیر پر یعنی انتہائی ادنیٰ اور کم قیمت چیز پر ڈال دیا جائے تو اس راکھ کے ذریعے وہ بھی اکسیر یعنی انتہائی قیمتی چیز بن جاتی ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک عشق میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ادنیٰ چیزوں کو بھی اعلیٰ چیزوں میں بدل دیتا ہے۔ اکسیر روائتی طور پر وہ چٹکی جو لوہے کو تانبا بنا دیتی ہے اور اسی وجہ سے اسے بہت قیمتی خیال کیا جاتا ہے۔

ے عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اس شعر کے پہلے مصرع میں علامہ اقبال نے دل کو پرندے سے تشبیہ دی ہے لیکن عام پرندوں کے برعکس دل کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ رہائی کی بجائے اپنی گرفتاری کو ترجیح دیتا ہے بشرطیکہ گرفتار کرنے والا عشق ہو۔ دوسرے مصرع میں دل کو پودے سے تشبیہہ دی گئی ہے البتہ فرق یہ ہے کہ کسی پودے پر بجلی گر پڑے تو وہ جل جاتا ہے لیکن دل ایسا پودا ہے جس کی شادابی کا راز اس پر عشق کی بجلی گرنے میں ہے۔ یعنی عشق کی بجلی کا نشکار ہونے کے بعد ہی اس کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔

موجِ دریا

(۶۲)

تعارف اِس نظم کے تین بند تھے لیکن نظرِثانی کے وقت صرف دو بند رکھے گئے۔ قلمزد ہونے والا بند باقیاتِ اقبال میں درج ہے۔

حلِ لغات عینِ ہستی: حقیقی زندگی، مقصودِ حیات، سیماب: پارا، پایاب: اُتھلا، کم گہرا، حلقۂ گرداب: بھنور، توسن: گھوڑا، خارِ ماہی: وہ ہڈی جو مچھلی کی پشت پر ہوتی ہے۔ زحمت: تکلیف،

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بے تاب مجھے ۔۔۔

وضاحت دریا کی موج کہتی ہے کہ میرا بے چین دل مجھے بے قرار رکھتا ہے۔ اس لیے کہ پارے کی طرح تڑپنا اور متحرک رہنا ہی میرے لیے حقیقی زندگی اور مقصودِ حیات ہے۔ یعنی اگر میں حرکت نہ کروں تو میرا وجود ختم ہو جائے۔ میرا نام موج ہے اور میرے لیے پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ یعنی سمندر بھی اتھلا اور کم گہرا ہے۔ میرے لیے سمندر میں پیدا ہونے والے بھنور بھی زنجیر نہیں بن سکتے۔ یعنی بھنور بھی میرا راستہ نہیں روک سکتے۔

میرا گھوڑا یعنی میں پانی میں ہوا کی طرح یعنی بہت تیزی سے سفر کرتی ہوں۔ اِس سفر میں مچھلی کی پشت پر اُگا ہوا کانٹا یعنی ہڈی بھی میرا راستہ نہیں روک سکی۔ عموماً کانٹے پاؤں کو زخمی کر کے مسافر کا راستہ روک لیتے ہیں لیکن دریا اور سمندر میں پایا جانے والا یہ کانٹا دریا کی موج کا راستہ نہیں روک سکتا۔

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے ۔۔۔

وضاحت موجِ دریا کہتی ہے کہ کبھی تو چودھویں رات کا پورا چاند مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے، اشارہ ہے جوار بھاٹے اور سمندر میں اٹھنے والے مد و جزر کی طرف جو دریا اور سمندروں کی سطح پر چودھویں رات کے پورے چاند کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور چاند کی کشش کے باعث پانی کی موجیں دریا یا سمندر کی عام سطح کے مقابلے میں بہت بلند ہو جاتی ہیں۔ موج کہتی ہے کہ کبھی میں دریا کے کنارے سے اپنا سر ٹکراتی ہوں۔ میں ایسا مسافر ہوں جسے اپنی منزل سے بہت محبت ہے اور میں جلد از جلد سفر طے کر کے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ یہ ساری بیتابی

بے چینی اور بیقراری جس وجہ سے ہے یہ صرف میرا دل جانتا ہے۔ دراصل میں دریا کی تنگ دامانی سے نجات حاصل کرکے بے کنار ہونا چاہتی ہوں اور سمندر کی فراخی و وسعت سے جدائی کی وجہ سے پریشان اور مضطرب ہوں۔

رخصت اے بزمِ جہاں

(۶۳)

تعارف یہ نظم سب سے پہلے "دکن ریویو" میں شائع ہوئی تھی۔ پھر کچھ ترمیمات کے ساتھ مارچ ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی۔ بانگِ درا کی اشاعت کے وقت اِس کے چھ شعر قلمزد کر دیے گئے جو باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔ یہ شعر سرودِ رفتہ میں بھی دیے گئے ہیں۔

اس نظم کا مرکزی خیال "ایمرسن" کی ایک نظم سے لیا گیا ہے۔ گو یہ نظم طبع زاد نہیں اس کے باوجود علامہ اقبال کے اس دور کے بعض بنیادی افکار کی ترجمانی کرتی ہے مثلاً اِس میں علامہ کی نظم "ایک آرزو" کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔

حلِ لغات بزمِ جہاں: دنیا کی محفل۔ افسردہ دل: مایوس۔ درخورِ محفل: محفل کے قابل۔ شبستانِ وزیر: وزیر کی عشرت گاہ۔ زنجیرِ طلائی: سونے کی زنجیر۔ شیدا: عاشق۔ کنجِ عزلت: تنہائی کا گوشہ۔ گوش برآواز: بات سننے کے لئے تیار و آمادہ، متوجہ۔ خندہ زن: تمسخر اڑانے والا، مذاق کرنے والا۔ نمود: ظہور، ظاہر ہونا۔ رازِ ہست و بود: دنیا کا راز۔

۱ رخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں ـ ـ ـ

وضاحت علامہ اقبال دنیا اور اہلِ دنیا سے مخاطب ہو کر اپنے لیے رخصت ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب میں اس دنیا سے اپنے وطن کی طرف روانہ ہوتا ہوں اس لیے کہ اس دنیا میں جو بظاہر بہت آباد ہے لیکن حقیقتاً بہت ویران ہے میرا دل نہیں لگتا۔ میں مایوس اور دل شکستہ ہوں اور محفل کے قابل نہیں ہوں یعنی محفل آرائی کیلئے جو دلچسپی اور جوش و ولولہ چاہیئے، میرا دل اُس سے خالی ہے۔ اِسی بنا پر نہ یہ دنیا میرے قابل

ہے اور نہ میں اِس کے لائق ہوں ۔ اہلِ دنیا کے لئے بادشاہوں کے دربار اور وزیروں کی عشرت گاہیں کوئی اہمیت رکھتی ہوں گی لیکن میرے لیے تو ان کی حیثیت صرف قفس اور قید خانے کی ہے ۔ اور میرا دل جسے سنہری زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے، ان زنجیروں کو توڑ کر ان سے آزادی حاصل کرے گا۔ مراد یہ ہے کہ علائقِ دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا۔

اے دنیا! اگرچہ تیری محفلوں میں بہت ہنگامے اور ان کی وجہ سے بڑی دلچسپیوں کا سامان ہے لیکن اس کے باوجود تیری محفلوں میں رہتے ہوئے بھی دلی طور پر ان سے بہت دور رہا اور ان میں کھو نہ سکا۔ طویل عرصے تک ان لوگوں کے ساتھ زندگی گذاری جو بہت ہی خود پسند اور متکبر ہیں۔ لیکن مجھے چین اور اطمینان نہ مل سکا۔ اور میں سمندر کی موج کی طرح مضطرب و بے تاب ہی رہا۔ تیری عیش و عشرت کی محفلوں میں طویل عمر گذار دی لیکن کچھ حاصل نہ ہو سکا اور میں تاریکیوں سے روشنی پانے کی بیکار اور فضول کوشش کرتا رہا لیکن افسوس اِس دنیا میں مجھے میرا مقصود نہ مل سکا۔ اب میں دنیا سے تنگ آ گیا ہوں اور میری آنکھیں ایک اور نظارے کی متلاشی ہیں۔ میں طوفانوں کا مارا ہوا ہوں اور مجھے ساحل کی آرزو ہے۔ میں دنیا سے اِس طرح جا رہا ہوں جس طرح خوشبو چمن سے رخصت ہوتی ہے۔ اور اے دنیا مجھے جانے کی اجازت عطا کر کہ اب میں اپنے وطن کی طرف جانے کا خواہاں ہوں

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں ۔ ۔ ۔

وضاحت پہلے بند میں علامہ اقبال نے دنیا کی خرابیوں اور ان کے باعث دنیا سے اپنی اکتاہٹ کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے بند میں ان دلچسپیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو شہروں اور آبادیوں کے مقابلے میں جنگلوں، ویرانوں اور پہاڑوں کے دامن میں ہیں اور جو حضرت علامہ کو بہت مرغوب ہیں اور جن کے باعث وہ اس دنیا کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے پہاڑ کے دامن کی خاموشیوں میں اپنا گھر بنایا ہے۔ اس سکوت اور خاموشی میں جو لطف ہے وہ تقریروں اور گفتگوؤں میں نہیں۔ علامہ اقبال نے ایک اور نظم "ایک آرزو" میں یہی خیال اِس طرح پیش کیا ہے۔

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

علامہ کہتے ہیں کہ مجھے انسانوں کی بجائے نرگس اور گلاب کے پھولوں کی ہم نشینی اور رفاقت زیادہ عزیز ہے۔ میں چمن میں رہتا ہوں اور یہ بات میرے لئے بہت بہتر ہے کہ میں بلبل کا پڑوسی اور ہمسایہ ہوں۔ شام کو کہساروں کے چشموں کی دلپذیر آواز مجھے لوری دے کر سلاتی ہے اور میں وادیٔ کوہسار میں سبزے پر سو رہتا ہوں جہاں سے صبح کو کوئل اپنے نغموں سے بیدار کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے نظم ایک آرزو میں یہ خیال اس طرح پیش کیا ہے۔

ع لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

ع پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
میں اُس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تمام لوگوں کو اس دنیا میں محفل آرائی اور محفل کے ہنگامے اور رونقیں پسند ہیں لیکن شاعروں کو ان ہنگاموں کی بجائے وہ مقامات زیادہ اچھے لگتے ہیں جہاں انھیں تنہائی میسر آسکے۔

ع ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں ۔ ۔ ۔

وضاحت

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ شاید میں دیوانہ اور سودائی ہوگیا ہوں۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آبادیوں میں میرا دل نہیں لگتا۔ معلوم نہیں میں پہاڑوں کی وادیوں میں کس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ کس کا عشق ہے جو مجھے سبزہ زاروں میں لئے پھرتا ہے اور گھر کے آرام دہ بستر چھوڑ کر چشموں کے کنارے پر سو جانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔

اے دنیا والو! تم مجھے طعنے دے رہے ہو کہ میں تنہائیوں کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن اے حقائق سے بے خبر اور غفلت برتنے والے لوگو تمہیں دیکھنا چاہیئے کہ میں تمھارے سامنے فطرت اور اُس کے مظاہر کا پیغام پیش کر رہا ہوں۔ میں صنوبر کا ہم وطن ہوں یعنی جس طرح صنوبر کا درخت آبادیوں اور شہروں کی بجائے باغوں، گلستانوں، جنگلوں اور پہاڑوں پر اگتا ہے اور آزاد زندگی گزارتا ہے یہی کیفیت میری ہے۔ میں قمری کے دل کا بھید جانتا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس چمن میں ہمہ وقت پیغام فطرت سننے کے لیے تیار اور آمادہ رہتا ہوں۔

میں شاعر ہوں اور اس حیثیت میں جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں، اُسے اپنی شاعری کے ذریعے دوسروں تک پہنچا دیتا ہوں۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں علامہ اقبال نے اپنا

نظریۂ شعر بھی پیش کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ شاعر اپنی ذہانت، لیاقت، قوتِ مطالعہ و مشاہدہ اور عبقریت کے علاوہ قوتِ شعر گوئی کو قوم و ملک اور انسانوں کے اجتماعی مفادات کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں تنہائی پسند ہوں اور ویرانوں، جنگلوں اور کہساروں میں اپنے گھر پر مجھے فخر ہے۔ یہ زندگی ایسی ہے کہ میں اس کے مقابلے میں دارا و سکندر جیسے عظیم بادشاہوں کی حکومتوں کو بھی ہیچ تصور کرتا ہوں۔ محلوں اور عشرت کدوں میں زندگی گذارنے کی نسبت کسی گلشن میں درخت کے نیچے لیٹنا اور آرام کرنا انسان پر ایک جادوئی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب شام ہو جائے اور آسمان پر شام کا ستارہ روشنی دینے لگے۔

اقبال کہتے ہیں کہ علم کے حیرت کدے یعنی فلسفہ و منطق میں اس حقیقتِ عظمیٰ کا سراغ نہیں مل سکتا جو صرف پھول کی ہستی دیکھنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان فطرت کے قریب رہ کر زندگی اور کائنات کے بھید آسانی سے پا سکتا ہے جبکہ شہری زندگی اور اس کے تکلفات اور فلسفیانہ مباحث سے باتیں تو بنائی جا سکتی ہیں لیکن حقیقتِ حال کا سراغ لگانا ممکن نہیں اور اقبال کے نزدیک آبادیوں پر ویرانوں کو ترجیح بھی اسی بنا پر حاصل ہے۔

طفلِ شیر خوار

(۶۶)

تعارف طفلِ شیر خوار پہلی مرتبہ فروری ۱۹۰۴ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس کے اکیس شعر تھے۔ نظرثانی میں صرف بارہ شعر رکھے گئے۔ قلمزد ہونے والے نو شعر باقیات اقبال اور سرودِ رفتہ دونوں کتابوں میں درج ہیں۔

طفلِ شیر خوار کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے ایک خط بنام شگفتہ بالو مرقومہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۴ء میں لکھتے ہیں۔

"بانگِ درا کی ایک نظم جس میں شیر خوار بچے کا چاقو یا کاغذ سے کھیلنے کا تعلق ہے انھوں نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے سلسلے میں لکھی تھی جب وہ ایک

تیر خوار بچے تھے۔"

حلِ لغات نو وارد: نیا آنے والا، نوزائیدہ بچہ ۔ اقلیم غم: دکھوں کی سلطنت مراد دنیا
بے آزار: تکلیف نہ دینے والا ۔ شرار: چنگاری ۔ جنبش: حرکت ۔
نوزائیدہ: نیا پیدا شدہ، چھوٹا بچہ ۔ تغیر پسند: غیر مستقل مزاج ۔ گریاں: رونے والا، روتا ہوا۔
خنداں: ہنسنے والا، ہنستا ہوا۔

۵ میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو - - - -

وضاحت علامہ اقبال دودھ پیتے یعنی بہت کم عمر بچے سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ میں نے تجھ سے چاقو چھین لیا ہے تو تُو اس پر رونے لگ گیا ہے۔ غالباً اس بنا پر کہ چاقو چھیننے کی وجہ سے تو مجھے اپنا دشمن سمجھ رہا ہے حالانکہ میں تیرا دوست ہوں اور میں نے تجھ سے ہمدردی کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔

بچے سے چاقو چھین لیا گیا تو وہ قلم سے کھیلنے لگا۔ اس پر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے دنیا میں نئے آنے والے یعنی بہت کم عمر اور ناتجربہ کار بچے خیال رکھنا قلم کی نوک بہت باریک ہے اور یہ چبھ سکتی ہے۔ اب تو تُو اس سے کھیل رہا ہے لیکن اگر یہ چبھ گئی تو پھر تُو تکلیف کے باعث روئے گا۔ اقبال کہتے ہیں کہ معلوم نہیں تجھے ان چیزوں سے کیوں محبت ہے جو تکلیف کا باعث بن سکتی ہیں۔ تجھے چاہیئے کہ چاقو یا قلم کی بجائے کاغذ کے ٹکڑے سے کھیلے جس سے تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔

شاعر بچے سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرے کھلونے کہاں غائب ہو گئے، تیری گیند اور چینی سے بنی ہوئی وہ بلی جس کا سر ٹوٹا ہوا ہے، کہاں گئیں۔ شاعر کہتا ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے تیرے دل میں کسی طرح کی کوئی آرزو نہیں تھی لیکن جیسے ہی تیری آنکھ کھلی یعنی تو پیدا ہوا اور اس دنیا میں آیا، تیرے دل میں خواہشوں کی چنگاری روشن ہو گئی۔ لیکن جس طرح ابھی تو آزادانہ حرکت نہیں کر سکتا اسی طرح تیری خواہشیں بھی تیرے ہاتھوں کی حرکت اور دیکھنے کے انداز میں چھپی ہوتی ہیں یعنی تو جس چیز کو پسند کرتا ہے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ اُسے اٹھا لے یا پھر محض اسے دیکھتا رہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تیری طرح تیری خواہشیں بھی اس دنیا میں نئی نئی پیدا ہوئی ہیں۔

اے بچے! تیری زندگی اختلافات کی قید سے بالکل آزاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ تو قدرت کے حقیقی رازوں سے واقف و آگاہ ہے۔ یعنی شاعر کے خیال میں امتیازات انسان کو حقائق سے بے خبر کر دیتے ہیں۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے بچے جب تو کسی بات پر ناراض ہو کر رونے لگتا ہے تو تھوڑی ہی دیر بعد کسی بالکل معمولی چیز مثلاً ردی کاغذ کو پانے سے خوش بھی ہو جاتا ہے۔ گویا تیرے مزاج میں استقلال نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس عادت میں مَیں بھی تجھ سے مناسبت رکھتا ہوں۔ یعنی تو بھی تغیر پذیر مزاج رکھتا ہے اور میں بھی ایسے ہی مزاج کا حامل ہوں۔ میں بھی تیری طرح وقتی دلچسپیوں کا عاشق ہوں اور ان کو نہ پا سکنے کی صورت میں رونے لگتا ہوں۔ مجھے بھی تیری طرح بہت جلد غصہ آجاتا ہے اور میں بھی بہت جلد خوش ہو جاتا ہوں۔ میری آنکھوں کو بھی حُسن کے ظاہری مناظر اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں اور اس طرح دیکھا جائے تو میں بھی سادگی اور ناسمجھی میں بالکل تیری ہی طرح ہوں مَیں بھی تیری طرح کبھی رونے لگتا ہوں کبھی ہنسنے لگتا ہوں۔ گو بظاہر میں نوجوان ہوں لیکن حقیقت میں میری کیفیت بھی ناسمجھ اور سادہ لوح بچے سے مختلف نہیں ہے۔

تصویرِ درد

(۶۸)

تعارف علامہ اقبال نے یہ نظم ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی۔ مارچ ۱۹۰۴ء میں اسے ماہنامہ مخزن میں شائع کیا گیا۔ اُس وقت اِس میں دس بند اور کل ایک سو تیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں دوسرے اور ساتویں بند کے علاوہ کچھ شعر بھی قلمزد کر دیئے گئے۔ اب بانگِ درا میں اِس نظم کے صرف اہتّر شعر شامل ہیں۔ یہ نظم ترکیب بند کی ہیئت میں ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری ۔۔۔

حلِ لغات منت کش: احسان اٹھانے والا۔ تابِ شنیدن: قوتِ سماعت، سننے کی طاقت، زباں بندی: خاموش رہنے کا حکم۔ طوطی: ایک خوش آواز پرندہ، حیاتِ جاوداں: ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی۔ مرگِ ناگہاں: اچانک آنے والی موت۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ میری داستان نے کسی سننے والے کا احسان نہیں اٹھایا۔ یعنی کسی بھی شخص نے میری شاعری اور میرے پیغام پر توجہ نہیں دی اور نہ اس کی اہمیت کو سمجھا۔ بعض شارحین نے داستان نہ سننے کی وجہ داستان کی درد انگیزی بیان کی ہے جبکہ حقیقت حال

اس کے برعکس ہے اور ایسا درحقیقت اہلِ وطن کی بے حسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ یعنی اپنی بے حسی کی وجہ سے اقبال کی باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر گفتگو پر خاموشی کو ترجیح دیتے ہوئے چپ رہنے کو بہتر خیال کرتا ہے اور خاموشی کو وسیلۂ اظہار بنالیتا ہے یعنی کچھ نہیں کہتا۔

شاعر قوم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ آخر تمہاری بزم میں خاموش رہنے اور کچھ نہ کہنے کی رسم کیوں عام ہوگئی ہے جس کی وجہ سے میں بھی قوم کے سامنے اپنا مدعا پیش کرنے سے قاصر ہوں یعنی میرے پاس پیغام تو ہے اور وہ پیغام میں اہل وطن تک پہنچانا بھی چاہتا ہوں لیکن بزم کا دستورِ زباں بندی یعنی خاموش رہنے کا اصول آڑے آتا ہے اور میں چپ ہو جاتا ہوں۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے اہلِ وطن نے میرا پیغام سننے سے انکار کر دیا البتہ پیغام کی نوعیت اہمیت اور دلکشی کی وجہ سے میری داستان کے اوراق سے گل لالہ، گل نرگس اور گلاب کے پھول فیضیاب ہو رہے ہیں۔ یعنی اگر داستان کو ایک کتاب فرض کر لیا جائے تو ان پھولوں نے اس کتاب کے مختلف اوراق حاصل کرلئے ہیں۔ شاعر نے اِس شعر میں پھولوں کی پتیوں کو اپنی داستان کے ورق قرار دیا ہے۔ ایک شعر میں لالے، نرگس، گلاب اور چمن کا ذکر بھی صنائع لفظی کی اچھی مثال ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح میری داستان سے لالہ، نرگس اور گلاب استفادہ کر رہے ہیں، بالکل اسی طرح قمری، طوطی اور بلبل بھی اس سے بے اعتنائی نہیں برت رہے۔ ان کے نغمے دراصل میری ہی آہ و زاری کا دوسرا انداز ہے۔ یعنی شاعر کہنا چاہتا ہے کہ ان خوش گلو پرندوں نے گانے کا انداز مجھ ہی سے سیکھا ہے اور ان کے نغموں میں جو موسیقیت اور سوز و گداز کی کیفیت ہے وہ میری ہی طرزِ فغاں کی وجہ سے ہے۔ اس شعر میں بھی صنعتِ حسنِ تعلیل اور رعایت لفظی موجود ہے۔

علامہ اقبال شمع سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں سرتا پا درد میں ڈوبا ہوا ہوں اور میری ساری کہانی حسرت ناک ہے۔ میری اِس کیفیت پر اے شمع تجھے بھی پروانے کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اِس دنیا میں میں انتہائی بے بس ہوں۔ گو میں انسان ہوں اشرف المخلوقات ہوں اور دنیا میں تیرا نائب بھی۔ لیکن میری بے بسی کی حالت یہ ہے کہ نہ تو مجھے ہمیشگی کی زندگی حاصل ہے اور نہ میرے اختیار میں وہ موت ہے جو اچانک آجائے۔ اور اگر بے بسی اور بے اختیاری کی یہی کیفیت ہے تو پھر اِس دنیا میں رہنے اور جینے کا فائدہ کیا ہے۔ اور یہ دکھ صرف میرا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ساری دنیا کا دُکھ ہے یعنی صرف میں ہی

بے بس نہیں بلکہ ساری کائنات اور اس کے جملہ مظاہر بے اختیار ہیں۔ میں اس کائنات کا ایسا پھول ہوں کہ اگر میں خزاں زدہ ہو گیا تو کائنات کے ایک ایک پھول یعنی ہر مظہر پر خزاں چھا جائے گی اور ہر شے اپنے حسن اور رجوبن سے محروم ہو جائے گی۔ اس شعر کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس بے اختیاری کی کیفیت کا صرف میں ہی شکار نہیں بلکہ دنیا کی ہر شے بے اختیار ہے اور یوں میں صرف اپنے ہی دکھ کا اظہار نہیں کرتا بلکہ سارے گلشن کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھ کر انھیں اپنی شاعری میں پیش کرتا ہوں۔ اس لیے تکلیف خواہ کسی بھی چیز کو پہنچے میں اپنے حساس دل کے باعث اسے اپنی ہی تکلیف اور اپنی ہی مصیبت تصور کرتا ہوں۔

اس دنیا میں جو کہ حسرتوں کا گھر ہے، میں ایک مدت سے گھنٹی کی سی کیفیت رکھتا ہوں۔ کیونکہ دل کے تڑپنے کے باعث مسلسل شور و غل کر رہا ہوں۔ لیکن گھنٹی کے برعکس میری آہ و زاری اور شور و غل کسی پر ظاہر نہیں ہے۔

؂ ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں ۔۔۔

حلِ لغات

ریاضِ دہر : دنیا کا باغ مراد دنیا ؛ **حرفِ زیرِ لب** : وہ بات جو ابھی منہ سے نہ نکلی ہو ؛ **شرمندۂ گوشِ سماعت** : وہ بات جو سننے والے کان سے خجل و شرمسار ہو کر کہی تو گئی لیکن کسی نے سنی نہیں۔ **مشتِ خاک** : مٹی کی مٹھی ؛ **گردِ کدورت** : مادیت کا غبار ؛ **ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی** : کائنات کو دیکھنے اور اس کا مشاہدہ کرنے کا احسان اٹھانے والا ؛ **ولایت** : سلطنت ؛

وضاحت

علامہ اقبال اس بند کے ابتدائی اشعار میں اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں وہ بدنصیب شخص ہوں جسے ایک لمحے کے لیے ذرا سی بھی مسرت اور شادمانی حاصل نہ ہو سکی۔ میں اس دنیا کے گلشن میں عیش و عشرت کی محفلوں سے بالکل بیگانہ ہوں۔ میرا شمار اُن لوگوں میں ہے جن کو خوشیاں نہ ملنے کے باعث خود خوشی اور مسرت بھی ماتم و افسوس کرتی ہے چونکہ میری صدا پر کوئی کان نہیں دھرتا اور میرا پیغام سننے کے لیے کوئی بھی شخص تیار نہیں ہے لہٰذا اس بات پر میری بولنے کی قوت و صلاحیت بھی یعنی شاعری بھی افسوس کر رہی ہے۔ اس لیے کہ میں اس دنیا میں اُس حرف کی مانند ہوں جو بالکل آہستہ آہستہ ادا کیا گیا ہو اور کسی کے کان تک نہ پہنچ سکا ہو۔ یعنی اسے کسی نے نہ سنا ہو۔ یہ خیال ایک اور انداز میں میر تقی میر نے یوں نظم کیا ہے۔

؂ احوالِ میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا کچھ زیرِ لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر

اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ میں مٹھی بھر خاک ہوں اور وہ بھی ایسی جو بکھر چکی ہو لیکن اس کے باوجود یہ معلوم نہیں کہ میں دنیا کے غالب جتھے کو فتح کر لینے والے سکندر اعظم کی حیثیت رکھتا ہوں یا میری حیثیت جمشید کے پیالے کی سی ہے جو خود تو بہت صاف و شفاف اور باکمال تھا لیکن دوسروں کی خدمت کے لیے وقف تھا یا میں صرف غبارِ مادیت یعنی بالکل حقیر اور بے قیمت چیز ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ سب کچھ درست ہے اور میرے بے مایہ اور بے وقعت ہونے میں کوئی شک نہیں اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ میرا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا بنیادی مقصد ہے۔ گو میں اندھیرا اور تاریکی ہوں لیکن ایسا اندھیرا اور ایسی تاریکی جس کی حقیقت روشنی ہو اور جو نور کے علاوہ کچھ نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ میری حیثیت ایک خزانے کی ہے۔ لیکن ایسے خزانے کی جو صحرا میں چھپا ہوا ہو اور جس سے کوئی استفادہ نہ کر سکتا ہو۔ یعنی علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس ملک میں میری حیثیت یقینی طور پر خزانے کی ہے لیکن ابھی تک میری حقیقی صلاحیتیں کھل نہیں سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے صحیح معنوں میں استفادے کی صورت بھی پیدا نہیں ہو سکی۔

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے یعنی انسان کو اس کائنات اور اس کے مظاہر کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ کائنات کے مقابلے میں چھوٹا ہونے کے باوجود میری اپنی حیثیت ایک سلطنت جیسی ہے۔ یعنی وہ تمام صفات اور خصائص خود مجھ میں بھی موجود ہیں جو کائنات اور اس کے جملہ مظاہر کو عطا کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے مقابلے میں کائنات کو قابلِ اعتنا تصور نہیں کرتا۔

اس دنیا میں اگر میری حیثیت کا اندازہ لگایا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ میری حیثیت شراب کی ہے نہ میں ساقی ہوں نہ مستی اور نہ پیمانہ۔ اس کے باوجود زندگی کے اس شراب خانے میں یہ تمام چیزیں صرف میری وجہ سے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت میری وجہ سے متعین ہوتی ہے۔ ان کے بنانے اور استعمال میں لانے والا میں ہی ہوں۔ میرے بغیر یہ سب بے وقعت اور بے معنی ہیں۔

مجھے کائنات کے حقائق جاننے کے لئے ظاہری وسائل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ حقائق میرا دل جو آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہے، از خود مجھے دکھا دیتا ہے۔ یعنی انسان کا دل اس خصوصیت کا حامل ہے کہ اگر انسان ذراسی توجہ کرے تو ہر راز اس پر از خود عیاں ہو جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اپنے کلام میں میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں کرتا بلکہ اپنی شاعری میں وہی کچھ

پیش کرتا ہوں جسے میری آنکھیں دیکھتی اور دل محسوس کرتا ہے۔

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں ۔۔۔

حلِ لغات

رنگیں بیاں: مراد شاعر۔ بامِ عرش کے طائر: فرشتے۔ جنونِ فتنہ ساز: ہنگامے رکھنے والا جنون وسودا یعنی عشق۔ قضا: تقدیر، قسمت، عبرت خیز: نصیحت اور انتباہ کرنے والا۔ کلکِ ازل: قلم تقدیر بمعنی قضائے الٰہی۔ نوحہ خواں: ماتم کرنے والے۔ برگِ گل: پھول کی پتی۔ گلچیں: پھول توڑنے والا مراد انگریز۔ رزم آرائیاں: جھگڑے اور لڑائیاں۔ عنادل: عندلیب کی جمع بلبل۔ وظیفہ: وہ تسبیح جو روزانہ پڑھی جائے، روزمرہ کا مقررہ ورد۔ بوستاں: باغ۔ اسلوبِ فطرت: قدرت کا اصول۔

وضاحت

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے شاعر ہیں لیکن مجھے ایسی شاعری عطا کی گئی ہے کہ فرشتے بھی میرے ہم زباں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنی شاعری میں وہی باتیں پیش کرتا ہوں جو پہلے مشیتِ ایزدی کو پورے کرنے والے فرشتوں کے خیال میں ہوتی ہیں یعنی میری شاعری صداقت اور سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ فتنے اور ہنگامے پیدا کرنے والے جنون یعنی عشق کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ میں اس قدر حساس ہوں کہ قدرت اور قضا و قدر کے سبھی راز مجھ پر عیاں ہیں جو میں اپنی شاعری میں پیش کر دیتا ہوں۔ ان دو شعروں میں علامہ اقبال نے اپنی شاعری کا منصب بیان کیا ہے۔

اے سرزمینِ ہندوستان تیری کیفیت ایسی ہے کہ تجھے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ تیری کہانی دنیا کے تمام خطوں اور ممالک کی داستانِ آزادی و غلامی کے مقابلے میں کہیں زیادہ دردناک اور حیرت انگیز ہے۔ اس وجہ سے لوگ تیری داستان سے عبرت اور تنبیہہ حاصل کرتے ہیں۔

اے ہندوستان: اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک دُکھ عطا کیا ہے اور یہ دُکھ تیرا دُکھ ہے۔ اس دُکھ کے بعد مجھے کسی اور شے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں رات دن اپنی شاعری میں تیرے ہی غم بیان کرتا رہتا ہوں۔ دراصل خدا اور قضا و قدر نے ان لوگوں میں شامل کر دیا ہے جو تیرے نوحہ خواں اور ماتم کرنے والے ہیں اور مجھے اسی کام سے فرصت نہیں ہے۔

اے پھول توڑنے والے! پھول تو پھول اس گلستاں یعنی ہندوستان میں تو پھول کی پتی کا نشان تک بھی نہ چھوڑ۔ اس لیے کہ باغ کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ اس کی حفاظت کرنے کی بجائے آپس

ہیں لڑرہے ہیں۔ ان کے اپنے ہی جھگڑے ان کو فرصت نہیں دیتے۔ یہ تیری خوش قسمتی ہے ورنہ وہ تجھے اِس طرح گلستان کو پامال کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ شعر میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انگریز ہندوستان کا استحصال کر رہے ہیں لیکن اہلِ ہند آپس کے جھگڑوں کے سبب اس استحصال کو روکنے کی طرف متوجہ بھی نہیں ہو سکتے۔ اقبال نے ایسی صورتِ حال پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔

علامہ اقبال دردِ وطن رکھنے والے اہلِ وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آسمان یعنی گردشِ شب و روز اور تقدیر نے ہندوستان کو تباہ و برباد کرنے کا پورا پورا سامان کر لیا ہے۔ اِس نے اپنی آستین میں وہ بجلیاں بھی چھپا رکھی ہیں جو اِس گلستان یعنی ہندوستان کو جلا کر خاکستر کر دیں گی۔ ایسے میں بلبلوں کو جو گلشن اور پھول سے عشق کے مدعی ہیں، اپنے گھونسلوں میں حالات سے بے خبر اور بے پروا ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ گلستان اور اپنے آشیانوں کے تحفظ کیلئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اے اہلِ ہندوستان تم میری بات نہیں سنتے۔ ایسا تمھاری غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے ہے۔ تم میری شاعری کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ حالانکہ تمھیں میری آواز پر کان دھرنا چاہیئے کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے تو گلشن کے پرندے بھی وظیفے کی طرح پوری پوری پابندی سے پڑھتے اور یاد کرتے ہیں۔

علامہ اقبال اہلِ ہند کو نادان قرار دیتے ہوئے تنبیہ کرتے ہیں کہ تمھیں اپنے وطن کی فکر کرنی چاہیئے اور اس کی آزادی اور استحکام کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمھاری بے توجہی اور بے پروائی کے باعث تمھاری اور تمھارے وطن کی بربادی بہت قریب ہے اور مشیت ایزدی نے اپنے اصولوں کے مطابق اس کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم خود اپنی آزادی اور خود مختاری کے لیے جدوجہد نہ کر سکے وہ تا دیر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔

حضرت علامہ اہلِ ہند کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمھیں حال اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ماضی اور حال کی داستانوں کو چھیڑنے اور ان کے حوالے سے جھگڑوں میں پڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ اشارہ اُن مباحث کی طرف ہے جو اس دور کے ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ماضی اور ایک دوسرے پر اُن کی زیادتیوں کو موضوع بنا کر ایک دوسرے کو ظالم قرار دینے کے لیے ہو رہے تھے۔ علامہ اقبال نے یہی خیال ایک اور نظم میں یوں پیش کیا ہے۔

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

اقبال کہتے ہیں کہ اہل ہند کو اپنی غلامی اور ہونے والے مظالم پر مزید خاموشی اختیار نہیں کرنی چاہیئے آخر اس کی بھی ایک حد ہونی چاہیئے۔ انھیں چاہیئے کہ اب احتجاج کریں اور وہ بھی اِس انداز میں کہ ان کی آہ و فریاد کی آوازیں آسمان تک گونج اٹھیں اور اِس سے انگریزوں کے بلند و بالا ایوان تھرانے لگیں۔

اقبال تنبیہہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اہل وطن تمھیں حالات اور ان کی نزاکت کو سمجھنا چاہیئے اور اس کے مطابق اپنے عمل اور لائحہ عمل میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے۔ بصورت دیگر تم مٹ جاؤ گے اور وہ بھی اس طرح کہ آئندہ نسلیں تمھیں ایک داستان اور ماضی کے ایک قصّے کے طور پر بھی یاد نہ رکھ سکیں گی یعنی تمھیں بالکل فراموش کر دیا جائیگا۔ ویسے یہ تاریخ کا ایک بہت ہی اہم سبق ہے کہ جو قوم اپنی آزادی اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد نہیں کرسکتی وہ صفحۂ ہستی سے بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں اور قدیم ہندوستان کی مفتوحہ اقوام کے دردناک حشر کو بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے جنکا آج وجود بھی نہیں ملتا اور تمام آثار و شواہد بھی مٹ چکے ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ یہ بات صرف ایک شاعر کی نکتہ آفرینی نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کا یہی دستور و اصول ہے۔ قدرت صرف اسی قوم کو زندہ رکھتی ہے جو عمل سے منہ نہ موڑے اور ہمہ وقت اِس دنیا میں سرگرمِ عمل رہے۔

۵ ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کرکے چھوڑوں گا۔۔۔

حلِ لغات ہویدا: عیاں، ظاہر۔ زخمِ پنہاں: چھپے ہوئے زخم، وہ زخم جو نظر نہ آئیں۔ سوزِ پنہاں: چھپی ہوئی جلن۔ سینہ کاوی: سینے کو کھرچنے اور کریدنے کا عمل، سینے کو زخمی کرنا۔ تقاضا: مانگ، ضرورت، صلاحیت۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ گو اہل ہند میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں۔ اِس کے باوجود میں اپنا فرض ادا کروں گا اور جو کچھ میرے دل پر زخم لگے ہوئے ہیں، انھیں ظاہر کردوں گا۔ یہ زخم انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے بھی ہوسکتے ہیں اور خود اہل ہند بھی ان کا سبب ہو سکتے ہیں۔ بہرحال علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جن زخموں کے باعث میں مبتلائے درد و تکلیف ہوں اب انھیں میرے اہل وطن بھی دیکھ لیں گے۔ میں اِس قدر روؤں گا کہ میرے پرخوں آنسوؤں سے سارا ہندوستان گلستان کی طرح پھولوں سے بھر جائے گا۔ واضح رہے کہ گلاب کے پھول بھی سرخ ہوتے ہیں اور خون کا رنگ بھی یہی ہوتا ہے۔ اقبال نے اِس سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ میرے خون آمیز آنسوؤں پر لوگوں کو

پھولوں کا گمان گزرے گا۔

علامہ کہتے ہیں کہ مجھے اپنی کوشش جاری رکھنی ہے اور میری کوشش یہ ہے کہ ملک کے تمام لوگوں کے دل میں بلا تفریقِ مذہب و ملت آزادی اور جدوجہد کی شمع روشن ہو جائے۔ میں ہر قیمت پر اور بڑی سے بڑی قربانی دے کر اپنی شاعری کے ذریعے اِس شمع کو جلاؤں گا اور ہندوستان کا مقدر ہو جانے والی سیاہ رات کو دلوں میں جلنے والی ان شمعوں سے روشن کر دوں گا۔

میں اپنے وطن کی دردناک صورتحال کی وجہ سے سرتاپا درد ہو گیا ہوں۔ میں درد سے پُر اپنی خاک کو پورے چمن میں بکھیر دوں گا شاید اس کے بعد گلشن میں جو بھی پھول اُگیں وہ میرے درد اور کرب سے واقف ہوں۔ تغزل کے انداز میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرے پیغام سے بوڑھے لوگ متاثر ہوں یا نہ ہوں لیکن میں کوشش کروں گا کہ نوجوان نسل میرے درد کی کسک سے آگاہ ہو جائے اور اپنے آپ کو آزادیٔ وطن کے لئے وقف کر دے۔ اقبال کا کلام دراصل ہے ہی نوجوانوں کے لئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر دور میں اقبال کے پیغام کو نوجوانوں ہی نے آگے بڑھایا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میری قوم کی حالت تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی مانند ہے۔ ان کو دوبارہ متحد و یکجا کرنا سخت دشوار ہے۔ لیکن اگر یہ کام مشکل اور دشوار بھی ہے تو بھی میں تسبیح کے ان متفرق دانوں کو یکجا کرنے کا کام انجام دوں گا۔ یعنی ملک میں بسنے والی مختلف قومیتوں اور مذاہب کے افراد کو آزادیٔ وطن کے مشترکہ مقصد کے لیے ایک ہی طریق پر جدوجہد کرنے کے لیے اتحاد و اتفاق کا سبق دوں گا۔

اے میرے قریب رہنے والے تو مجھے اپنا سینہ کھرچنے اور کریدنے کے عمل سے نہ روک، تجھے یہ خیال ہو گا کہ اِس طرح مجھے تکلیف ہو رہی ہے لیکن تکلیف کے باوجود میں یہ کام اُس وقت تک جاری رکھوں گا جب تک لوگوں کے درمیان کسی بھی طرح کی تفرقیں باقی ہیں۔ یعنی میں لوگوں کو محبت و اخوت اور بھائی چارے کی تعلیم دے کر انھیں متحد و متفق کئے بغیر دم نہ لوں گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ وطن اور اہلِ وطن کے بارے میں جو تصویر میں نے اپنے تخیل کی مدد سے دیکھی ہے اور جو خاکہ و نقشہ میرے پیشِ نظر ہے وہ میں تمام ہم وطنوں کے سامنے رکھ دوں گا۔ جو کچھ میں محسوس کر رہا ہوں اپنی شاعری کے ذریعے وہی تمام احساسات اہلِ ہند کے دلوں میں منتقل کر دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ جب لوگ اِس تخیل، تصور اور خاکے سے واقف ہوں گے تو وہ بھی آئینے کی طرح حیران رہ جائیں گے۔ (شاعری میں آئینے کو حیران اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ اس کا عکس اصل کے عین مطابق

اور بے حس وحرکت ہوتا ہے۔ گویا وہ حیرانی سے ہر چیز کو بے حس وحرکت دیکھتا رہتا ہے)

اقبال کہتے ہیں کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر وہ آنکھ جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ ان تمام باتوں سے بھی واقف ہو جاتی ہے جو ابھی عالمِ ظہور میں نہیں آئی ہوتیں اور پردۂ غائب میں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ چشمِ بینا اپنی بصیرت کی روشنی میں حالات سے اندازہ کر لیتی ہے کہ اب زمانہ کونسی کروٹ بدلے گا؟ کس نوعیت کے انقلابات آئیں گے اور اقوام وملل کے حالات کیا رُخ اختیار کریں گے؟

ع کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے۔۔۔

حلِ لغات

دل بستۂ محفل: بزم کا شوقین۔ فدا: نثار، قربان۔ تعصب: عقیدے اور قوم کی بنیاد پر نفرت اور اختلاف۔ آئینہ خانہ: وہ مکان جس کی دیواروں اور چھت پر آئینے نصب ہوں۔ بیداد: ظلم وستم۔ سینہ آسا: ہر مل کی طرح۔ کفِ آئینہ: آئینے کی ہتھیلی مراد آئینے کی طرح صاف وشفاف سطح۔ کج بینی: چیزوں کو غلط سمجھنا۔ غور وفکر کرتے ہوئے درست انداز سے نہ سوچ سکنا۔ سطرِ قرآن: قرآن شریف کی تحریر وعبارت۔ چلیپا: صلیب، چاندی یا سونے کی بنی ہوئی سولی کی وہ شکل جسے عیسائی اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ مراد ہے قرآن پر عمل کرنے کی بجائے اس کے تعویز بنالینا۔ بتِ پندار: غرور وتکبر۔ مطلق: منطق کی اصطلاح میں حدود وقیود سے آزاد۔ مقید: منطق کی اصطلاح میں حدود وقیود کا پابند۔

وضاحت

علامہ اقبال اہلِ وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم نے زمین پر بنے ہوئے پاؤں کے نقش ونشانات کی طرح اپنی عمر ذلت وخواری میں بسر کر دی۔ یعنی اہلِ ہند چھوٹے چھوٹے اور لایعنی فرقہ وارانہ مسائل میں الجھ کر اپنی توانائیاں ضائع کرتے رہے۔ تم نے کبھی بلند اور اعلیٰ نصب العین اختیار نہیں کیا۔

اگرچہ تم تمام عمر محفلوں میں موجود رہے اور ان محفلوں کے ہنگاموں میں شریک رہے لیکن تم نے کبھی ان محافل سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ہند کو اپنی چھوٹی بے وقعت اور بے بضاعت سی دنیا میں مگن رہنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ اور یہ کہ انھوں نے دیگر اقوامِ عالم سے بھی کوئی سبق حاصل نہ کیا۔

تم تمام عمر حُسن پرست رہے اور حسینوں پر اپنا دل نثار کرتے رہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو حسن خود تمھاری ذات میں تھا تم نے کبھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ یعنی اہلِ ہند ہمیشہ دوسروں کی صلاحیتوں اور عظمت کے گن گاتے رہے لیکن اپنی صلاحیت سے کام لینا نہ سیکھ سکے۔ اس کی

بجائے مذہب وملت اور فرقہ وارانہ اختلافات اور ان کی پیدا کردہ نفرت میں الجھے رہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے نادان اور ناسمجھ ہموطنو! اس دنیا میں تعصب کی بنا پر کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ لہٰذا تعصب ترک کر کے سب لوگوں کو باہم مل جل کر وطن کی آزادی اور بہتری کے لئے کوشاں ہونا چاہیئے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اہل ہند مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے جدا قومیں تصور کرتے ہیں حالانکہ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص آئینہ خانے میں کھڑا ہو کر اپنی مختلف تصویروں کو غیروں کی تصویریں سمجھ کر ان سے نفرت کرنا شروع کر دے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مذہب و ملت کے فرق کے علاوہ تمام ہندوستانیوں میں ایک وجہِ اشتراک بھی ہے یعنی وہ سب اہل ہند ہیں۔ انھیں سب کچھ بھول کر اسی ایک رشتے پر توجہ دینی چاہیئے۔

اقبال کہتے ہیں کہ وطن اور اہل وطن پر ہونے والے مظالم کے خلاف سب کو صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیئے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہر مل کا حقیر اور معمولی سا دانہ بھی اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ یہ قوت تیرے پاس بھی ہے اور تجھ پر مظالم بھی ہو رہے ہیں۔ لہٰذا تجھے بھی نالہ و فریاد اور آہ و زاری کرنا چاہیئے۔ اور ان مظالم کے خلاف عملی جدوجہد بھی۔ (نوٹ: ہر مل کا دانہ آگ میں گر کر آواز دیتا ہے)

کسی کے دل میں صفائی اور پاکیزگی ہو تو اس کے لیے تکلفات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تیرے عمل کی حقیقت یوں ہے جیسے کوئی شخص آئینے کی شفاف اور اجلی سطح پر مہندی لگا کر اُسے رنگین کرنا چاہے۔ جس طرح مہندی سے آئینے کو رنگین نہیں کیا جا سکتا بالکل اسی طرح دل کی طہارت اور پاکیزگی کے لیے بھی محض ظاہرداری کو کام میں نہیں لایا جا سکتا بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ کیا جانا چاہیئے۔

اے اہل ہند! تمھاری غلط فہمی اور غلط اندازِ نظر پر زمین تو زمین آسمان بھی ماتم کرتا ہے تم نے قرآن کے احکام پر عمل کرنے کی بجائے، قرآن کے تعویذ آڑے ترچھے انداز میں لکھ کر انھیں گردنوں میں لٹکا لیا اور یہ سمجھا کہ اس طرح انگریز ٹل جائیں گے۔ حالانکہ انگریز تو قرآن کے پیغام پر عمل کرنے سے ہی جائیں گے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ تم نے زبان سے اللہ تعالےٰ کو ایک ماننے کا اقرار اور دعوٰی کیا ہے لیکن اس سے کیا فائدہ؟ توحید کی حقیقت تو یہ ہے کہ انسان دل سے بھی اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اور جب انسان دل سے اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کا قائل ہو جائے گا تو پھر یہ غرور و تکبر جیسی برائیوں سے بھی پاک رہ سکے گا۔ لیکن اہل ہند نے توحید کا صرف زبانی طور پر اقرار کیا ہے

اِس لیے انھوں نے اپنے اپنے غرور و تکبر کے بت کی پرستش شروع کر رکھی ہے اور یوں حق و صداقت سے منہ موڑ رکھا ہے۔

علامہ کہتے ہیں کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم حُسن اور اس کی بدولت محبت و شیفتگی اور اخلاقِ عالیہ سے واقف و آگاہ ہو۔ لیکن اگر تم اِس اخلاق و محبت کا مظاہرہ صرف اپنے ہم فرقہ اور اپنی ذات و برادری کے لوگوں کے لیے کرتے ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی شخص نے حضرتِ یوسفؑ کو کنعان یا مصر میں آزاد دیکھنے کی بجائے کنویں میں مقید دیکھا ہو جہاں ان کا حسن قید و بند کی مصیبتوں کے باعث ماند پڑ چکا تھا یا وہ قید ہونے کی وجہ سے بے بس تھے۔ اگر تمھارا طرزِ عمل یہی ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی ناسمجھی سے حدود و قیود سے آزاد چیزوں کو حدود و قیود کا پابند کر دیا۔ یعنی محبت و اخوت ایسی چیز نہیں جسے تحدیدات کا پابند کیا جا سکے لیکن تم نے ایسی ہی نادانی کی ہے۔

(یوسف، سے مراد مقصد ہے۔ کنویں میں یوسف کو دیکھنے سے مراد ہے ذاتی مقاصد کی تلاش)

علامہ اقبال قوم کے ناصحوں اور واعظین سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمھیں اِس بات کا شوق ہے کہ تم قوم کے رہنما کہلاؤ لیکن تم اُن فرائض کو بالکل نہیں سمجھتے جو ایک رہبر و رہنما پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم منبر پر کھڑے ہوتے ہو تو لوگوں کو صرف اپنے طرزِ بیان سے محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ اور اگر تم کسی کو نصیحت کرتے ہو تو بھی حقائقِ عالم سے بے خبری کے باعث حالاتِ حاضرہ کے مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی بجائے صرف گزشتہ زمانے کے قصے سنانے پر اکتفا کرتے ہو۔ اِس سے لوگ تمھاری فصاحت و بلاغت کے گرویدہ تو ہو جاتے ہیں لیکن اُن کو اِس سے حقیقتاً کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

۵ دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو ۔ ۔ ۔

حلِ لغات

حسنِ عالم سوز: ساری دنیا کو جلا دینے والا حُسن۔ ساری دنیا کے دل میں اشتیاق پیدا کر دینے والا حسن۔ بوالہوس: ہوس کا باپ مراد انتہائی لالچی حریص اور دنیا دار انسان۔ تعصب: عقیدے اور قوم کی بنا پر نفرت و اختلاف۔ جذبۂ خورشید: سورج کی گرمی اور کشش۔ رفعت: بلندی۔ مجروحِ الفت: محبت کا زخمی، عاشق۔ ریاضِ طور: کوہِ طور کا باغ جہاں حضرت موسیٰؑ نے اللہ کا جلوہ دیکھا تھا۔

وضاحت

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تم اپنی آنسو بہاتی ہوئی آنکھوں کو اُس حسن سے آشنا کرو جو اپنے لئے پوری دنیا کے دل میں عشق و اشتیاق پیدا کرنے کی صلاحیت

دکھتا ہے ۔ یہ وہ عشق ہے جو پروانے کے دل کو مضطرب و بے چین کر دیتا ہے اور شبنم کو رونے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اب تو تمام اہل وطن مختلف فرقوں اور اسی اعتبار سے مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں اور اُن کے دلوں میں عشق و محبت اور ہمدردی کے جذبات بھی محض اپنے اپنے فرقوں اور قومیتوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں ۔ اِن جذباتِ محبت و اخوت کو کسی ایک فرقے کی بجائے تمام اہل ہند کے لیے بلا تفریق و امتیاز عام کرنا چاہیئے اور ان سے ہندوستان کے ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کو فائدہ پہنچنا چاہیئے ۔

حضرت علامہ کہتے ہیں کہ اے لالچی انسانو ! خدا تعالیٰ نے انسان کو آنکھیں صرف اس لیے نہیں دیں کہ بے بسی کے ساتھ ان کے ذریعے دنیا اور اہل دنیا کا تماشا کیا جائے اور خاموشی کے ساتھ انسان صرف دیکھتے رہنے پر اکتفا کرے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیئے دی ہیں کہ ان کے ذریعے انسان اپنے اور بیگانے میں تمیز کئے بغیر ہر شخص کے حالات پر نظر رکھے اور اس کی ضرورت اور اپنی ہمت و استطاعت کے مطابق اُن کے کام آئے ۔

اقبال کہتے ہیں کہ جمشید بادشاہ کے حکماء نے اُس کے لیے ایک جام تیار کیا تھا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اُس کے توسط سے جمشید اپنے محل میں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا کے حالات سے واقف ہو جاتا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ پیالہ جس کے ذریعے جمشید کو دنیا بھر کے حالات معلوم ہو جاتے تھے خود جمشید کے بارے میں جمشید کو کچھ نہ بتا سکا ۔ اقبال کہتے ہیں کہ بھلا ایسے پیالے سے جمشید کو کیا فائدہ پہنچا ۔ لطف تو جب تھا کہ یہ پیالہ جمشید کو بھی اُس کی حقیقت اور انجام سے خبردار کرتا یہی کیفیت ہماری آنکھوں کی بھی ہے ۔ اگر یہ صرف احوالِ عالم دکھاتی ہیں تو بے فائدہ ہیں ۔ ان کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ خود ہماری اپنی حالت بھی سامنے آجائے اور ہم صورتحال سے سبق حاصل کریں ۔

علامہ کہتے ہیں کہ اگر فرقہ بندی کو ایک درخت تصور کیا جائے تو تعصب یعنی فرقہ وارانہ نفرت اس درخت کا پھل یعنی لازمی نتیجہ اور حاصل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم فرقہ وارانہ مباحث میں الجھیں گے تو لازمی طور پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے ۔ باہمی اخوت و محبت کے مقابلے میں نفرت وہ چیز ہے جو بالآخر انسان کو جنت سے نکال کر جہنم رسید کرنے کا سبب بنتی ہے ۔ یعنی انسان کے اچھے حالات بدترین حالات میں بدل جاتے ہیں اور انسان ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتا ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اِسی طرح کے تعصب کے باعث لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے ۔ لاکھوں بچے یتیم ہوئے اور ہزاروں گھر اُجڑ گئے ۔ یہ حالات اقبال کے نقطہ نظر

کی تائید کرتے ہیں۔ آج بھی ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ واریت، علاقائی و قومی تعصبات اور ذات و برادری کے جھگڑوں کے باعث پیدا ہونے والی منافرت ہے۔

اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خارجی حالات کچھ بھی ہوں، انسان کی حقیقی ترقی کا راز اُس کی اپنی تمناؤں خواہشوں، آرزوؤں اور ان کو پورا کرنے کی کوشش و کاوش میں مضمر ہے۔ مثلاً دیکھئے کہ اگر خورشید کی کشش و حرارت ہی سب کچھ ہوتی تو اس کے باعث گلستان میں سے پھولوں کی پتیاں بھی آسمان کی طرف پرواز کر جاتیں لیکن یہ جوں کی توں زمین کی پستی سے ہمکنار رہتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں شبنم کے قطروں کو بلند پروازی کی خواہش اڑائے جاتی ہے۔ اسی طرح اگر اہل ہند بھی اپنے مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں اور اپنی منزل کو پانے کی تگ و دو کریں تو لازماً خارجی حالات ان کی مساعدت کریں گے۔

اقبال کہتے ہیں کہ محبت کے زخمی اپنے زخموں کے علاج معالجے کے لیے کسی کاوش و جستجو میں نہیں پڑا کرتے۔ محبت ان کے دلوں میں جو زخم لگاتی ہے یہ اُس کے علاج کے لیے بے تاب و بے چین نہیں ہوتے۔ البتہ جدوجہد اور قربانیوں سے ان کے زخموں کا علاج خود بخود ہو جایا کرتا ہے اور ان کے زخموں کی تسکین ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص کو اپنے مقصد سے محبت ہو گی تو وہ مقصد کو پانے کی جدوجہد کرے گا اور اس جدوجہد کے نتیجے میں اپنے مقصد کو حاصل کر لے گا۔ یہی کامیابی اس کے زخموں کا مرہم ثابت ہو گی اور اُس کے لئے وجہ تسکین بن جائیگی۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ محبت وہ چیز ہے جو بظاہر چنگاری کی طرح معمولی اور حقیر ہے۔ لیکن یہی چنگاری ہے جو ساری دنیا کو منور کر دیتی ہے۔ محبت ایک ایسا بیج ہے جو دل کی سرزمین میں کاشت کر دیا جائے تو اس سے کوہ طور کے عظیم باغات پیدا ہو جاتے ہیں جہاں حضرت موسیٰ کو اللہ تعالےٰ کا دیدار میسر آیا تھا۔ یعنی اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ محبت کی وجہ سے انسانی دل انوار باری تعالےٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے۔

۵ دوا ہر دُکھ کی ہے مجروحِ تیغ آرزو رہنا ـ ـ ـ

حل لغات

مجروحِ تیغ آرزو: تمناؤں کی تلوار کا زخمی مراد عاشق ۔ احسانِ رفو: سلوانے کی منّت، علاج معالجے کی منت ۔ شکستِ رنگ: رنگ اُڑنا، ظاہری امتیازات سے کنارہ کشی ۔ اسیرِ امتیازِ ما و تو: اپنوں کو عزیز اور دوسروں کو دشمن سمجھنا ۔ **استغنا**: بے نیازی، بے پروائی ۔ **نگوں**: اُلٹا، اوندھا ۔ **حباب آبجو**: ندی کا بلبلہ ۔ بیگانہ خو: منافرت کا عادی ۔ بختِ خفتہ: سوئی ہوئی قسمت۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ عشق و محبت سے دنیا کی ہر تکلیف اور ہر دُکھ کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اگر تم اپنی تکالیف کا علاج چاہتے ہو تو تمھیں چاہیئے کہ اپنے لیئے مقاصد تخلیق کرو اور پھر اُن کے حصول کے لیے جدوجہد میں لگ جاؤ۔ زخم کا علاج یہ نہیں ہے کہ اسے سی لیا جائے بلکہ حقیقی علاج یہ ہے کہ اِس کو سلوانے کا احسان ہی نہ اُٹھایا جائے۔ انسانی جسم کے زخم سلوانے اور رفو کرانے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ وہ زخم جو محبت کی وجہ سے دل پر لگتے ہیں، رفو سے ٹھیک نہیں ہوتے۔

بے خودی کی شراب پی کر یعنی رنگ ونسل اور فرقہ وارانہ تعصبات و منافرت سے پاک ہو کر میں نے مراتب و مناصب کے اعتبار سے آسمان کی بلندیوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ میں نے یہ گُر پھولوں سے سیکھا ہے جن کا رنگ، جو بظاہر انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے، اُڑ جاتا ہے لیکن اُن کی خوشبو جس کی بظاہر کوئی شناخت نہیں ہوتی، آخر وقت تک قائم رہتی ہے۔ اس چیز نے مجھے یہ بتایا ہے کہ ظاہری امتیازات ختم ہو جاتے ہیں اِس لیے کہ وہ پائیدار نہیں ہوتے۔ اس کے مقابلے میں وہ جذبے جو پوری نوعِ انسانی کے لئے ہوں انمٹ ہوتے ہیں۔

شاعر کی آنکھ جو قوم و وطن کے دُکھ درد پر آنسو بہاتی ہے، اپنا رونا ختم نہیں کر سکتی اِس لیے کہ پُرنم رہنا اس کے نزدیک عبادت ہوتا ہے۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ شاعر نے عبادت اور وضو ایک ساتھ لا کر مصرع میں دلکشی پیدا کر دی۔ اقبال کہتے ہیں کہ قوم کے مصائب پر رونے والی آنکھ گویا اصل عبادت کرتی ہے اور جس کے لئے انسان عبادت کرنا اور اپنے معبود کی بندگی بجا لانا فرض ہے اسی طرح چشمِ شاعر کے لئے رونا اور قوم کے دکھوں میں شامل ہو کر آنسو بہانا فرض ہے۔ یعنی اگر وہ نہیں روئے گی تو اپنے فرائض سے کوتاہی کرے گی۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان کو اپنا وطن قرار دیں اور اِس میں اپنا گھر بنائیں تو کس بھروسے پر اور کس اُمید پر۔ اِس لیئے کہ اس وطن میں رہنے کا کیا فائدہ جہاں انسان ذلیل و خوار اور بے آبرو ہو کر رہے۔ تذلیل و بے آبروئی اس لئے کہ اوّل اہلِ ہند غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے دوم یہ کہ انھیں اپنی غلامی کا احساس بھی نہیں تھا اور وہ اپنی اسی تذلیل پر قانع تھے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر تُو غور کرے تو تجھے معلوم ہوگا کہ آزادی محبت میں مضمر ہے اور تفریق و تفرقہ میں مبتلا رہنے کا دوسرا نام غلامی ہے۔ اِس شعر کی ایک معنویت تو یہ ہے کہ اگر اہلِ ہند باہمی محبت و اخوت کے جذبے سے کام لیں اور تفرقہ بازی چھوڑ دیں تو وہ آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر

آپس کے جھگڑے انھیں ہمیشہ غلام بنے رہنے پر مجبور رکھیں گے۔ ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس دور کے ہندوستان کے انگریز آقاؤں کا دستورِ حکومت بھی یہی تھا۔ انھوں نے ہمیشہ محکوم قوتوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا اور اپنی حاکمیت کو طول دینے کی کوشش کی۔ اگر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں نظام دکن، ٹیپو سلطان، مرہٹے، سلاطین اودھ و دہلی، سکھ اور سید احمد شہید کے پیروکار آپس میں دست و گریباں نہ ہوتے تو انگریز شاہی ہندوستان میں اپنے قدم نہیں جما سکتی تھی۔ اسی طرح اگر بیسویں صدی کے ہندوستانی فرقہ واری تنازعات میں الجھنے کی بجائے ایک دوسرے کے حقوق تسلیم کرتے ہوئے اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کرتے تو انگریزوں کی بساط 1947ء سے بہت پہلے لپیٹ دی جاتی۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ذرا ایک بلبلے کی زندگی پر نظر کرو۔ وہ ندی میں رہتا ہے اس کے باوجود اپنے پیالے کو الٹا اور اوندھا رکھتا ہے۔ یعنی ندی کے سامنے پانی کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور اپنے لئے کچھ مانگنے کی سعی نہیں کرتا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اِس میں بے نیازی اور بے پروائی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے اہل ہند تمھیں بھی بلبلے کی طرح شانِ بے نیازی کا اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اگر تم اپنی ذاتی اغراض اور فرقہ دارانہ مفادات کو پسِ پشت ڈال کر ایک قوم اور جماعت کی حیثیت سے کوشش میں لگ جاؤ تو تمھاری کوشش اور جدوجہد ضرور رنگ لائے گی۔ لیکن اگر تم نے بلبلے کے برعکس اپنے اپنے ساغر پھیلا کر بھیک مانگنی شروع کر دی تو نتیجہ تمھارے حق میں اچھا نہ نکلے گا۔ اقبال ایک اور جگہ اسی خیال کو یوں پیش کرتے ہیں۔

تو اگر خود دار ہے منتِ کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے بے نیازی کا رویہ اختیار کرنے کے باوجود اہل وطن کو ایک دوسرے سے بے نیاز اور بے پروا نہیں ہونا چاہیئے۔ دراصل یہ بے پروائی اور بے نیازی دوسروں کو کمزور اور حقیر سمجھنے کے سبب سے ہوتی ہے اور یوں آپس میں نفرت کی خلیجیں بڑھتی ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے ایک دوسرے سے الگ الگ اور بے پروا رہنے والے اہل ہند، اگر تم اِس دنیا میں زیادہ عرصہ تک رہنا چاہتے ہو اور بحیثیت قوم تاریخ عالم میں اپنے نقوش ثبت کرنے کے خواہاں ہو تو آپس میں بے پروائی اور بے نیازی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ اس لیے کہ تمھارے لئے نیک اور باسعادت راستہ یہی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ تفریق و تفرقہ اور امتیازات کے بغیر تمام انسانوں کی محبت ایسی شراب

ہے جو ہماری روح کی پرورش کرتی اور روح کی قوتوں کو جلا بخشتی ہے۔ محبت میں ایسا سرور ہے جس کے باعث ساغر و مینا کا احسان اٹھائے بغیر سرمست و سرشار رہتا ہوں۔ عام شراب کے لیے تو جام و ساغر ضروری ہیں لیکن انسانوں کی شرابِ محبت پینے کے لیے انسان کو ان ظاہری وسیلوں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر کمزور اور نحیف قومیں تھیں انھوں نے محبت ہی کے باعث اپنی کمزوریوں اور بیماریوں سے نجات حاصل کی۔ محبت کی وجہ سے نہ صرف ان قوموں کے امراض دور ہو گئے بلکہ ان کے سوتے ہوئے نصیب بھی جاگ پڑے۔ اقبال کے اِس دعوے کی تائید کے لئے یوں تو بہت سی قوموں کی تاریخ کو بطور مثال و ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اِس سلسلے کی ایک نمایاں ترین مثال صحرانشیں بدوؤں کی ہے۔ یہ لوگ جب تک پانی پینے پلانے اور گھوڑے آگے بڑھانے جیسے معمولی مسائل پر لڑتے رہے اُس وقت تک قابلِ توجہ بھی نہ تھے لیکن جب ان میں اصولِ مواخات قائم ہوا اور انھوں نے باہمی محبت و اخوت اختیار کی تو تاجِ سرِدارا تک ان کے قدموں میں آ گیا۔

۵ بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے ۔۔۔

حلِ لغات

دشتِ غربت : مسافرت کا صحرا، پردیس کی مشکلات ؛ گردشِ چرخِ کہن : بوڑھے آسمان کا چکر مراد تقدیر، قسمت ؛ بے ستوں : ایران کے ایک پہاڑ کا نام ؛ روایت کے مطابق خسرو کے کہنے پر فرہاد نے شیریں کے حصول کے لیے اسی پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر بنائی تھی ؛ سکوت آموز : خاموشی سکھانے والی، خاموش رہنے پر مجبور کرنے والی ؛ تابِ سخن : بات کرنے کی قوت و صلاحیت ؛

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس دنیا میں سب کچھ محبت ہی ہے اور سارا کاروبارِ حیات اسی کی وجہ سے ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر محبت کو صحرا کہا جائے تو یہ بھی درست ہے یعنی اِس میں انسان کو سختیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن یہی محبت وطن کی حیثیت بھی رکھتی ہے یعنی انسان کے لیے سکھ اور اطمینان و راحت کا سبب بھی ہے۔ اگر محبت کو ویرانہ کہا جائے تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن یہی محبت قفس، آشیانے اور چمن کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے انسان وطن میں بھی ذلیل و خوار ہو سکتا ہے اور دشتِ غربت یعنی پردیس میں بھی عزت افزائی کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔ محبت کی وجہ سے وہ اپنے چمن کو چھوڑ کر نکل سکتا ہے اور محبت ہی کے باعث

قفس کو اپنے چمن اور آشیاں کا بدل تصور کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں بے شمار لوگوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جنھوں نے اپنے مقصد سے محبت کی بنا پر وطن چھوڑا، پردیس میں ہنسی خوشی زندگی گذاری۔ قید کاٹی اور گھر بار، عزیز واقارب اور وطن سے دور رہے۔

اقبال کے نزدیک محبت وہ شے ہے جو انسان کی منزل بھی بن سکتی ہے اور راس کے بھٹکنے کے لیے صحرا بھی قرار پا سکتی ہے۔ محبت وہ گھنٹی بھی ہے جو اپنی آواز سے اہلِ قافلہ کو سفر کیلئے تیار کرتی ہے۔۔ یہی محبت قافلہ بھی ہے اور وہ شخص بھی جو قافلے کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ محبت ہی وہ انسان ہے جو اس قافلے کو لوٹ لیتا ہے۔ یعنی محبت ہر بھیس اور ہر پردے میں ظاہر ہو سکتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ محبت کو مرض کہا جاتا ہے۔ بالفرض یہ بات درست بھی ہو تو بھی محبت ایسا مرض ہے جو دنیا کے ہر غم کا علاج کرتا ہے اور ان خرابیوں کو دور کر دیتا ہے جو تقدیر اور قسمت کی وجہ سے انسان کا مقدر ہو جاتی ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ بیشک محبت میں دل جلتا ہے یعنی انسان کو قدرے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے سبب سے انسان کا دل منور بھی ہو جاتا ہے اور اگر دل، جسے شاعر نے تڑپ، بیتابی اور میلانِ حسن رکھنے کے باعث پروانہ کہا ہے، جل جائے تو محفل میں روشنی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے یعنی محبت میں دل کا جلنا بیکار نہیں جاتا بلکہ انسان ان معمولی تکالیف کو برداشت کرلے تو وہ اہلِ عِلم کے لیے زیادہ مفید و نافع بن جاتا ہے۔

علامہ کہتے ہیں محبت ایسا حسن ہے جو ہر شے میں نظر آتا ہے۔ اور دنیا کی ہر چیز میں اس کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بظاہر شیریں، فرہاد اور کوہِ بے ستوں میں بڑا فرق ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب محبت ہی کے مختلف روپ ہیں۔

افتراق و نفاق نے قوموں کو برباد کیا ہے۔ میرے اہل وطن بھی اسی افتراق اور نفاق کا شکار ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں وطن کے لئے بھی کوئی جذبہ ہے؟ کیا یہ وطن کے بارے میں بھی سوچتے ہیں اور اس کے اچھے بُرے سے بھی ان کا کوئی تعلق ہے؟ اس شعر میں شاعر نے استفہام انکاری کی صورت پیدا کی ہے۔ یعنی سوال اس انداز میں پوچھا ہے کہ خود سوال ہی میں جواب پوشیدہ ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اہل ہند کو اپنے وطن کی کوئی فکر نہیں۔ ہوتی تو یہ یوں گروہ درگروہ بٹے ہوتے نہ ہوتے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میری داستان بہت طویل ہے اور اس کی یہی طوالت مجھے خاموش رہنے

پر مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ زبان بھی رکھتا ہوں اور مجھ میں بات کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ یعنی صرف بات کی طوالت آڑے آ رہی ہے ورنہ میں وہ تمام وسائل رکھتا ہوں جو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔

اس بند کا آخری شعر فارسی زبان میں ہے۔ یہ شعر مشہور فارسی شاعر "نظیری" کا ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ مضمون کا سلسلہ مختصر نہیں ہوتا تھا اس لئے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ ایسا بیان تھا جس کی کوئی حد نہ تھی۔ لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی میرے خیالات کی وسعت میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی تاہم میں نے طوالت کے خوف سے بات کو یہیں ختم کر دیا۔

نالہ فراق

(۷۷)

تعارف جیسا کہ نظم کے عنوان سے ظاہر ہے یہ نظم علامہ اقبال نے اپنے استاد پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی یاد میں اس وقت لکھی جب وہ ۱۹۰۴ء میں لاہور سے انگلستان چلے گئے۔ پروفیسر ٹامس آرنلڈ پہلے علیگڑھ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے جہاں اور بہت سے طالب علموں کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی نے بھی (جو خود بھی علیگڑھ میں استاد تھے) ان سے استفادہ کیا۔ ۱۸۹۷ء میں ٹامس آرنلڈ علیگڑھ کالج سے گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے اور یہاں پر اوائل ۱۹۰۴ء تک فلسفہ پڑھاتے رہے۔ ۱۹۰۴ء میں انگلستان گئے تو انڈیا آفس لائبریری کے لائبریرین مقرر ہو گئے۔ بعد میں سکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا۔

پروفیسر ٹامس آرنلڈ نے یوں تو کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں لیکن Preaching of Islam زیادہ معروف ہے۔ جس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ علامہ اقبال پروفیسر ٹامس آرنلڈ سے بہت متاثر تھے۔ سر عبدالقادر کے مطابق انہی کے مشورے پر علامہ اقبال نے

شعر گوئی ترک کرنے کے فیصلے پر نظر ثانی کی۔

نالۂ فراق مئی ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظر ثانی میں تین بند قلمزد کر دیئے گئے جو باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ دونوں میں شامل ہیں۔

حل لغات

ضیائے روزِ فرقت: ہجر کے دن کی روشنی۔ **کشتۂ عزلت:** تنہائی کا مارا ہوا، تنہائی پسند کرنے والا۔ **سودا:** جنون، دیوانگی۔ **ایامِ سلف:** گذرے ہوئے دن۔ **عالم نما:** دنیا کو دکھانے والا، دنیا کو نمایاں کرنے والا۔ **کلیم ذروۂ سینائے علم:** علم کے پہاڑ کی چوٹی کا کلیم یعنی بہت بڑا عالم۔ **موجِ نفس:** سانس کی لہر مراد ذات، شخصیت۔ **بادِ نشاط افزائے علم:** علم کی مسرت بڑھانے والی ہوا۔ **دستِ وحشت:** جنون کا ہاتھ مراد سودا، دیوانگی۔ **عقدۂ تقدیر:** قسمت کی گتھی، قسمت کی پیدا کردہ مشکل۔ **گرویدۂ تقریر:** گفتگو کا عاشق۔

۵ جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں ۔۔۔۔

وضاحت

علامہ اقبال اپنے شہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھ میں رہنے والا آخرِ کار ہندوستان سے رخصت ہو کر مغرب یعنی یورپ میں اقامت گزیں ہو گیا۔ افسوس کی بات ہے کہ اُسے مشرق کی سرزمین پسند نہ آئی یعنی اُس نے یہاں رہنا قبول نہ کیا۔ پروفیسر ٹامس آرنلڈ کے چلے جانے کے بعد مجھے اِس حقیقت پر ایمان لانا پڑا کہ ہجر و جدائی کے دن کی روشنی بھی اپنی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے رات کے اندھیرے سے کسی طرح کم نہیں ہوتی یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں کچھ نہیں سوجھتا اِسی طرح ہجر کے صدمے کی وجہ سے حواس میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔

بند کے آخر میں علامہ اقبال نے ایک فارسی شعر تضمین کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ جب سے میری نظر نے محبوب کی جدائی سے حیرت کے داغ چُنے ہیں تب سے وہ (یعنی نظر) میری آنکھ میں بجھی ہوئی شمع کی طرح سو گئی ہے۔ (مراد یہ ہے کہ آرنلڈ کے چلے جانے سے میری آنکھ کی بینائی رخصت ہو گئی ہے)

۶ کُشتۂ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں ۔۔۔

وضاحت

میں تنہائی کو پسند کرتا ہوں اور شہر کی آبادیوں سے میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنون و دیوانگی کا زور بڑھتا ہے تو میں شہر سے نکل کر ویرانے میں پہنچ جاتا ہوں۔ ایسے میں میرا دل پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کو

یاد کر کے تڑپتا ہے اور اے پروفیسر ٹامس آرنلڈ کے مکان! میں سکون حاصل کرنے کے لیے تیری طرف دوڑا چلا آتا ہوں۔

اے مکان! گو تیرے درو دیوار سے میری آنکھ مانوس اور واقف ہے لیکن میرے چلنے کے انداز سے اجنبیت اور ناواقفیت ظاہر ہو رہی ہے۔ آنکھوں کو اُنس اس لیے ہے کہ پروفیسر ٹامس آرنلڈ کے زمانہ قیام میں شاعر وہاں جاتا رہا ہے اور اجنبیت اس لیے ہے کہ اُنس تو صرف ٹامس آرنلڈ کی وجہ سے تھا۔ اُن کے جانے کے بعد تو یہ مکان شاعر کے لیے اجنبی ہو چکا ہے۔

ے ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر میرے دل کو ایک ذرہ ناچیز قرار دیا جائے تو وہ پروفیسر آرنلڈ کے فیضانِ صحبت سے سورج کی طرح منور و عظیم ہونے والا تھا۔ اگر میرے دل کو ٹوٹا ہوا یعنی بیکار آئینہ کہا جائے تو پروفیسر صاحب کی مسلسل توجہ کے باعث یہ ٹوٹا ہوا آئینہ ایسی صلاحیت پیدا کرنے والا تھا جس کے بعد یہ ساری دنیا کی تصویر پیش کر سکتا اور یوں گویا میری خواہشوں کا سوکھا ہوا پودا سرسبز و شاداب ہونے والا تھا۔ علامہ اقبال اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی کو کیا معلوم ہے کہ میں کس قدر ادنیٰ مقام سے ترقی کر کے کتنے اعلیٰ مرتبے پر پہنچنے والا تھا۔ لیکن افسوس کہ پروفیسر صاحب چلے گئے اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

اس بند کا آخری شعر بھی فارسی زبان میں ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ سرسبز و شاداب کر دینے والے بادل نے میرے باغ سے کنارا کر لیا اور وہ چلا گیا۔ اِس بادل نے میری آرزو کی کلیوں کو تھوڑی دیر کے لیے سینچا اور پھر یہ بادل دور چلا گیا۔ اِس شعر میں پروفیسر صاحب کے فیضانِ عام کے باعث انھیں بادل سے تشبیہ دی گئی ہے اور استاد کے لیے یہ تشبیہ بہت خوبصورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے آرنلڈ کے علم سے ابھی بہت کم استفادہ کیا تھا کہ وہ تشریف لے گئے۔

ے تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم ۔ ۔ ۔

وضاحت اے علم کے کوہِ سینا کی چوٹی کے کلیم یعنی بہت ہی عالم و فاضل پروفیسر آرنلڈ اب تو کہاں ہے؟ جب تک تو یہاں تھا تو تیری گفتگو سے میرے علم میں اضافہ ہوتا رہتا تھا اور یہ اضافہ خوشی بڑھا دیتا تھا۔ تیری وجہ سے تلاش و جستجو میں بھی لطف آتا تھا لیکن اب تو چلا گیا تو تیرے بعد ہمیں بھی علم کے صحرا کو طے کرنے کا شوق نہیں رہا۔ تیری ہی وجہ سے ہمیں جنون کی حد تک علم حاصل کرنے کا شوق تھا، تو گیا ہے تو یہ جنون بھی ختم ہو گیا۔

اِس بند کا آخری شعر بھی فارسی زبان میں ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اب لیلیٰ کے حسن کا چرچا ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ مجنون و سودائی بن سکیں اور مجنوں کی خاکِ صحرا کے دل کا غبار بن سکے۔ مراد یہ ہے کہ یہ سب کچھ پروفیسر ٹامس آرنلڈ کی وجہ سے ہوتا تھا۔

۵ کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ آخرِ کار میرا جنوں مقدر کی پیدا کردہ مشکلات دور کر دے گا اور میں پنجاب کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے استاد کے پاس انگلستان پہنچ جاؤں گا۔ کمال یہ ہے کہ اقبال نے یہ شعر ۱۹۰۴ء میں کہا اور ہر طرح کی مشکلات پر قابو پاتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں انگلستان چلے گئے۔ بہرحال وہ کہتے ہیں کہ میری حیرت زدہ آنکھ تیری تصویر کو دیکھتی ہے۔ لیکن اِس طرح تجھے دیکھنے کے باوجود میری تسلّی نہیں ہوتی کہ میں تو تیری گفتگو کا مشتاق ہوں۔ تصویر کا منہ گفتگو کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ تصویر کی گفتگو تو اُس کی خاموشی ہی ہے۔

چاند

(۷۸)

تعارف نسیم امروہوی "فرہنگ اقبال" میں لکھتے ہیں کہ یہ نظم مئی ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی جبکہ مولانا غلام رسول مہر نے اس کا ماہِ اشاعت جولائی ۱۹۰۴ء بتایا ہے۔ مخزن میں "چاند" کے کل سترہ شعر شائع ہوئے تھے۔ نظرثانی میں چار شعر قلمزد کر دیئے گئے جو باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حلِ لُغات قصد: ارادہ۔ رنجِ رہ منزل: مسافت کی تکلیف۔ آفرینش: پیدائش، تخلیق۔ سیہ روزی: بدبختی۔ اشتیاقِ دید: دیکھنے کا شوق۔ منتِ خورشید: سورج کا احسان۔ فروزاں: روشن۔ سوزاں: جلتا ہوا۔ طلب خُو: مانگنے کا عادی۔ یکتا: بے مثال، منفرد۔ ذوقِ آگہی: جاننے کا شوق

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ـ ـ ـ

وضاحت اے چاند اگرچہ تو میری ویران دنیا سے بہت دور ہے ۔ اِس کے باوجود میرے دل کے دریا میں تیری کشش ہی کی وجہ سے موجیں اُٹھ رہی ہیں ۔ اِس شعر میں دل کو سمندر یا دریا قرار دینا اور چاند سے دل اور سمندر کے متاثر ہونے کا ذکر بہت خوبصورت ہے ۔

شاعر سوال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ کس محفل کی طرف جانے کا ہے اور تو کس بزم سے آیا ہے یا بہت زیادہ مسافت طے کرنے اور تھک جانے کے باعث تیرا چہرہ زرد ہو گیا ہے اور تُو کمزور ولاغر ہو گیا ہے ۔ واضح ہو کہ پہلی رات کا چاند زرد رو اور باریک ہوتا ہے ۔ شاعر نے اِسے چاند کی تھکاوٹ سے تعبیر کیا ۔

اقبال کہتے ہیں کہ پیدائش اور تخلیق کے اعتبار سے تو سر تا پا نور و روشنی ہے اور میں اندھیرا ہوں لیکن اس بدبختی کے باوجود میری اور تیری قسمت ایک جیسی ہے ۔ ہم دونوں جل رہے ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے محبوب کا دیدار کرنے کے شوق میں جل رہا ہوں اور تو سُورج کا احسان اٹھانے کی وجہ سے جل رہا ہے ۔

اگر تو ایک ہی دائرے اور ایک ہی راستے پر گامزن رہتا ہے تو میں بھی پرکار کی طرح اپنے راستے سے انحراف نہیں کر سکتا ۔

زندگی کے راستے میں تو بھی پریشان ہے اور میں بھی حیرت زدہ ہوں ۔ تُو اِس دنیا میں روشن ہے اور میں بھی جل رہا ہوں ۔ تو بھی منزل کی طرف جانے والے راستے پر سفر کر رہا ہے اور میں بھی سفر میں ہوں تُو بھی اپنا سفر خاموشی سے کر رہا ہے اور میرا دل بھی خاموش ہے ۔

تُو کسی کو چاہتا ہے اور اُس کی جستجو میں ہے تو میرا طریق بھی یہی ہے ۔ تو اپنی چاندنی کی وجہ سے منور ہے جبکہ میں عشق کے باعث منور ہوں ۔ جس دنیا میں میں رہتا ہوں وہاں میرے اردگرد انجمن آرائی کے لیے بہت سے انسان موجود ہیں لیکن جس طرح تو بہت سے ستاروں کے باوجود بے مثال ہے اسی طرح ان انسانوں میں میں بھی اکیلا اور تنہا ہوں ۔ سورج کا طلوع ہونا تیرے لیے موت کا پیغام ہے اسی طرح اللہ تعالٰے کے حسن کا جلوہ مجھے اپنے آپ سے غافل کر دیتا ہے ۔ لیکن اے چاند ان بہت سی مشترک خصوصیات کے باوجود تجھ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے ۔ جو پہلو درد سے آشنا ہو وہ تیری قسمت میں نہیں ہے ۔ اُس سے صرف میں واقف ہوں ۔ اگرچہ میں سر تا پا تاریکی اور تُو نور ہے اس کے باوجود تُو کچھ جاننے اور کچھ پانے کے ذوق سے کلیتاً محروم ہے ۔ تجھے یہ معلوم

نہیں ہے کہ تو کس لیے پیدا کیا گیا ہے جبکہ مجھے اپنے مقصد تخلیق کا علم ہے اور یہ وہ روشنی ہے جو تجھے نہیں ملی۔

بلالؓ

(۸۰)

تعارف نظم "بلال" ستمبر ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اس کے اشعار کی کل تعداد سولہ تھی۔ نظر ثانی میں تین شعر قلمزد کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔

حلِ لغات آستاں: دہلیز، چوکھٹ ۔ اداشناس: اداؤں اور خوبیوں کو پہچاننے والا ۔ ناشکیبا: بے صبر ۔ خندہ زن: ہنسی اڑانے والا ۔ ظلمت: سیاہی، حضرت بلالؓ کی سیاہ رنگت کی طرف اشارہ ہے ۔ دستِ موسےٰ: حضرت موسےٰؑ کا ہاتھ۔ اشارہ ہے حضرت موسےٰ کے معجزے کی طرف جس کی وجہ سے اُن کا ہاتھ سورج یا چاند کی طرح روشن نظر آتا تھا ۔ خوشا: اچھا، خوب ۔ یثرب: مدینہ منورہ کا پہلا نام۔

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا ۔ ۔ ۔

وضاحت حضرت علامہ اقبال نے آنحضرتؐ کے مشہور صحابی حضرتِ بلالؓ حبشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تیری قسمت نے یاوری کی اور تیری قسمت نے تجھے حبش سے حجاز پہنچا دیا۔

اِس شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید حضرت بلالؓ حبش سے حجاز آئے تھے جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ بلالؓ حبشی مکہ معظمہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ البتہ ان کے آباء واجداد حبش سے تعلق رکھتے تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مکہ آنے اور اسلام قبول کرنے ہی کی وجہ سے تیری زندگی میں رونق آئی اور اس طرح دیکھا جائے تو تیری غلامی بھی اس قدر مبارک ثابت ہوئی کہ اُس پر ہزاروں آزادیوں کو بھی قربان کیا جا سکتا ہے۔ اے بلالؓ! اسلام قبول کرنے کے بعد بھی تو نے آنحضرتؐ کی چوکھٹ کو نہیں چھوڑا اور اس سلسلے میں اہل مکہ نے تجھ پر جو بھی ظلم وستم ڈھائے تو نے وہ سب شکایت کئے بغیر برداشت کئے۔

دراصل عشق کے مراحل میں انسان کو جو سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں انھیں سختیاں نہیں کہنا چاہئیے۔ اور جس محبت کے نتیجے میں انسان پر کسی نہ کسی طرح کے مصائب نازل نہ ہوں۔ اس محبت میں کوئی لطف نہیں۔

۵ نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تیری ۔ ۔ ۔

وضاحت حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح تیری نظر بھی محبت وعشق کی تمام اداؤں اور خوبیوں کو پہچانتی تھی اور تو جس قدر آنحضرتؐ کی زیارت کرتا تھا اُسی قدر اُن کے دیدار کا شوق بڑھتا تھا۔ واضح رہے کہ حضرت سلمان فارسی بھی ایران سے مدینہ منورہ پہنچے تھے اور حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے اور حضورؐ کے نادیدہ عاشق تھے۔

اے بلالؓ! تجھے رحمت دوعالمؐ کی زیارت کا اُسی قدر شوق تھا جس قدر حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھنے کا اشتیاق تھا جبکہ حضرت اویس قرنیؓ جیسے عاشق رسول آنحضرتؐ کی زیارت کی تاب نہیں لاسکتے تھے۔ مدینہ کو تیری نگاہوں کا نور قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی جس طرح نور آنکھوں میں موجود رہتا ہے اسی طرح تیری آنکھوں میں ہمہ وقت مدینہ بسا رہتا تھا اور یوں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ گویا تیرے لیے عرب کے یہی صحرا کوہِ طور کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگرچہ تو آنحضرتؐ کے قریب ہونے کی وجہ سے ہر وقت اُن کی زیارت کرتا تھا، اس کے باوجود زیادہ سے زیادہ دیدار کرنے کے شوق میں مبتلا رہتا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ وہ دل خوش قسمت ہے جو عشق رسول میں تڑپتا رہا اور جس کو عشق کے باعث کبھی آرام میسر نہ آسکا۔ تیری بے صبر جان پر ایسی تجلی گری اور اس نے تیرے دل وجان کو اس طرح منور کیا کہ تیرے جسم کی سیاہ رنگت حضرتِ موسیٰؑ کے یدِ بیضا پر ہنستی تھی۔ تیرا دل ایسا تھا جیسے شعلے کی حرارت اس میں بھر دی گئی ہو۔ جلوۂ رسول کی بجلی نے تجھے جلا کر خاکستر کر دیا اور یوں تجھے زیادہ قیمتی اور گراں مایہ بنا دیا۔

۵ ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری ۔ ۔ ۔

وضاحت آنحضرتؐ کی زیارت کرنے کا تیرا انداز سراسر عاجزی وانکساری پر مبنی تھا گویا آنحضرتؐ کو دیکھتے رہنا اور اُن کی زیارت کر لینا ہی تیرے لئے نماز کے برابر تھا۔ جب سے کائنات پیدا ہوئی ہے اذان کو اُس وقت سے تیرے عشق کو ظاہر کرنے والے ترانے کی حیثیت حاصل تھی اور نماز کو آنحضرتؐ کی زیارت کا بہانہ بنا دیا گیا۔ پہلے مصرع میں حضرت بلالؓ کی مؤذنِ اوّل کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے اُن کی اذان کی تاثیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے بلالؓ وہ وقت کتنا اچھا تھا جب تُو مدینہ منورہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ رہتا تھا۔ اور وہ دور اور زمانہ بھی کس قدر خوبصورت تھا جب لوگوں کے لئے آنحضرتؐ کی زیارت کے مواقع عام تھے۔

سرگزشتِ آدم

(۸۱)

تعارف یہ نظم پہلی بار بطور غزل ستمبر ۱۹۰۴ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں نہ صرف اس غزل کو عنوان دیکر نظم بنا دیا گیا بلکہ اس کے کچھ شعر بھی قلمزد کر دیئے گئے۔ اشعار کی تعداد نسیم امروہوی اور مولانا غلام رسول مہر کے مطابق دس ہے لیکن مولانا مہر نے سرودِ رفتہ میں قلمزد اشعار کے ضمن میں جو شعر درج کئے ہیں، اُن میں سے ایک شعر بانگِ درا میں بھی شامل ہے۔

سرگزشتِ آدم علامہ اقبال کے شاعرانہ کمال کی مظہر ہے۔ ہر شاعر اِس طرح کی نظمیں نہیں لکھ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کی عام معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہو۔ وہ انسانی تہذیب و معاشرت کے تمام ارتقائی مراحل سے واقف ہو اور اُسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر مکمل قدرت بھی حاصل ہو۔

حلِ لغات غربت: مسافرت، پردیس، وطن سے دوری۔ پیمانِ اوّلیں: پہلا عہد۔ یہ اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں آتا ہے کہ انسان نے اپنی تخلیق کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار و اعتراف کیا تھا۔ انسان سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب انسانوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ بیشک۔ ریاض: باغ۔ شعور: عقل و دانش۔ جامِ آتشیں: انتہائی تیز و تند شراب کا پیالہ۔ اوج: بلندی۔ خیالِ فلک نشیں: آسمان تک پہنچنے والا تخیل، مراد بلندیٔ خیال۔ ذوقِ تکلم: گفتگو کا شوق۔ صلیب: پھانسی۔ سرودِ ربانی: خدا کا نغمہ۔ ہویدا: ظاہر۔ تہ نگیں: زیر فرماں، غلام، فرمانبردار۔ مظاہر پرست: ظاہری اشیاء کی پرستش کرنے والا۔

؎ سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے ۔ ۔ ۔

وضاحت شاعر کہتا ہے کہ کاش کوئی میری یعنی انسان کی مسافرت اور اپنے حقیقی وطن سے دوری کی کہانی سنے۔ دوسرے مصرعے سے کہانی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

جب میں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار داعتراف کیا تھا۔ جب میری عقل و دانش نے مجھے میری حقیقی اہمیت سے آگاہ کیا تو میرا دل جنت کے باغ سے اکتا گیا۔ اور میں نے جنت کو خیر باد کہہ دیا دنیا میں آکر مجھے یہاں کے اسرار و رموز جاننے کا شوق ہوا اور اس سلسلے میں میرے انتہائی بلند پرواز تخیل نے اپنی اونچی اڑان کا مظاہرہ کیا۔ مجھے ایسا مزاج اور طبیعت ملی جو کسی حالت پر قناعت نہیں کرتی۔ اور اس وجہ سے جنت میں بھی میرا دل نہ لگا تھا۔ لہٰذا دنیا میں بھی میں نے کسی ایک جگہ رہنا پسند نہ کیا اور اس سفر میں مختلف مراحل سے دوچار ہوا۔ مثلاً کبھی میں نے حضرت ابراہیمؑ کی صورت میں جلوہ گر ہو کر کعبے کو بتوں سے پاک کیا اور کبھی آذر بن کر عبادت گاہوں میں بت پہنچا دیئے۔ کبھی میں خدا سے گفتگو کرنے کے شوق میں طور کے پہاڑ پر پہنچا اور کبھی میں نے اپنی آستین میں اللہ تعالےٰ کے نور کو چھپایا۔ یہ دونوں اشارے حضرت موسےٰؑ کی طرف ہیں۔ حضرت موسیٰؑ ہی کوہِ طور پر پہنچے تھے اور ید بیضا کا معجزہ بھی انہی کو حاصل تھا۔ کبھی مجھے میرے اپنے عزیز و اقربا یعنی انسانوں نے سولی پر لٹکا دیا اور مجھے زمین چھوڑ کر آسمان پر مقیم ہونا پڑا۔ اس شعر میں حضرت عیسےٰؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ کبھی انسان طویل مدت تک دنیا اور اہل دنیا سے قطع تعلق کر کے غارِ حرا میں مصروفِ عبادت رہا اور وہاں سے باہر نکلا تو لوگوں کے لیے ایسا دین لایا جو زمین پر بسنے والوں کے لیے خدا کی طرف سے آخری دین کی حیثیت رکھتا ہے (اس شعر میں آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے اور جام آخریں سے آنحضورؐ پر نبوت کا سلسلے کے خاتمے کا ذکر کیا گیا ہے) انسان نے کبھی ہندوستان میں اللہ تعالیٰ کا نغمہ اور پیغام سنایا اور کبھی اپنے لئے یونان کی سرزمین کو پسند کیا۔ (پہلے مصرع میں سری کرشن اور دوسرے مصرع میں غالباً سقراط کا ذکر کیا گیا ہے۔) جب ہندوستان کے باسیوں نے میرے پیغام پر توجہ نہ دی تو میں جاپان و چین کے ممالک کی طرف ہجرت کر گیا (یہ اشارہ گوتم بدھ اور بدھ مت کی طرف ہے۔ گوتم بدھ پیدا تو ہندوستان میں ہوئے تھے لیکن آج ان کے پیروکار ہندوستان کی بجائے جاپان، چین اور ان کے ملحقہ ممالک میں ملتے ہیں۔)

اقبال کہتے ہیں کہ کبھی انسان نے سائنسدان کی حیثیت سے غور و فکر کرتے ہوئے مذہب کے ماننے والوں کے خلاف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا اور خود انسانی زندگی محض ذرات کے مناسب و موزوں امتزاج سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ اس میں روح وغیرہ کا کوئی دخل نہیں۔ یہ اشارہ ۔۔ بہ قبل مسیح میں پیدا ہونے والے ایک مشہور سائنسداں کی طرف ہے جس کا نام دیمقراطیس تھا اور جس نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ دیمقراطیس کا یہی خیال ایک شعر میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب

موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)

کبھی انسان نے کائنات میں عقل و منطق اور دین میں سے کسی ایک کی برتری منوانے کیلئے جنگ و جدال کی اور ہزاروں لوگوں کے تہ تیغ ہونے کے باعث سینکڑوں شہر اور بہت سے ملک خون سے سرخ ہو گئے۔ دیہ اشارہ انسانی تاریخ کے اُن بہت سے واقعات اور ادوار کی طرف ہو سکتا ہے جن میں مذہبی روایات اور تعقل پرستی میں تصادم ہوا اور سینکڑوں اِسی کشمکش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ کا دور اور رومن کیتھولک عیسائیوں اور اِس عہد کے فلسفیوں کے درمیان جنگ و جدل وغیرہ یعنی تحریک احیائے علوم

اقبال غالباً گلیلیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان نے زمین کے مظاہر کے ساتھ ساتھ ستاروں کے بارے میں بھی غور و فکر کیا اور اپنی زندگی کی بیشمار راتیں انہی کو دیکھتے ہوئے گذار دیں۔ یہ بات پر لطف اس لئے ہے کہ اِس میدان میں انسان کی کاوش اور جد وجہد کو واضح کیا گیا ہے اور اِس لیے بھی کہ ستارے بہرحال رات کو نظر آسکتے ہیں۔

غالباً سبھی مذاہب میں زمین کے ساکن ہونے کا ذکر آیا ہے لیکن انسان نے اپنے تجسس اور جستجو سے یہ بات معلوم کی کہ زمین ساکن نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بر سرِ عام کہنا اس لئے دشوار تھا کہ مذاہب کے پیرو اِس نظریے کے شدید مخالف تھے لیکن اِس مخالفت کے باوجود یہ مسئلہ لوگوں کے سامنے لایا گیا۔ یہ اشارہ ہے مشہور سائنس داں کاپرنیکس کی طرف جس نے مسئلہ حرکت و گردشِ زمیں پیش کیا۔ پادریوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ بظاہر اپنے نظریے سے دستکش ہو گیا مگر اس نے تحقیق جاری رکھی۔

انسان نے بہت دور تک دیکھنے اور غور و فکر کرنے والی عقل کے ذریعے یہ بھید پایا کہ آخر فضا میں چھوڑی جانے والی چیزیں اوپر کی طرف یا ادھر ادھر جانے اور فضا ہی میں معلق رہنے کی بجائے زمین

پر ہی کیوں گرتی ہیں۔ عقل نے بتایا کہ ضرور زمین ہی ان اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اِس شعر میں نیوٹن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس نے یہ نظریہ نہ صرف پیش کیا تھا بلکہ تجربات سے ثابت بھی کیا تھا۔ کبھی انسان نے شعاعوں کو اسیر کیا اور کبھی بے چین و بے تاب بجلی کو اپنا قیدی بنایا اور اِس طرح اس دنیا کو جنت سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ اِس شعر کے پہلے مصرع میں دو سائنسدانوں ڈاکٹر رونٹجن اور ڈاکٹر فریڈے کی طرف اشارہ ہے۔ رونٹجن نے ایکسریز کو دریافت کیا تھا اور فریڈے نے بجلی کو تاروں میں مقید کر کے انسانی خدمت کے لیے استعمال کرنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان نے یہ سب کچھ کیا اور عقل سے ساری دنیا کو اپنا غلام بنا لیا، اِس کے باوجود اسے زندگی کے حقیقی رازوں کی خبر نہ مل سکی۔ لیکن جب ظاہری چیزوں کی پوجا کرنے والی آنکھ میں حقائق معلوم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور اِس نے دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ زندگی کا راز اور حسنِ ازل اُس کے اپنے دل ہی میں ہے۔

ترانۂ ہندی

(۸۳)

تعارف یہ نظم نسیم امروہوی اور یوسف سلیم چشتی کے مطابق پہلی بار ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کے رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہوئی۔ اِس کے بعد اکتوبر ۱۹۰۴ء میں اسے سر عبدالقادر نے اپنے ایک نوٹ کے ساتھ ماہنامہ مخزن میں شائع کیا۔ نظر ثانی میں اِس کے صرف آخری مصرع میں ترمیم کی گئی۔

حل لغات غربت : مسافرت، پردیس ؛ پربت : پہاڑ ؛ سنتری : چوکیدار، پاسبان، پہرہ دینے والا ؛ گودی : آغوش، کنارا ؛ رشکِ جناں : جس پر جنت بھی رشک کرے ؛ رود : ندی، دریا ؛ بیر : دشمنی ؛ محرم : رازداں ؛

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال ایک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے اپنے وطن متحدہ ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا وطن ہندوستان ساری دنیا سے اچھا ہے۔ اگر

ہمیں بلبلیں فرض کیا جائے تو یہ ملک ہمارے لئے گلستاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعر کے لیے بلبل اور اسی بنا پر وطن کو گلشن قرار دینا بہت خوبصورت بات ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگر ہم پردیس میں ہوں تب بھی ہمارا دل اپنے ہی وطن میں اٹکا رہتا ہے اور ہم اسے یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے پردیس میں رہتے ہوتے بھی ہم اپنے زورِ تخیل سے وطن ہی میں رہتے ہیں۔ حضرت علامہ کوہ ہمالہ کا ذکر کرتے ہوتے کہتے ہیں کہ ہندوستان کے شمال میں واقع دنیا کا یہ سب سے اونچا پہاڑ، جو اپنی بلندی کی وجہ سے آسمان کا ہمسایہ قرار دیا جاسکتا ہے، ہمارا محافظ اور چوکیدار ہے۔ کوہ ہمالہ کے بارے میں یہ بات اس لئے کہی گئی کہ تاریخی اعتبار سے ہندوستان کے لیے ہمالہ نے یہی فرض انجام دیا اور شمال کی طرف سے اس کی بلندی نے کسی بیرونی حملہ آور کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یہی بات علامہ اقبال نے اپنی ایک اور نظم "ہمالہ" میں بھی کہی ہے۔

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ بے شمار ندیاں اور نہریں جن کے دم سے ہندوستان جنت سے بھی زیادہ خوبصورت ہے، کوہ ہمالہ کی گود میں کھیلتی، پلتی اور پرورش پاتی ہیں۔ یہ اِس لیے کہا گیا کہ میدانی علاقوں میں بہنے والے بڑے بڑے دریا بھی ابتدا میں پہاڑوں کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل ہی میں سامنے آتے ہیں اور انہی چھوٹی چھوٹی ندیوں سے بڑے بڑے دریا وجود میں آتے ہیں۔

علامہ اقبال ہندوؤں کے سب سے مقدس دریا گنگا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے گنگا کے پانی کیا تجھے اُن دنوں کا پتا ہے جب ہمارا قافلہ ترے کنارے آکر اترا تھا اور ہم نے پہلی بار ہندوستان میں بود و باش اختیار کی تھی۔ یہاں غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ اقبال کے آباء واجداد (آریا) برہمن تھے۔ وہ وسط ایشیا سے ہزاروں سال پہلے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔

اقبال کہتے ہیں کہ گو ہندوستان کے طول وعرض میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہیں اور بدقسمتی سے وہ ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ لیکن انھیں سوچنا چاہیئے کہ مذہب کا پیغام تو محبت ہے اور وہ ایک دوسرے سے نفرت اور دشمنی کرنا نہیں سکھاتا۔ مذہبی اختلافات کے باوجود ہمیں اس بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم سب ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ہمارا وطن

ہے۔ لہٰذا ہمیں اختلافات بُھلا کر وطن کی خدمت کرنی چاہیئے۔

دنیا کی تمام قدیم تہذیبیں مثلاً یونان، مصر اور روم کی تہذیبیں ختم ہو گئیں اور یہ ممالک جو ایک زمانے میں عظیم طاقتوں کی حیثیت رکھتے تھے، نابود ہو گئے لیکن ہندوستان اب تک قائم ہے، اور اسے زوال نہیں آیا اور اگر یہ ملک اور اس کی تہذیب ختم نہیں ہوئی تو ضرور اس میں کوئی بھید ہے، ورنہ گردشِ دوراں صدیوں سے ہماری دشمن چلی آ رہی ہے۔

اقبال دکھ کے سے انداز میں کہتے ہیں کہ ساری دنیا میں کوئی شخص ہمارا رازداں اور دوست نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ہمارے دکھوں کو سمجھتا ہے۔ یہاں غالباً اُن دکھوں کی طرف اشارہ ہے جو ہندوستان کی غلامی کی وجہ سے اہلِ ہند کا مقدر رہے۔

جُگنو

(۸۹)

تعارف یہ نظم دسمبر ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں دوسرے بند کا ایک شعر حذف کر دیا گیا تھا جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں شائع ہو گیا ہے۔

حل لغات کاشانہ: مکان، محل، قصر؛ سفیر: پیامبر، ایلچی؛ غربت: پردیس؛ تکمہ: ٹبن؛ حسنِ قدیم: اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے؛ خلوت: تنہائی۔ گہن: زمین اور چاند کی گردش کی وجہ سے چاند یا سورج کا پورے کا پورا یا ان کے کسی حصے کا تاریک ہو جانا؛ دلبری: محبوبیت؛ تپش: حرارت؛ مرغانِ بے زباں: زبان نہ رکھنے والے پرندے؛ آرسی: ایک طرح کا زیور جو ہاتھ کے انگوٹھے میں پہنا جاتا ہے اور جس میں آئینہ جڑا ہوتا ہے؛ مخفی: پوشیدہ؛

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ چمن کے محل یعنی چمن میں جگنو کی روشنی کا منظر دیکھنے سے یہ گمان گذرتا ہے کہ پھولوں کی محفل میں شمع جل رہی ہے۔ یا یہ کہ آسمان سے

سے کوئی ستارہ اڑ کر زمین پر آگیا ہے۔ یا پھر چاند کی کرنوں میں جان پڑ گئی ہے اور وہ زندہ ہو کر گلشن میں اڑتی پھرتی ہیں۔ یا یوں ہے کہ رات کے ملک میں دن کا ایلچی آیا ہے۔ دن میں تو ہر طرف روشنی ہونے کی وجہ سے اس کے چھوٹے سے وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن پردیس میں یعنی رات کی تاریکی میں یہ خوب چمک رہا ہے۔ جگنو کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ شاید چاند کے لباس کا کوئی بٹن ٹوٹ کر گر گیا ہے اور وہی چمک رہا ہے۔ یا پھر کسی ذرے نے سورج کا لباس پہن لیا ہے یعنی کوئی ذرہ سورج کی طرح روشن ہو گیا ہے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کے حسن و زیبائی کا کوئی کرشمہ ہے جو پہلے چھپا ہوا تھا لیکن اب اسے تنہائی سے انجمن میں بھیج کر نمایاں کر دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر جگنو کو ایک چھوٹا سا چاند کہہ لیا جائے تو یہ ایسا چاند ہے جس میں روشنی اور تاریکی بیک وقت جمع ہے۔ جب اس پر تاریکی چھا جاتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے چاند گہنا گیا ہو اور جب یہ روشن ہوتا ہے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب گہن کی کیفیت ختم ہو گئی ہے۔

بند کے آخری شعر میں علامہ اقبال پروانے اور جگنو کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ دونوں ایک ہی طرح کے کیڑے ہیں۔ البتہ ان میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ پروانہ روشن نہیں ہے اور روشنی کی بھیک مانگتا پھرتا ہے جبکہ جگنو سر سے پاؤں تک روشنی کا بنا ہوا ہے۔ اس بند میں شاعر نے دیگر صنائع بدائع کے علاوہ تشبیہات کا کمال دکھایا ہے۔

۵ ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی ۔ ۔ ۔

وضاحت

اللہ تعالٰے نے دنیا میں جس قدر چیزیں پیدا کی ہیں اُن سب کو حسن اور خوبصورتی سے نوازا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پروانے کو یہ حسن حرارت کی صورت میں عطا کیا گیا ہے اور جگنو کو روشنی کی شکل میں۔ اسی طرح ان پرندوں کو جو بولنے کی صلاحیت سے محروم ہیں اور جنھیں عام طور پر بے زبان کہا جاتا ہے، دل موہ لینے والے انداز میں نغمے گانے کا انداز سکھایا ہے اور پرندوں کے مقابلے میں پھولوں کو پتیوں کی صورت میں زبان عطا کی لیکن انھیں خاموش رہنا بھی سکھا دیا ہے اقبال کہتے ہیں کہ شفق کا رنگ ہمیں اس لئے اچھا لگتا ہے کہ شفق بہت جلد ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اسی لیے قدرت نے اسے اعلیٰ درجہ حسن عطا کیا اور اس کی عمر بہت کم مقرر کی۔ اللہ نے صبح کے وقت کو دلہن کی طرح بناؤ سنگھار سے آراستہ کیا اور اسے لال جوڑا پہنا کر شبنم کی آرسی عطا کر دی تاکہ وہ اس میں اپنا حسن دیکھ کر خوش ہو۔ شبنم کی شفاف کیفیت کی وجہ سے اسے آرسی قرار دیا گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے درخت کو سائے کی دولت عطا کی جس کی وجہ سے لوگ اسے پسند کرتے ہیں

اسی طرح ہوا کو اڑنا سکھا دیا۔ پانی کو یہ خوبی دی کہ وہ بہتا رہتا ہے جبکہ پانی میں اٹھنے والی لہریں ہر وقت بے چین اور مضطرب رہتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ بظاہر ہر چیز جداگانہ خوبی کی مالک ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اختلاف و فرق محض ہمارے پیدا کردہ ہیں اور صرف ہماری نظر کا دھوکا ہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ چیزوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے مثلاً جگنو کے لئے وہی وقت دن کی حیثیت رکھتا ہے جسے ہم رات سے تعبیر کرتے ہیں۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اگر غور کریں تو پتا چلے گا کہ یہ چیزیں خود اللہ تعالےٰ کے حسن کی کرشمہ سازی ہے۔ فرق صرف اِس قدر ہے کہ انسان میں آکر یہ حسن گفتگو کا روپ دھار لیتا ہے اور غنچے میں چٹک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح چاند اور شاعر کے دل میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں حسنِ خداوندی کے نقیب ہیں۔ البتہ شاعر کے دل میں درد اور اِس کی چبھن اور ٹیس ہے اور چاند میں یہی چیز روشنی بن گئی ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم لوگوں نے معانی و مطالب کے اظہار کے لیے جو اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں انھوں نے ہمیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے ورنہ غور کیجئے تو بلبل کا نغمہ اس کی خوشبو ہے اور پھول کی خوشبو اس کا نغمہ ہے۔ گویا بلبل کے لیے نغمے کی وہی حیثیت ہے جو پھول کے لیے خوشبو کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی وحدانیت اور اس کا راز ایک ہی وقت میں مختلف چیزوں میں ظاہر ہو کر ہماری نظروں سے چھپ گیا ہے۔ ورنہ جو حقیقت جگنو میں چمک اور روشنی بن کر نمایاں ہوتی ہے وہی چیز پھول کی خوشبو کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ ان اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ وحدت الوجودی نظریات کی بنیاد و اساس ہے۔ اسی نظریے کے پیش نظر اقبال کہتے ہیں کہ جب ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہی کا نور اور اسی کا حسن چھپا ہوا ہے تو پھر ہم اختلافات اور تمیز و افتراق میں پڑ کر نئے نئے جھگڑے کیوں پیدا کریں۔

صبح کا ستارہ

(۸۵)

تعارف نسیم امروہوی کے نزدیک نظم "صبح کا ستارہ" فروری ۱۹۰۳ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی جبکہ سرودِ رفتہ اور مطالبِ بانگِ درا میں مولانا مہر لکھتے ہیں کہ یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں چھپی تھی اور غالباً یہی بات صحیح بھی ہے۔ بانگِ درا میں نظموں کی عمومی ترتیب سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ بانگِ درا کی اشاعت کے وقت نظرِ ثانی میں "صبح کا ستارہ" نظم کے دو شعر حذف کر دیئے گئے تھے جو باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

حلِ لغات صبوحی: صبح کو پی جانے والی شراب ، قعر: گہرائی ۔ پستی ، بانوئے قیصر: قیصر جیسے عظیم بادشاہ کی بیوی ، خاتم: انگوٹھی ، افشاں: مقیش یا گوٹے کی تاروں کی کترن جسے خواتین اپنے ماتھے پر چنتی ہیں ، دغا: جنگ ، تابِ شکیبائی: صبر کی طاقت ،

۵ لطفِ ہمسایگیِ شمس و قمر کو چھوڑوں - - -

وضاحت صبح کو طلوع ہونے والا ستارہ کہتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آسمان کی بلندیوں پر سورج اور چاند کے پڑوس کو چھوڑ دوں اور یہ جو میں اپنے طلوع ہونے سے صبح کا پیغام لانے کی خدمت بجالاتا ہوں اس سے بھی دست کش ہو جاؤں۔ میرے لئے ستاروں کی بستی اچھی نہیں ہے جس طرح کی بلندی پر میں رہتا ہوں اس سے تو زمین کی پستی بہتر ہے۔ میری حالت کے پیشِ نظر یہ کہنا مناسب ہے کہ میرا وطن آسمان نہیں بلکہ وہ مقام ہے جہاں موت کے بعد مرنے والے پہنچتے ہیں۔ صبح کا سینکڑوں جگہ سے پھٹا ہوا لباس میرا کفن ہے۔ یعنی صبح ہوتی ہے تو میری زندگی تمام ہو جاتی ہے کفن اور صبح کی سپیدی کی رعایت بہت عمدہ ہے۔

صبح کا ستارہ کہتا ہے کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میں ہر روز مروں اور رہ رہ کر پھر مجھے زندگی مل جائے اور پھر مجھے موت کا ساقی شراب پلائے یعنی میں موت سے پھر ہمکنار ہو جاؤں۔ ستارہ کہتا ہے کہ اس صورت حال میں نہ تو وہ خدمت مناسب ہے جو میرے سپرد کی گئی ہے اور نہ وہ عزت بہتر ہے جو مجھے حاصل ہے اور نہ آسمان کی بلندی پر رہنا میرے لیے مفید ہے بلکہ تھوڑی سی دیر کے لیے چمکنے سے تو تاریک

رہنا زیادہ اچھا ہے ستارہ کہتا ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ستارہ بننے کی بجائے سمندر کی گہرائی میں موتی بن کر رہنا پسند کرتا اور اگر سمندر کی گہرائی میں بھی موجوں کے جھکولوں سے میرا دل گھبراتا اور میں پریشان ہوتا تو سمندر سے نکل کر کسی کے گلے کی زینت بن جاتا۔ چمکنے کا حقیقی لطف تبھی ہے جب کسی حسین شخص کے زیور کی حیثیت حاصل ہو جائے اور کسی عظیم بادشاہ کی بیوی اور ملکہ کے سر کے تاج کی آرائش کا سامان بنا جائے۔ دیکھئے ایک پتھر کے ٹکڑے یعنی موتی کی قسمت جاگی تو وہ حضرت سلیمان کی انگوٹھی کا نگینہ بن گیا۔ لیکن ایسی چیزوں میں بھی ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ ایسی چیزیں جلد یا بدیر ٹوٹ کر اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ خواہ کتنا ہی قیمتی موتی ہو لیکن آخر کار وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی تو وہ ہے جو موت سے واقف نہ ہو۔ یعنی جسے موت نہ آئے۔ ایسا جینا کیا جینا ہے جس کی لازمی شرط موت زار یابی ہو۔ اگر دنیا کی آرائش کا سامان بن کر آخر کار ٹوٹنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ شبنم کا قطرہ بن کر کسی پھول پر گر پڑوں اور اسے تر و تازہ کر دوں۔

ع کس پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں رہوں ۔ ۔ ۔

وضاحت

زیادہ اچھی بات تو یہ ہے کہ میں کسی خاتون کے ماتھے پر چُنی ہوئی مقیش یا گوٹے کی کترن میں شامل ہو کر اس کے حسن کو دوبالا کرنے کے کام آؤں۔ یا پھر کسی مظلوم اور مجبور انسان کی آہ و زاری سے جو چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں اُن میں بس جاؤں۔ یا میں آنسو بن جاؤں اور پلکوں کے کناروں پر اٹک جاؤں اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میں آنسو بن کر اُس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک پڑوں جس کا شوہر اپنے وطن کی محبت سے مجبور ہو کر جنگ لڑنے کے لیے زرہ پہن کر میدانِ جنگ کی طرف جا رہا ہو اور شوہر کے رخصت کے وقت یہ بیوی امید و بیم کا شکار ہو اور اس کیفیت میں اُس کی خاموشی گفتگو سے بہتر طور پر اُس کے جذبوں کی ترجمانی کر رہی ہو۔ وہ شوہر کی رضا کی وجہ سے فرقت اور جدائی کے اِن لمحوں میں صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی ہو اور شرم و حیا کے باعث زبان کی بجائے اس کی آنکھیں اُس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہوں۔ اُس کا پھول جیسا خوبصورت چہرہ شوہر کے رخصت ہونے کے وقت غم و اندوہ کی شدت سے زرد ہو جائے اور اس طرح فرقت کے غم کے باعث اس کے حسن میں مزید اضافہ ہو جائے۔ یہ بیوی ضبط کی لاکھ کوشش کرے اس کے باوجود میں اس کی آنکھوں کے پیالے سے چھلک کر زمین پر ٹپک پڑوں اور عشق کی جلن کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاک میں مل جاؤں اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لوں۔

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

(۸۷)

تعارف یہ نظم فروری ۱۹۰۵ء کے مخزن میں "ایک ہندوستانی لڑکے کا گیت" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ نظر ثانی میں جزوی ترمیمات کے علاوہ ایک مکمل بند حذف کر دیا گیا جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں شائع کر دیا گیا ہے۔

حلِ لغات چشتی : مشہور بزرگ حضرت معین الدین چشتی اجمیری مراد ہیں۔ نانک : سکھ مذہب کا بانی بابا گورو نانک۔ پربت : پہاڑ۔

شعر چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا ۔ ۔ ۔

وضاحت ہندوستانی بچے اپنے وطن کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس سرزمین میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے اپنی کوشش و کاوش سے مختلف مذاہب اور فرقوں کے اختلافات کو بھلا کر آپس میں محبت سے رہنے کا پیغام دیا۔ جہاں بابا گورونانک نے ہندو مذہب سے متعلق ہونے کے باوجود اپنے پیروکاروں کو بتوں کی پوجا کرنے کی بجائے ایک خدا کی عبادت کرنے کا درس دیا جسے تاتاریوں نے یعنی مغلوں نے ترکستان ترک کر کے اپنا وطن بنا لیا اور جس کی دلآویزی اور حسن نے حجاز میں رہنے والوں سے عرب چھڑوا کر انھیں یہاں آباد ہونے پر مجبور کیا۔ وہی سرزمین میرا وطن ہے۔

شعر یونانیوں نے جس کو حیران کر دیا تھا ۔ ۔ ۔

وضاحت جس سرزمین کے باشندوں نے علم و حکمت کے میدان میں ایسے کمال کا مظاہرہ کیا کہ یونان کے فلسفی بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ جس علاقے سے تمام دنیا میں علم و ہنر پھیلا اور قدرت نے جس کی مٹی کو بھی سونے کی تاثیر دی تھی یعنی جس کی زمین بہت زرخیز تھی۔ جس کی وجہ سے ترک یعنی مغل بادشاہ حد سے زیادہ دولت مند ہو گئے تھے، وہی سرزمین میرا وطن ہے۔

شعر ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے ۔ ۔ ۔

وضاحت ایران چھوڑ کر ہندوستان میں آباد ہو جانے والے بادشاہوں، امرا، صوفیا، علما

اور شعراء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یہاں کی سرزمین نے انھیں اس قدر شہرت عطا کی کہ وہ کہکشاں کے ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ جہاں شری کرشن نے اللہ کے ایک ہونے کا درس دیا اور جہاں سے حضرت نبی اکرمؐ کو ٹھنڈی ہوا آئی تھی، وہی میرا وطن ہے۔

اِس بند میں دو امور لائق توجہ ہیں ایک تو یہ کہ تیسرے مصرعے میں شری کرشن کے حوالے سے محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال اِسی قسم کا اشارہ نظم "سرگزشتِ آدم" میں بھی کر چکے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شری کرشن بھی نبی تھے اور انھوں نے بھی دیگر انبیاء کی طرح لوگوں کے سامنے ایک خدا کا تصور پیش کیا تھا لیکن بعد ازاں عیسائیت کی طرح اُن کے دیئے ہوئے پیغام کی شکل وصورت بھی یکسر بدل دی گئی۔ چوتھے مصرعے میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے مشرق یعنی ہندوستان سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے یعنی اِس خطے میں اسلام خوب پھلے پھولے گا (اگرچہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ حدیث ضعیف ہے)

۵ بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا - - -

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ جس سرزمین کا ہر باسی موسیٰؑ جیسی عظمت کا حامل ہے اور جہاں کا ہر پہاڑ کوہِ طور جیسی شان رکھتا ہے جہاں حضرت نوحؑ کی کشتی آکر رُکی تھی اور جو سرزمین بلندی میں آسمان کی ہمسر ہے اور جہاں کی زندگی جنت جیسی ہے، وہی میرا وطن ہے۔

بعض محققین کے خیال میں حضرت نوحؑ کی کشتی ہندوستان میں آکر رُکی تھی جبکہ عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ کوہِ جودی (ارارات) پر آکر ٹھہری تھی۔

نیا شوالہ

(۸۸)

تعارف

یہ نظم پہلی بار مارچ ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اِس میں اُنیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں دس شعر قلمزد کر دیئے گئے۔ ایک شعر پہلے بند سے خارج کیا گیا اور نو شعر دوسرے بند سے۔ حذف شدہ اشعار باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں

درج ہیں۔

حلِ لغات

صنم کدہ : بتوں کا گھر ۔ بیر : دشمنی، نفرت ۔ دیر : بت خانہ ۔ حرم : کعبہ ۔ مورتی : بت ۔ غیریت : اجنبیت، بیگانگی ۔ نقشِ دوئی : مراد ہے اختلاف وافتراق ۔ سُونی : ویران ۔ نیا شوالہ : مہادیو کا استھان ۔ مندر ۔ تیرتھ : ہندوؤں کا مقدس مذہبی مقام ۔ کلس : چوٹی ۔ پریت : محبت ۔ شکتی : قوت، طاقت، شانتی : سکون اور امن ۔ مکتی : نجات ۔ پریت : محبت ۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے ۔ ۔ ۔

وضاحت

اے برہمن اگر تجھے میری بات بُری نہ لگے تو میں ایک سچی بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تمھارے بت خانوں میں رکھے ہوئے بت اب بہت پرانے ہو گئے ہیں اور یہ اس لائق نہیں ہے کہ ان کی عبادت کی جائے ۔ مصیبت خیز اور پریشان کن بات یہ ہے کہ تُو نے بتوں سے یہ بات سیکھی ہے کہ اپنے ہموطنوں سے نفرت اور دشمنی کا رویہ اختیار کیا جائے ۔ اسی طرح خدا کے پیغام کو درست طور پر نہ سمجھنے کے نتیجے میں واعظ نے بھی لڑائی اور پیکار سیکھ لی ہے ۔ واعظ اور تمھاری تنگ نظری سے تنگ آکر میں نے بت خانہ و کعبہ یعنی کفر اور اسلام دونوں کو ترک کر دیا ہے اور واعظ کے خطبوں اور تقریروں کے ساتھ ساتھ تیری مذہبی کہانیاں بھی سننا چھوڑ دی ہیں ۔ تو نے غلطی سے یہ بات سمجھ لی ہے کہ پتھر سے تراشے ہوئے بتوں میں خدا موجود ہے اور ان پتھروں کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے تجھے خدا مل جائیگا جبکہ میرے نزدیک تو میرے وطن کی مٹی کا ایک ایک ذرہ خدا اور دیوتا ہے اور اسی اعتبار سے لائق پرستش ہے ۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں ۔ ۔ ۔

وضاحت

اقبال برہمن کو دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آؤ ایک بار پھر اجنبیت اور بیگانگی ختم کر کے اُن لوگوں کو باہم شیر و شکر کر دیں جو مذہبی جھگڑوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں ۔ یہ اسی طرح ممکن ہو گا کہ وہ تمام امتیازات ختم کر دیں جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تفریق اور دوری کا باعث ہیں ۔ بہت عرصے سے دل کی بستی ویران ہے ۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ دیر و حرم کو چھوڑ کر اپنے وطن میں ایک نئے تیرتھ اور مندر کی بنیاد رکھیں ۔ وہ مندر یقیناً ایسا ہو گا جس میں وطن کو دیوتا کی حیثیت حاصل ہو گی ۔ اقبال کہتے ہیں کہ آئیے سب ہندوستانی مل کر اس نئے مندر اور مقدس مذہبی مقام کو اِس قدر بلندی اور عظمت عطا کر دیں کہ سب مقدس مقامات

سے بھی زیادہ مقدس ہو جائے اور اس کی چوٹی آسمان کو چھوتی نظر آئے۔ اس کی پوجا کرنے والے ہر صبح اٹھ کر ایسے پیارے پیارے منتر اور نغمے گائیں کہ ان کے اثر سے تمام اہل وطن ایک دوسرے کی محبت سے سرشار ہو جائیں۔ بھگت یعنی تارک الدنیا پجاریوں کے گیت قوت وطاقت ہی نہیں بلکہ آرام وسکون کا باعث بھی بنتے ہیں اور یہ گیت اس لیے بھی قابلِ تعریف ہیں کہ خود اہلِ زمین کی نجات کا سامان بھی پیار ومحبت اور بھائی چارے میں پوشیدہ ہے۔

داغ

(۸۹)

تعارف یہ نظم مشہور شاعر اور خود اقبال کے استاد حضرت مرزا خاں داغ کی وفات پر لکھی گئی تھی۔ نواب مرزا داغ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد دکن میں وفات پائی۔ داغ کی وفات کے بعد سر عبدالقادر نے اپریل ۱۹۰۵ء میں ماہنامہ مخزن کا "یادگارِ داغ" نمبر شائع کیا تھا۔ اقبال کی یہ نظم بھی جو داغ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، اسی نمبر میں شائع ہوئی۔ نظرِ ثانی میں اس نظم میں بعض تبدیلیاں کی گئیں مثلاً پہلے یہ نظم چار بندوں پر مشتمل تھی، نظرِ ثانی میں آخری بند کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دوسرے بند کا ایک شعر پہلے بند میں شامل کر دیا گیا۔ چار شعر قلمزد کر دیے گئے جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔ اسی طرح ایک مصرع بالکل بدل دیا گیا۔ علامہ اقبال نے داغ کے اس مرثیے میں شاعر کے علاوہ ایک نقاد کی طرح خصوصیاتِ کلامِ داغ بھی پیش کی ہیں۔

حلِ لُغات **پیوندِ زمیں**: خاک میں مِلی ہوئی ؛ **مہدیِ مجروح**: میر مہدی جو مجروح تخلص کرتے تھے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے اور شاعری میں مرزا غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ خطوطِ غالب میں ان کے نام بہت سے مکتوب ملتے ہیں ؛ **شہرِ خموشاں**: مراد ہے قبرستان ؛ **امیر**: اشارہ ہے مشہور غزل گو شاعر امیر مینائی کی طرف ؛ **عنادل**: عندلیب کی جمع۔ بلبل ؛ **نکتہ آرا**: اچھی اور قابلِ غور باتیں پیدا کرنے والا ؛ **فلک پیمائیاں**: فکر و

تخیل کی بلند پروازی کی طرف اشارہ ہے ۔ آزر : مشہور بت تراش جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے والد تھے ۔ بعض لوگ چچا بھی کہتے ہیں ۔ تفسیر : تشریح ' وضاحت ۔ ناوک فگن : تیر مارنے والا ۔ کاشانہ : گھر ۔ بیدادِ اجل : موت کا ظلم وستم ۔ صیادِ اجل : موت کا شکاری یعنی موت ۔ گلچیں : پھول توڑنے والا ۔

۵ عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مرزا اسداللہ خاں غالب جیسے عظیم شاعر کو وفات پائے اور مٹی میں ملے طویل عرصہ گذر چکا ہے ۔ میر مہدی مجروح بھی قبرستان میں جا بسا یعنی فوت ہو گیا ۔ اگرچہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ابھی تک امیر مینائی کی شاعری کے نشے میں سرشار ہیں ، لیکن امیر مینائی بھی پردیس میں موت کا شکار ہو گئے ۔ مینائے امیر سے مقصود تو امیر کی زندگی ہے لیکن اس میں لطف یہ ہے کہ امیر مینائی حضرت شاہ مینا کے معتقد تھے اور اسی رعایت سے مینائی کہلاتے تھے ۔ پردیس کا ذکر اس لیے کیا کہ امیر مینائی پیدا تو لکھنؤ میں ہوئے تھے اور وہی ان کا آبائی وطن بھی تھا لیکن ان کا انتقال حیدرآباد دکن میں ہوا ۔

اقبال اردو کے تین شعراء کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اے میرے ہم آواز ! آج سارا گلستان درد و غم کے باعث ماتم کر رہا ہے اور وہ اس لیے کہ موجودہ زمانے میں شاعری کی روشن شمع بجھ گئی ہے یعنی داغ فوت ہو گئے ہیں اور اسی وجہ سے شاعری کی بزم ماتم کناں ہے ۔ دلی کی بلبل یعنی حضرتِ داغ نے اب اپنا آشیانہ اُس گلستان میں بنا لیا ہے جہاں زندگی کے باغ کے سارے بلبل ہم آواز ہیں یعنی داغ وفات پاکر عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے ۔ افسوس کہ داغ چل بسا ہے اور اب اس کا جنازہ کندھوں پر اٹھا کر قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جہان آباد یعنی دہلی کا آخری شاعر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ہے ۔ یعنی اب دبستانِ دہلی کا اندازِ شعر و سخن آگے بڑھانے والا کوئی نہ رہا ۔

اب کہاں وہ بانکپن اور شوخیٔ طرزِ بیاں ۔ ۔ ۔

وضاحت داغ کے فوت ہو جانے کے بعد شاعری کی وہ خصوصیات مثلاً بانکپن اور شوخی جو داغ کے ساتھ مخصوص تھیں ، اب کہاں نظر آئیں گی ۔ داغ اگرچہ بوڑھا تھا لیکن پیرانہ سالی کے باوجود اس کے بڑھاپے میں جوانی کی جلا دینے والی آگ پوشیدہ تھی ۔ داغ ایسا قادر الکلام شاعر تھا کہ وہ تمنائیں اور خواہشیں جو عام لوگوں کے دل میں ہوتی تھیں ، داغ کی شاعری میں نظم ہو جاتی تھیں اور جو باتیں لوگ پردے میں رکھتے تھے وہ کلامِ داغ میں بالکل نمایاں ہو کر سامنے

آجاتی تھیں۔ یعنی داغ کی شاعری عام انسانی جذبات کی عکاس اور ترجمان ہوتی تھی لیکن اب جبکہ داغ وفات پاگیا ہے۔ تو کون شخص ہے جو صبا سے گُل کی خاموشی کی وجہ معلوم کر سکے اور اِس بات کو سمجھ سکے کہ بلبل نالہ و فریاد کیوں کرتا ہے؟ گویا معشوق و عاشق کے راز و نیاز اور ان کی کیفیات کو واضح طور پر پیش کرنے کا ملکہ داغ ہی کو حاصل تھا۔ داغ ایسے شاعر تھے جو فکر شعر کے دوران میں حقائقِ عالم سے غافل نہیں ہوتے اور جنکا تخیل انتہائی بلند پروازی کے دوران میں بھی اپنے اصل مقصد سے غافل نہیں ہوتا۔

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں ۔ ۔ ۔

وضاحت دوسرے بہت سے شاعر اپنی شاعری میں مضمون پیدا کرنے کے کمالات ظاہر کریں گے۔ اس کے علاوہ اُن کا بات بات میں نکتے پیدا کرنے والا ذہن اور تخیل آسمان تک اپنی اڑان کی قوت کا مظاہرہ کرے گا۔ اِس کے علاوہ عام انسانی زندگی کی تکلیف دہ صورتِ حال کا پُر تاثیر ذکر کر کے لوگوں کو رونے پر مجبور کریں گے اور اپنے تخیل کی نئی نئی دنیائیں سامنے لائیں گے جنھیں بلاشبہ جادوگر اور معجزے دکھانے والے شاعروں کی حیثیت سے یاد کیا جائیگا۔ اگر شاعری کی دنیا کو بت خانہ تصور کیا جائے تو یقیناً اِس بت خانے میں بہت سے بت تراش پیدا ہوں گے اور نت نئے بت تراش تراش کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کریں گے۔ نئے نئے شاعر نئے نئے انداز سے شعر و شاعری کریں گے۔ اگر دل کو ایک کتاب فرض کر لیا جائے تو اِس کی تشریح کرنے والے بہت سے شاعر پیدا ہوں گے اور جوانی میں دیکھے گئے خوابوں کی نئی نئی تعبیریں پیش کریں گے۔ مراد یہ ہے کہ حسن و عشق اُن کی شاعری کا موضوع ہوگا لیکن داغ کے وفات پا جانے کے بعد ایسا شاعر کہاں ہوگا جو عشقیہ کیفیات کا کامل نقشہ پیش کر سکے۔ علامہ اقبال نے داغ کو ناوک فگن قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیر اندازی کرنے والا شخص تو فوت ہو گیا اب دل پر کون تیر مار سکے گا یعنی من موہ لینے والی شاعری اب کس سے ہو سکے گی۔

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں ۔ ۔ ۔

وضاحت میں شعر کی زمین میں آنسو کاشت کر رہا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ رو رہا ہوں اے دہلی کی سرزمین میں رو رہا ہوں۔ داغ کی وفات پر تجھے بھی رونا چاہیئے۔ اے شہرِ جہان آباد تجھے شاعروں کی محفل کا سرمایہ قرار دیا جانا چاہیئے۔ آج تیرے گلشن کو پھر خزاں نے روند ڈالا۔ تیرے چمن کا انتہائی دلآویز پھول یعنی داغ خوشبو کی طرح چلا گیا اور اِس طرح اردو کا گھر داغ جیسے عظیم شاعر سے خالی ہو گیا۔ شاید داغ کے دل میں اپنے وطن یعنی دہلی کی محبت نہیں تھی، اسی لیے وہ چودھویں رات کا چاند دکن کی مٹی میں چھپ گیا۔

اقبال داغ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ دہلی کے تمام شاعر وفات پا گئے۔ اب اِس محفل اور دبستان کی آخری نشانی مولانا الطاف حسین حالی رہ گئے ہیں۔

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل ۔۔۔ ۔۔۔

وضاحت موت کا ظلم وستم ہماری خواہشوں اور تمناؤں کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتا ہے موت کا شکاری رات کی تاریکی میں تیر چلاتا ہے یعنی اندھا دھند شکار کرتا ہے اور اس کے سامنے مصلحتیں نہیں ہوتیں۔ لیکن اِس صورتحال کے باوجود انسان شکایت نہیں کر سکتا۔ اِس لئے کہ خزاں کی کیفیت بھی گلشن کی زندگی کی ایک اہم وجہ ہے۔ یعنی اگر خزاں نہ ہو تو بہار و گلستان کی قدر نہ کی جا سکے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ خواہ گلشن میں پھول کی خوشبو کا بکھرنا ہو یا پھول توڑنے والے کی وفات کا واقعہ یہ سب چیزیں ایک ہی قانون کے زیرِ اثر ہیں اور یہ قاعدہ بھی آفاقی نوعیت کا ہے۔ اِس میں وقت اور مقام کے تغیر و تبدل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ موت کسی میں امتیاز نہیں کرتی اور سب کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔

ابر

(۹۱)

تعارف مطالبِ بانگِ درا میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"یہ نظم ۱۹۰۴ء میں بمقام ایبٹ آباد لکھی گئی تھی۔ جہاں اقبال سیر و تفریح کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اِس جگہ بیٹھ کر لکھی تھی جہاں آج کل میونسپل کمیٹی کا باغ ہے اور سربن پہاڑ اس کے سامنے نظر آتا ہے۔" ص۹۹

مولانا مہر کی تحریر سے دیگر تفصیلات کے علاوہ اِس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ یہ نظم ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی جبکہ بانگِ درا میں جس مقام پر یہ نظم چھپی ہے، اس کی روشنی میں ۱۹۰۲ء کو اِس نظم کا سنہ تصنیف ماننا قرینِ قیاس نہیں لگتا۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ اِس نظم نے سنہ تصنیف کی بجائے

سنہ اشاعت کی ترتیب سے بانگِ درا میں جگہ پائی ہو اور نظم "ابر" کے سالِ اشاعت کے بارے میں نسیم امروہوی "فرہنگ اقبال" میں لکھتے ہیں ۔

" یہ ...... نظم ...... ماہنامہ "زمانہ" کانپور ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی ۔" صہ۱

حلِ لغات

پورب : مشرق ۔ سیاہ پوش : کالا لباس پہننے والا ۔ مربن : ایبٹ آباد کے مشرق میں واقع ایک پہاڑ کا نام ۔ میکدۂ بے خروش : وہ شراب خانہ جس میں کوئی ہنگامہ نہ ہو ۔ نشاطِ مدام : ہمیشہ رہنے والی مسرت ۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا ـ ـ ـ

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ آج پھر مشرق کی طرف سے کالے کالے بادل آئے جنکی وجہ سے یوں لگتا ہے کہ مربن پہاڑ نے کالا لباس پہن لیا ہے ۔ جب سورج کا چہرہ بادل کے دامن کے نیچے چھپ گیا یعنی سورج بادلوں کے پیچھے چلا گیا تو ٹھنڈی ہوا بادل کے گھوڑے پر سوار ہوکر آئی ۔ یہ بادل بالکل خاموش ہیں اور اس طرح اسے ایسا شراب خانہ قرار دیا جا سکتا ہے جو بیحد پرسکون ہو اور جس میں کوئی ہنگامہ نہ ہو ۔ یہ کالے بادل گلستان میں اس مسرت و شادمانی کو لے کر آئے ہیں جو کبھی بھی ختم نہ ہوگی اور جس کی وجہ سے پھولوں کے لباس میں موتی ٹانک دیئے جائیں گے ۔ یعنی گلستان کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو جائے گا ۔ جو پھول سورج کی گرمی کے باعث مرجھا گئے تھے وہ نئے سرے سے تر و تازہ ہو گئے اور جن پودوں کی ٹہنیوں کے کملانے کے باعث پھول زمین پر گر گئے تھے وہ ٹہنیاں اور پھول بھی اس بادل کے آتے ہی سرسبز و شاداب اور تر و تازہ نظر آنے لگے ۔ ہوا کی وجہ سے یہ بادل بڑی تیزی کے ساتھ آسمان کی ایک سمت میں نظر آیا ۔ پھر آگے بڑھا اور تیزی کے ساتھ اڑتے ہوئے سارے آسمان پر چھا گیا ۔ ابھی ابھی کچھ اور بادل آئے اور بارش برسنے لگی ۔ (نوٹ : اس مصرعے کے مختلف الفاظ میں الف کی تکرار صوت کے ذریعے بادل کے ابھرنے کی کیفیت سامنے لے آتی ہے ۔) برستی ہوئی بارش میں کسی جاندار کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی ۔ البتہ درختوں کا جھنڈ جو خیمے کی شکل میں کھڑا ہے، اُن کی پناہ گاہ کا کام دے سکتا ہے ۔ مربن پہاڑ کی وادی میں سیر و تفریح کرنے والوں کو بارش برسنے کے دوران میں درختوں کے کسی ایسے ہی جھنڈ میں ٹھہرنا چاہیئے ۔

ایک پرندہ اور جگنو

(۹۲)

تعارف

علامہ اقبال نے اِس نظم کے بارے میں اِس نوعیت کی کوئی تصریح نہیں کی جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ نظم کسی مغربی شاعر سے ماخوذ ہے یا طبع زاد۔ لیکن پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنی کتاب "اقبال ـ شخصیت و شاعری" میں اِسے ولیم کوپر کی ایک نظم ــــــ The Night-ingale and the Glow-worm سے ماخوذ بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی نظم "ہمدردی" کو ولیم کوپر سے ماخوذ بتایا ہے۔ جبکہ پروفیسر حمید احمد خاں نے نظم "ہمدردی" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نظم COWPER'S POETICAL WORKS میں نہیں ہے۔ درحقیقت کوپر کی ایک ہی نظم کو اقبال نے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دو نظموں کی شکل میں لکھا ہے۔

حلِ لغات

مُرغِ نغمہ پیرا: گانا گانے والا پرندہ ٭ نوا ریز: گانا گانے والا ٭ منقار: چونچ ٭ مستور: چھپا ہوا ٭ طور: کوہ طور جہاں حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھا تھا۔ یہاں مراد ہے منبعِ نور و روشنی ٭ اوج و پستی: اعلیٰ و ادنیٰ ٭ بوستاں: یہاں پر دنیا مراد ہے ٭

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ پیرا ـ ـ ـ

وضاحت

شام کے وقت ایک گانا گانے والا پرندہ کسی ٹہنی پر بیٹھا گا رہا تھا کہ اُس نے زمین پر ایک چمکتی ہوئی چیز دیکھی۔ وہ پرندہ اسے جگنو سمجھ کر اُسے کھانے کے لیے اُترا۔ جگنو نے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے نغمے گانے والے پرندے تو مجھ پر اپنی لالچی چونچ کو تیز نہ کر۔ اس لیے کہ جس ہستی نے تجھے گانے کی صلاحیت بخشی اور پھول کو خوشبو عطا کی ہے اسی نے مجھے روشنی سے نوازا ہے۔ میں نور کے لباس میں چھپا ہوا ہوں اور اِس اعتبار سے مجھے پروانوں کی دنیا کا طور یعنی منبعِ نور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اللہ نے میرے پروں کو روشنی دی ہے تو اے دل موہ لینے والے پرندے اللہ نے تجھے بھی آواز سے نوازا ہے۔ اُس نے تیری چونچ کو نغمہ گانا سکھایا اور

مجھے گلستان میں شمع کی حیثیت دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے روشنی دی اور تجھے آواز عطا کی۔ اس طرح دیکھا جائے تو مجھے سوز اور تجھے ساز عطا کر دیا ہے اور دنیا میں کبھی سوز و ساز ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتے بلکہ یہ ہمیشہ ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ دنیا کی محفل انہی کے دم سے قائم ہے اور اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق بھی ان ہی کی وجہ سے عیاں ہوتا ہے۔ یہ بزم دنیا اتحاد و اتفاق اور ایک ہی رنگ میں رنگے جانے سے قائم ہے اور یہی چیز اس دنیا کی بہار کا سبب ہے۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو فرد پہنچانے کی بجائے آپس میں مل جل کر رہنا چاہیئے۔

بچہ اور شمع

(۹۳)

تعارف یہ نظم ستمبر ۱۹۰۵ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی اور بلا ترمیم و اضافہ بانگِ درا میں شامل کر لی گئی تھی۔

حلِ لغات طفلکِ پروانہ خو: پروانے جیسی عادت رکھنے والا بچہ۔ مدعا: مقصد۔ خاکِ تیرہ: تاریک مٹی مراد ہے جسم۔ ضَو گستری: روشنی پھیلانا۔ گم گشتہ: کھوئی ہوئی۔ ماہیٔ بے آب: پانی سے جدا ہو جانے والی مچھلی۔

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلکِ پروانہ خو ۔ ۔ ۔

وضاحت کم عمر بچے عموماً روشن اشیاء میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ شمع سے بچے کی اسی دلچسپی کو بنیاد بناتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے پروانے جیسی عادت رکھنے والے بچے! آخر تجھ پر حیرت کی کیفیت کیوں طاری ہے اور تو دیر تک شمع کے شعلوں کو کیوں دیکھتا رہتا ہے؟ میری گود میں بیٹھے ہوئے تو شمع کے شعلوں کی طرف کیوں ہمکتا ہے؟ کیا تیرا مقصد یہ ہے کہ تو ان شعلوں کی روشنی سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے۔ روشنی کے اس منظر کو دیکھ کر تیرا ننھا سا دل حیرت زدہ ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو نے کسی پہلے سے دیکھی ہوئی چیز کو پہچان لیا ہے۔

ع شمع اِک شُعلہ ہے لیکن تو سراپا نُور ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے نیچے! شمع تو صرف ایک شُعلہ رکھتی ہے لیکن تُو تو سر سے پاؤں تک روشنی ہی روشنی ہے ۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک شعلہ رکھنے کے باوجود شمع تو اِس دنیا میں ظاہر ہوگئی ہے لیکن تیری روشنی زمانے کی آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے ۔ معلوم نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کس مصلحت کے تحت شمع کو ظاہر و نمایاں کر دیا ہے اور تجھے مٹی سے بنائے گئے جسم میں چھپا دیا ہے ۔ تیرا نور علم و احساس کے پردے کے نیچے چھپ گیا ۔ علم و احساس دیکھنے والی آنکھ کے لیے گرد و غبار کی حیثیت رکھتا ہے یعنی جس طرح غبار انسان کی آنکھ سے دیکھنے کی صلاحیت چھین لیتا اور منظر کو دھندلا دیتا ہے بالکل یہی کام علم و احساس کرتا ہے ۔ جسے زندگی کہتے ہیں وہ علم و احساس نہیں ہے ۔ بلکہ خود کو بھول جانے اور مٹا دینے کا دوسرا نام ہے ۔ زندگی درحقیقت ایک خواب ہے، بے پروائی و غفلت، دیوانگی اور ہوش و خرد سے بیگانگی کا نام ہے ۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے :

ع جناب شیخ یہ میخانہ عشق کا ہے یہاں
جو بے خبر ہو اُسے ہوشیار کہتے ہیں ۔

ع محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن ۔ ۔ ۔

وضاحت اللہ تعالےٰ کی تخلیق کردہ یہ کائنات حُسن کے ایسے سمندر کی حیثیت رکھتی ہے جس کا کوئی کنارا نہیں ہے ۔ اگر انسانی آنکھ غور کرے تو اُسے معلوم ہو گا کہ اِس کائنات کا ایک ایک قطرہ اپنے اندر حُسن کا طوفان رکھتا ہے ۔ اگر پہاڑوں پر چھاتی ہوئی خاموشی کو دیکھا جائے تو اس میں بھی حسن موجود ہے ۔ سورج کے روشنی پھیلانے کے عمل اور رات کی تاریکی میں بھی حسن ملتا ہے صبح کو جب آسمان نور اور روشنی کی وجہ سے آئینے کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اس وقت بھی حُسن کا احساس ہوتا ہے ۔ شام کو اندھیرا پھیلانا اور شفق کی گلاب جیسی رنگت میں بھی حسن موجود ہے ۔ گزرے ہوئے زمانے کی بڑائی اور عظمت کے مٹتے ہوئے نقوش میں بھی حسن نظر آتا ہے ۔ یہ حسن باغ کے رہنے والوں یعنی پرندوں کے نغموں میں بھی ملتا ہے اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے گھونسلے بنانے کی کوشش میں بھی دیکھا جاسکتا ہے ۔ پہاڑ کے چشموں اور دریاؤں میں بھی حُسن موجود ہے ۔ اِس طرح شہر، صحرا، ویرانے اور کنا دیوں میں حسن موجود ہے لیکن انسانی روح کو حسُن کی اِس فراوانی کے باوجود کسی ایسی شئے کی تلاش ہے جو اِس سے گم ہو چکی ہے ورنہ یہ گھنٹی کی آواز کی طرح صحراؤں میں آہ و فریاد بلند نہ کرتی ۔ گو اِس کے چاروں طرف حُسن کے جلوے بہت کثرت سے ہیں ۔ اِس کے باوجود انسانی روح کی زندگی اس مچھلی کی مانند بے قرار ہے ۔

جو پانی سے جدا کر دی گئی ہو۔ اس نظم میں اقبال ورڈز ورتھ کے اس خیال سے متاثر ہے کہ بچپن میں ہم خدا کے قریب ہوتے ہیں، بعد میں اس سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

کنارِ راوی

(۹۴)

نظم کنارِ راوی نومبر ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے کل چودہ اشعار تھے۔ نظر ثانی میں دو شعر حذف کر دیئے گئے جو کہ سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حلِ لغات سرود: نغمہ۔ زیر و بم: اونچ نیچ۔ یہاں پر موسیقی کے اونچے اور نیچے سُر مراد ہیں۔ قافلہ روز تیز گام: دن کا تیز چلنے والا قافلہ۔ شہسوار چغتائی: تمام تاتاری اور مغل چغتائی کہلاتے تھے۔ لہٰذا مشہور مغل بادشاہ جہانگیر کو بھی اسی خطاب سے یاد کیا۔ زمانِ سلف: گزرا ہوا زمانہ۔ گرمِ ستیز: معروفِ جنگ۔

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال دریائے راوی کے پانی کے بہاؤ کے باعث پیدا ہونے والے شور کو اس کا نغمہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شام کو جب ہر طرف خاموشی چھا گئی ہے دریائے راوی اپنے نغموں میں کھویا ہوا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر میرے دل میں جس نوعیت کے جذبات اُمڈ رہے ہیں، اُن کو بیان کرنا آسان نہیں۔ دریا کے پانی کے اُونچے اور نیچے سُر میرے لیے سجدے کا پیغام بن گئے یعنی انھوں نے مجھے سر جھکانے اور سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا جس کے باعث ساری دنیا میرے لئے کعبہ اور اُس کے آس پاس کا متبرک مقام بن گئی۔ میں بہتے ہوئے پانی کے کنارے کھڑا ہوں لیکن میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں یعنی محویت کے باعث ظاہری حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام ۔ ۔ ۔

وضاحت شام کا دامن سُرخ رنگ کی انتہائی قیمتی شراب سے تر ہو گیا ہے۔ ایسا اس وجہ سے

ہوا کہ بوڑھے آسمان نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں شراب کا پیالہ لے رکھا ہے۔ شام کے وقت زوال کے باعث سورج کی روشنی سُرخی مائل ہو جاتی ہے۔ اسی بناء پر شاعر نے آسمان کو ساقی قرار دیتے ہوئے سورج کو ایسے پیالے سے تشبیہہ دی جو سرخ شراب سے بھرا ہوا ہے اور چونکہ یہ اپنی منازلِ سفر بہت تیزی سے طے کر رہا ہے لہٰذا آسمان کو بوڑھا ہونے کی رعایت سے ایسا ساقی قرار دیا جس کا ہاتھ کانپ رہا ہے اور مسلسل لرزش میں ہے۔ اسی وجہ سے جام سے شراب گر گئی اور شام کا دامن رنگین ہو گیا۔ یعنی سورج کی سرخی شام کے سارے منظر میں سرایت کر گئی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اِس وقت دن کا تیزی سے چلنے والا قافلہ عدم کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یعنی دن ختم ہو رہا ہے اور ایسے میں شفق کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شفق نہیں ہے بلکہ سورج کے پھول ہیں۔ یہاں پر پھول سے مراد گل نہیں بلکہ وہ راکھ ہے جو ہندوؤں میں مردہ جسم کو جلانے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور جسے عموماً گنگا اور جمنا دریا میں بہایا جاتا ہے یا بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھیر دیا جاتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے پھول کی وضاحت یوں کی ہے کہ میت پر عموماً پھول چڑھائے جاتے ہیں اور شفق نے سورج کی میت پر چڑھانے کے لئے پھول تیار کئے ہیں جبکہ نسیم امروہوی نے فرہنگ اقبال میں پھول کے معنی تیجے کی فاتحہ قرار دیئے ہیں۔ بہر حال اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج کا سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔

ایسے میں اقبال کی نظر دریائے راوی کے کنارے جہانگیر کے مقبرے پر پڑتی ہے جسے دیکھ کر وہ کہتے ہیں کہ اِس منظر میں کچھ فاصلے پر مغل بادشاہ جہانگیر کے مقبرے کے وہ مینار کھڑے ہیں جو تنہائی کی عظمت اور بڑائی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ موقع اور یہ مقام زمانے کے انقلاب اور تبدیلیوں کے مظالم کی داستان ہے اور راسے گزرے ہوتے زمانے کی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ محل و مقام درحقیقت ایک خاموش نغمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہاں پر ایستادہ درخت دراصل ایسی محفل کی حیثیت رکھتے ہیں جو ہنگامے سے خالی ہو۔

۵ رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز

وضاحت ایسے میں شاعر دریا میں ایک کشتی کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ دریا کے درمیان ایک کشتی نہایت تیزی سے سفر کر رہی ہے جس کا ملاح اپنی کشتی کو لہروں اور موجوں سے بچاتا ہوا منزلِ مقصود تک لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کشتی انسانی نگاہ کی رفتار سے اپنا سفر طے کر رہی ہے یعنی بہت تیز ہے۔ اس لئے بہت جلد میری نگاہوں کے حلقے سے نکل گئی یعنی اوجھل ہو گئی اور اب نظر نہیں آتی۔ اقبال کا ذہن انسانی زندگی کی طرف پلٹتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ

انسانی زندگی کی بھی یہی صورت ہے اور حیات بھی اسی طرح اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ اس کائنات میں زندگی اس کشتی کی مانند ظاہر ہوتی اور چھپتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح کشتی کا نظروں سے اوجھل ہو جانے سے کشتی کی فنا لازم نہیں آتی، اسی طرح انسان کا ہماری نظروں سے اوجھل ہو جانا اُس کی فنا پر دال نہیں علامہ اقبال اِس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کبھی ٹوٹ پھوٹ سے دوچار نہیں ہوتی۔ یہ نظر سے چھپ بھی جائے تو اسے انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ علامہ اقبال نے یہی خیال یوں بھی پیش کیا ہے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

التجائے مُسافر

(۹۶)

تعارف حضرتِ علامہ اقبال ستمبر ۱۹۰۵ء میں حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ جاتے ہوئے دہلی میں بھی قیام کیا اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک پر حاضری دی۔ وہیں یہ نظم بھی پڑھی "التجائے مسافر" اکتوبر ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی نظرِ ثانی میں اس کے جو شعر حذف کئے گئے اُن کی تعداد مولانا غلام رسول مہر کے مطابق پندرہ ہے۔ جب کہ باقیاتِ اقبال میں متروک کلام کے ضمن میں سولہ شعر دیئے گئے ہیں۔

حلِ لغات لحد: قبر، مزار۔ نگارخانہ: محبوب کے رہنے کی جگہ۔ نردباں: سیڑھی۔ شانہ: کنگھی۔ ریاضِ دہر: دنیا کا باغ۔ خنداں: مسکراتا ہوا۔

ہ فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرا نام اس قدر بلند ہے کہ فرشتے بھی اس کا ورد کرتے ہیں۔ آپ کا دربار بھی بہت بڑا ہے اور آپ کا فیضان بھی ہر خاص و عام کے لئے ہے۔ عشق کے تمام ستارے یعنی عشاق تیری کشش و محبت کی وجہ سے اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تیرا انتظام بھی نظامِ شمسی کی طرح ہے۔ تیرے مقبرے کی زیارت دل کو نئی زندگی عطا کرتی ہے اور اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو تیرا مرتبہ حضرت عیسٰیؑ اور حضرتِ خضرؑ سے زیادہ بلند ہے۔ یعنی وہ اپنی زندگی میں محض مردہ انسانی جسم کو زندہ کر دیتے تھے جبکہ وفات پانے کے باوجود آپ کی وجہ سے دلوں میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ حضرت نظام الدین کے مقام کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے خدا سے اس طرح لو لگائی کہ خود اللہ تعالٰے نے آپ کو اپنا محبوب بنالیا اور چونکہ آپ اللہ تعالٰے کے محبوب ہیں لہٰذا آپ کی شان حد سے زیادہ ہے۔

اگر میں بدبخت اور سیاہ دل ہوں تو تیرے گلستان کے لالے کا داغ ہوں اور اگر میں کشادہ پیشانی رکھتا ہوں تو پھر تیرے گلستان میں آتی ہوئی بہار کی وجہ سے کھلنے والا پھول ہوں۔ یعنی جو کچھ بھی ہوں میرا تعلق تجھ ہی سے ہے۔

ہ چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل ۔ ۔ ۔

وضاحت جس طرح خوشبو چمن سے نکلتی ہے اِسی طرح میں بھی اپنے وطن سے جا رہا ہوں اور یوں میں اپنے صبر کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ یعنی وطن سے دوری ایک سخت امتحان ہے جس سے مجھے گذرنا ہے۔ میں اپنے محبوب وطن سے صرف علم حاصل کرنے کے ذوق کے باعث جا رہا ہوں۔ میں اس درخت کی مانند ہوں جو صحرا میں اُگنے کے باعث کسی مالی اور باغبان کا مرہونِ منت نہیں ہوتا بلکہ اپنی سرسبزی و شادابی کے لیے بادل کا انتظار کرتا ہے۔ اے محبوبِ الٰہی! آپ میرے حق میں ایسی دُعا کریں جس کی بدولت مجھے وہ سیڑھی مل جائے جس پر چڑھ کر میں دنیا میں سورج کی طرح آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جاؤں۔ میں اس قدر آگے نکل جاؤں کہ آج جو لوگ میرے ہمسفر اور ساتھی ہیں وہ سب کے سب مجھے منزل مقصود تصور کرنے لگیں۔ خدا کرے کہ میری شاعری اور دیگر تحریروں سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جو مجھ سے نالاں ہو۔ تیری بارگاہ سے مجھے نالہ و فریاد کا ایسا انداز مل جائے جو کنگھی کی طرح دلوں کو چیر دے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جس گھر کو میں نے بڑی محنت و کاوش سے بنایا تھا خدا کرے میں انگلستان سے واپس آکر پھر اُسے دیکھ سکوں ۔ واپس آؤں تو مجھے اپنے والدین کی قدم بوسی کا اعزاز حاصل ہو ۔ وہ والدین جنھوں نے مجھ سے اس قدر محبت کی کہ میں خود محبت کے راز سمجھنے کے قابل ہو گیا ۔ اسی طرح وہ شخص جو حضرت علیؓ کے خاندان کی شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کا گھر میرے لیے خانۂ کعبہ کی طرح قابل تکریم ہے اور جس کے فیض سے میری آرزوئیں ہنستا مسکراتا پھول بن گئیں اور جس کی مہربانی و عنایت نے مجھے علم و ادب سے آشنا کیا ، اُس کے بارے میں اللہ تعالےٰ کے حضور یہ دُعا کر کہ خدا مجھے انگلستان سے واپسی پر اُس کی زیارت کی خوشی و شادمانی سے سرشار کرے (ان تین اشعار میں علامہ اقبال نے اپنے استاد مولوی میر حسن کے لئے دعا کی ہے) آئندہ اشعار میں وہ اپنے بھائی شیخ عطا محمد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ جو میرے لیے حضرت یوسف کی حیثیت رکھتا ہے اور عشق کی بزم کی شمع ہے اور جس کی محبت و اخوت میرے لیے وجہ اطمینان و سکون ہے ۔ جس نے امتیازات ختم کر کے عیش و عشرت اور ناز و نعم کیساتھ میری پرورش کی ، خدا کرے کہ اس دنیا میں پھول کی طرح ہنستا مسکراتا رہے ۔ اس لئے کہ والدین اور استاد کے بعد وہ بھی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے ۔

دُعا کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ خدا کرے میرے دل کی کلی کھل کر ہنستے مسکراتے پھول میں بدل جائے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے جس قدر دعائیں کی ہیں وہ ایک مسافر کی التجا سمجھ کر شرفِ قبولیت حاصل کریں ۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ اقبال نے اس نظم میں جو دعائیں مانگیں وہ سب کی سب قبول ہوئیں ۔

غزلیاتِ حصّہ اوّل

(۹۸)

غزل نمبر ۱

حلِ لغات ہست و بود : مراد دنیا ۔ بیگانہ وار : اجنبی کی طرح ۔ شرار : چنگاری
دم دینا : دھوکا دینا ، فریب کرنا ۔ دید : نظارہ ۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت مطلع میں علامہ اقبال اِس جہانِ فانی کو ایک باغ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اِس گلشن کو اجنبیوں اور ناواقف لوگوں کی طرح نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ یہاں کی ایک ایک چیز اپنی دلچسپی اور رنگینی کے باعث اِس قابل ہے کہ اِس پر نہایت درجہ غور وخوض کیا جائے اور اُسے بار بار دیکھ کر لطف اندوز ہُوا جائے ۔

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے انسان تو اِس دنیا میں چنگاری کی مانند آیا ہے یعنی جس طرح چنگاری پل بھر کے لیے چمکتی ہے اور پھر معدوم ہو جاتی ہے، اسی طرح تیری زندگی بھی بہت کم اور مختصر ہے ۔ اِس لیے تجھے بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے ۔ ایسا نہ ہو کہ یہ فانی زندگی تجھے دھوکا دے جائے اور تو اس کے فریب میں آکر اپنے حقیقی مقصد سے غافل رہے ۔ حقیقی مقصد کے بارے میں علامہ اقبال نے کوئی اشارہ نہیں کیا اور ہر صاحبِ فہم کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی اپنی ترجیح کے مطابق اپنی مختصر سی زندگی کو اچھے سے اچھے انداز میں کام میں لانے کی کوشش کرے ۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس قابل نہیں کہ تجھے دیکھ سکوں لیکن تجھے میرے شوق اور میرے انتظار کی شدید کیفیت پر توجہ کرنا چاہیئے ۔ یہ شعر بیک وقت محبوبِ حقیقی اور محبوبِ مجازی دونوں سے خطاب ہو سکتا ہے ۔ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے تو بیشک حقیر و ادنیٰ ہے ہی لیکن محبوبِ مجازی کے سامنے بھی عشاق اپنے آپ کو حقیر و کمتر اور ناقابلِ توجہ ہی تصور کرتے ہیں ۔ ویسے

شعر کے زیادہ تر قرینوں کے باعث اِس شعر کا مخاطب اللہ تعالیٰ ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

؎ کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر تو اپنے محبوب کو دیکھنے کا سچا شوق رکھتا ہے تو پھر تجھے ایک ایک راستے میں اپنے محبوب کے نقشِ قدم نظر آ جائیں گے۔ مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ کو دیکھنے اور پانے کی تمنا سچی ہو تو انسان اِس کائنات کے ایک ایک مظہر میں اللہ کی قدرتوں کے حوالے سے اُسے دیکھ سکتا ہے۔

غزل ۲

(۹۸)

تعارف اِس غزل کے کل دس شعر تھے۔ چھ بانگِ درا میں شائع ہو گئے۔ باقی شعر قلمزد کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حلِ لغات تکرار: کسی بات کے تسلیم کرنے اور نہ ماننے پر جھگڑا اور بحث کا اصرار: ضد؛ عار: عیب، شرم، حیا؛ پیامی: پیغام لانے والا؛ تاڑنا: بھانپنا

؎ نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ۔ ۔ ۔

وضاحت اے محبوب اگر تم آنا نہیں چاہتے تھے تو بے شک نہ آتے۔ اِس لئے کہ تمھارے نہ آنے کے باعث اور ہماری بات نہ ماننے کی وجہ سے ہم آپ سے بحث اور جھگڑا تو ہرگز نہ کرتے لیکن اِس قدر تو آپ کر ہی سکتے تھے کہ آنے کا وعدہ کر لیتے اور اس میں کوئی رکاوٹ اور عیب و شرم کی بات بھی نہیں تھی البتہ اِس سے ہمیں کچھ اطمینان ہو جاتا۔ تقریباً اِسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں باندھا ہے۔ کہتے ہیں۔

؎ اُمید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

ے تمھارے پیامی نے سب راز کھولا ۔۔۔

وضاحت اس شعر میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا کچھ حصّہ مقدر ہے ۔ اور وہ یہ کہ شاعرو محبوب کے روابط جیسے کیسے چل رہے تھے مگر مکمل اخفاء کے ساتھ ۔ پھر اُن کا راز فاش ہو گیا جس سے محبوب کی رسوائی ہوتی ۔ محبوب کو یہ بات بُری لگی اور اس نے عاشق کو سخت سُست کہنا شروع کیا ۔ عاشق اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بیشک ہمارا راز، راز نہ رہا اور افشا ء ہو گیا لیکن اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ آپ کے پیغامبر پر عائد ہوتی ہے جس نے ہمارا راز لوگوں پر ظاہر کر دیا ۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں اور یوں خفگی کا حقیقی ہدف بھی میں نہیں بلکہ آپ کا قاصد ہی قرار پاتا ہے ۔

ے بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا ۔۔۔

وضاحت اے محبوب بیشک تیری آنکھیں نشیلی ہیں اور نشے سے سرمست و بے خود رہتی ہیں اس کے باوجود تجھ پر غفلت طاری نہیں ہوتی ۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ سرمستی و سرشاری کے باوجود تو نے بزم میں بیٹھے ہوئے بیشمار لوگوں میں سے اپنے عاشق کو پہچان لیا ہے ۔ محبوب نے اپنے عاشق کو پہچان کر اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ۔ شاعر نے اِس کی وضاحت نہیں کی ۔ بہرحال محبوب کی شخصیت میں ان متضاد خصوصیات کی موجودگی کا ذکر غالبؔ نے بھی کیا ہے ۔

ے سادگی و پرُکاری ، بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

ے تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد ۔۔۔

وضاحت شاعر نے محبوب کو بُلانے کے لئے قاصد بھیجا اور قاصد نے واپس آکر بتایا کہ محبوب نے آنے میں پس و پیش سے کام لیا اور وہ آنا نہیں چاہتا ۔ اِس پر شاعر کہتا ہے کہ میں تو سمجھ گیا کہ محبوب میرے گھر نہیں آنا چاہتا لیکن اے قاصد ذرا یہ بتاؤ کہ ان کے جواب دینے کا انداز کیا تھا ۔ غالباً اِس سوال کے جواب میں قاصد جو کچھ بتائے گا شاعر اس کی روشنی میں یہ اندازہ کرے گا کہ محبوب کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے یا نہیں ۔

ے کھنچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰ ۔۔۔

وضاحت اگر انسان واقعی اپنے مقصود کو پانے کا جذبہ رکھتا ہو تو اس جذبے کے خلوص و صداقت کی بدولت وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ اس کے لیے حضرت

موسیٰؑ کے کوہ طور پر جانے کے واقعے کو بطور مثال پیش کرتے ہیں کہ دیکھیے انھیں معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیوں کو کہاں دیکھا جاتا ہے لیکن چونکہ اللہ کے جلوے دیکھنے کا سچا شوق تھا لہٰذا وہ خود بخود کوہ طور تک پہنچ گئے اور انھیں اللہ تعالیٰ کا دیدار میسر آگیا۔

ے کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اقبال تیری گفتگو محض گفتگو نہیں تھی بلکہ اپنی تاثیر اور نتائج کے اعتبار سے اسے جادو قرار دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے باعث محبوب کی بزم میں ہر وقت تیرا تذکرہ رہنے لگا ہے۔

غزل ۳

(۹۹)

حل لغات واعظ : وعظ کہنے والا، نصیحت کرنے والا ؛ دینداری : پارسائی، نیکی ؛ عداوت : دشمنی ؛

ے عجب واعظ کی دینداری ہے یا رب ۔ ۔ ۔

وضاحت واعظ اور عام لوگوں کو نصیحت کرنے والے کی نیکو کاری اور پارسائی کی بھی عجیب صورت ہے۔ وہ مذہبی انسان ہونے اور نیک و پارسا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے صاف اور واضح احکام کے باوجود انسانوں سے محبت و مہربانی کی بجائے نفرت کرتا ہے۔ یعنی واعظ کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ مذہب کے بارے میں اسی طرح کا خیال اقبال نے ایک اور جگہ یوں پیش کیا ہے۔

ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ے کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں ۔ ۔ ۔

وضاحت دنیا کا کوئی بھی شخص خواہ وہ سائنسدان تھا یا شاعر، حکیم تھا یا فلسفی، غور و فکر اور سوچ بچار کے باوجود آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکا کہ انسان اس میں آنے سے پہلے کہاں اور کونسی دنیا میں ہوتا ہے اور پھر مرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے؟

۵ وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے ۔۔۔۔۔۔۔

وضاحت جس ہستی نے رات کو تاریکی اور اندھیرا عطا کیا ہے اُسی نے ستارے کو روشنی بخشی ہے۔ غالباً شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اس زندگی میں جس طرح اندھیرا اور اجالا دونوں اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اسی طرح غم واندوہ اور مسرت وشادمانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ ہیں۔ لہٰذا ہمیں غم واندوہ پر شکوہ وشکایت نہیں کرنا چاہیئے اور سب کچھ صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے۔

۵ ہم اپنی دردمندی کا فسانہ ۔۔۔۔۔۔۔

وضاحت مولانا غلام رسول مہر نے مطالب بانگ درا میں اس شعر کے دو معانی بیان کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہمیں اپنے دکھ درد کی کہانی میں اس قدر لطف آتا ہے کہ ہم اس کہانی کو اپنے ہمراز اور دوست کی زبانی سنتے اور خوش ہوتے ہیں۔ دوسرے معانی یہ ہیں کہ ہم اپنے صبر وضبط کے باعث اپنے غم واندوہ بھول جاتے ہیں۔ جب کبھی ہمارا رازداں گذری ہوئی باتوں کا ذکر کرتا ہے تو ہمیں یاد آتا ہے کہ ہم پر یہ سب ابتلائیں اور مصائب گذر چکے ہیں۔ شعر میں تیسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اپنے معاملات کو اپنے طور پر بے حد اخفا میں رکھتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح یہ معاملات لوگوں کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہمارا رازداں آکر ہم سے بیان کرتا ہے۔

۵ بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں ۔۔۔۔۔۔۔

وضاحت اقبال واعظ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عموماً اذان سنتے ہوئے وہ کانپنے لگتا ہے اور ہم اس کی یہ کیفیت اُس کی پارسائی اور پرہیزگاری کے سبب خیال کرتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واعظ بہت چالاک آدمی ہے اور اس کی کپکپاہٹ ایک چال کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تاکہ لوگ اُس سے متاثر ہوں

غزل ۴

۹۹

تعارف یہ غزل نومبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ مزید چھ شعر سرد رفتہ میں دیئے گئے ہیں۔

حل لغات **بیتاب**: مضطرب، بے چین۔ **تاڑا**: چُنا، منتخب کیا۔

ہفتاد و دو ملت : بہتر فرقے ۔ لوٹ جانا : تڑپنا ۔ بیتاب ہونا ۔ خرمن : کھلیان ، غلے کا انبار
ہم صفیر : ہم آواز ۔

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے ـ ـ ـ ـ

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اپنا آشیانہ بنانے کے لئے کہیں سے ایسے تنکے جمع کر لینے چاہئیں ، جنھیں پھونک ڈالنے کے لئے بجلیاں حد درجہ بے چین و مضطرب ہوں ۔ بظاہر بہت سادہ سا شعر ہے لیکن درحقیقت اِس شعر میں اقبال نے سکون پسند طبائع کی بجائے اُن شخصیات کی عکاسی کی ہے جو مصائب کو دعوت دینے اور نہایت پامردی سے اُن کا مقابلہ کرنے کی عادی ہوتی ہے ۔

والئے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے ـ ـ ـ ـ

وضاحت اقبال اپنی بد قسمتی کا ذکر کرتے ہوتے کہتے ہیں کہ میں نے جس شاخ پر گھونسلہ اور نشیمن بنانے کی کوشش کی ، آسمان نے اُسی شاخ کو توڑ کر درخت سے جُدا کر دیا ۔ یعنی نہ صرف میں اور میرا آشیانہ برباد ہوتے بلکہ اس شاخ کو بھی تباہی سے دوچار ہونا پڑا جس کو میں نے اپنا سہارا بنانے کی کوشش کی ۔ خیال رہے کہ اردو اور فارسی شاعری کی روایت میں آسمان کو ستم گر اور ظالم گردانا جاتا ہے ۔

آنکھ مِل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری ـ ـ ـ ـ

وضاحت اقبال نے اِس شعر میں غالباً بے تعصبی اور وسیع المشربی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر تُو تمام مذاہب اور فرقوں کے لوگوں کے ساتھ یکساں دریہ دیکھے تو دنیا کے تمام فرقوں کے ساتھ تجھے ہم آہنگی محسوس ہو گی اور تمام فرقے تجھے اپنے فرقے جیسے لگیں گے ۔

دل میں کوئی اِس طرح کی آرزو پیدا کروں ـ ـ ـ ـ

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ میں اپنے دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کرنا چاہتا ہوں جس کے فوراً بعد آسمان مجھے صفحۂ ہستی سے مٹانے اور فنا کر دینے کے درپے ہو جائے ۔ گویا اقبال کے نزدیک انسانی آرزوؤں کی عظمت ہی کے تناسب سے آسمان اور اہل دنیا انسان کی مخالفت کرتے ہیں ۔

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو ـ ـ ـ ـ

وضاحت اگر تجھے یہ شوق ہے کہ بجلی گرے اور تیرا سارا اثاثہ جلا کر خاکستر کر دے

تو پہلے تُو ایک ایک دانہ جمع کر کے خرمن کی صورت میں وہ اثاثہ تو پیدا کرلے۔ وہ اثاثہ فراہم ہو جائے گا تو کسی نہ کسی طرف سے بجلی بھی آجائے گی اور تیری آرزو کے مطابق سب کچھ جلا کر خاکستر کر دے گی۔

۷ پاس تھا ناکامیِ صیاد کا اے ہم صفیر ۔ ۔ ۔

وضاحت شعر پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے ایک پرندہ قفس میں قید ہے۔ اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ آخر تو نے ایک دانے کے عوض آزادی جیسی نعمت کیوں کھو دی۔ قیدی پرندہ جواب دیتا ہے کہ یقیناً میں ایک دانے کے عوض اپنی آزادی سے محروم ہونا پسند نہ کرتا لیکن میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ مجھے شکار کرنے والے کی ناکامی کا خیال تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ناکام و نامراد ہو۔

۸ اس چمن میں مُرغِ دل گاتے نہ آزادی کے گیت ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال ہندوستان کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہوتے کہتے ہیں کہ یہاں پر کسی کو آزادی کے نغمے نہیں الاپنے چاہئیں۔ اس لیے کہ اس سرزمین پر رہنے والوں کو آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ آزادی کے ترانوں پر کان نہیں دھرتے۔ اس کے علاوہ آزادی کے لئے جس نوعیت کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں یہ اُن کے لیے تیار نہیں۔ جس کی وجہ سے آزادی کے نغمے گانے والوں کو بالآخر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غزل ۵

(۱۰۰)

تعارف یہ غزل فروری ۱۹۰۳ء کے "خدنگِ نظر" میں شائع ہوئی تھی۔ سرودِ رفتہ میں اس غزل کے چار شعر درج کئے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے دو شعر ایسے ہیں جو بانگِ درا میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک شعر میں کچھ ترمیم کی گئی ہے جبکہ ایک شعر میں تو ترمیم بھی نہیں ہوئی۔

حل لغات حلقۂ دام ہوا: حرص و ہوس کا جال ؛ **خلعت** : لباس ؛ **بے مدعا**: خواہش کے بغیر، خواہشات سے خالی ؛ **صبر آزما** : صبر کی آزمائش کرنیوالا ؛ **خودنما** : اپنے آپ کو ظاہر کرنے والا ۔

؎ کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا ۔ ۔ ۔

وضاحت اِس شعر میں چمن سے مراد جنت ہے جہاں انسان کو پیدا کیا گیا ۔ جنت سے انسان کے نکلنے کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں کیا بتا سکتا ہوں کہ انسان کو اپنے حقیقی اور اصلی وطن یعنی جنت سے کیوں نکلنا پڑا اور جنت سے نکل کر دنیا میں آنے کے بعد انسان حرص و ہوس کے جال میں کیوں پھنس گیا ؟

؎ جائے حیرت ہے بُرا سارے زمانے کا ہوں میں ۔ ۔ ۔

وضاحت اشارہ ہے واقعہ امانت کی طرف جب تمام مخلوقات نے روزِ ازل خدا کی امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تو انسان نے اٹھا لیا ۔ اس پر خدا نے اُسے ظالم و جاہل کہا ۔ اقبال کہتے ہیں کہ انسان بُری اور ناپسندیدہ چیز ہے ۔ اس کے باوجود حیرت کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شرافت کا لباس عطا کیا ۔ مُراد یہ ہے کہ بُرا ہونے کے باوجود انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا تو یقیناً اِس کی کوئی خاص وجہ ہوگی ۔

؎ کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر ۔ ۔ ۔

وضاحت قرآن شریف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر پہنچے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنا جلوہ دکھلانے کی درخواست کی ۔ ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکار کیا گیا لیکن بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا جلوہ دکھا بھی دیا ۔ حضرت علامہ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو طے ہے کہ طور پر اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھنے کا معاملہ درپیش تھا اور اسی پر بحث و تکرار ہو رہی تھی ۔ لیکن پھر معلوم نہیں کیوں اور کن وجوہات کے باعث اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا جلوہ دکھا دیا ۔

؎ ہے طلب بے مُدعا ہونے کی بھی اک مدعا ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کا خیال ہے کہ انسانی دِل کسی صورت اور کسی حال میں بھی آرزوؤں اور خواہشات سے خالی نہیں ہو سکتا ۔ بالفرضِ محال اگر یہ کہا جائے کہ ہم اپنے لئے خواہشات سے خالی دل کے طلب گار ہیں تو اِس صورت میں بھی انسانی دل خواہشات سے

خالی نہیں۔ کم از کم یہ آرزو تو دل میں ہے کہ دل کو خواہشات سے خالی ہونا چاہیئے۔

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے ۔۔۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انسانوں کو قیامت کے دن اپنے دیدار سے مشرف کرے گا۔ اگر یہی کیفیت ہے تو یقیناً یہ وعدہ صبر کیلئے ایک سخت امتحان اور آزمائش ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل نظر اللہ تعالٰی کو اِس دنیا میں بھی دیکھ لیتے ہیں اس صورت میں دیکھا جائے تو اللہ تعالٰی کے وعدے کو صبر کی آزمائش کہنا چاہیئے۔

حسنِ کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی سینکڑوں پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ لیکن پھر اُس نے خود کو ظاہر اور نمایاں کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اللہ تعالٰی کی اس بے حجابی کا حقیقی سبب کیا ہے۔ اقبال خود ہی جواب دیتے ہیں کہ اصل میں اللہ تعالٰی کے اِس اظہار کا سبب اس کا مکمل حسن ہے اور وہ اپنے حسنِ کامل کے باعث ہی پردوں میں چھپا رہنے کی بجائے ظاہر ہو گیا ہے۔

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق ۔۔۔

وضاحت اے ہجر اور محبوب سے دوری کے درد! میرے چارہ گر اور علاج کرنے والے نے مجھے لاعلاج قرار دے دیا ہے اور کہا ہے کہ اب میرے درد کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ اس کی سادگی اور دیوانگی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاج کے غیر مؤثر ہو جانے کے بعد آخری علاج کی صورت میں موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اور یہ نسخہ استعمال کرتے ہی دردِ ہجر سمیت ہر مرض سے شفا ہو جاتی ہے۔

تُو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل ۔۔۔

وضاحت اے زمانے کے نشیب و فراز سے عبرت حاصل کرنے والی آنکھ کیا تو نے غور نہیں کیا کہ پھول مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ اِس کے باوجود یہ مٹیالا ہونے کی بجائے اس کی پتیاں مختلف دلکش اور دلآویز رنگوں کی حامل ہوتی ہیں۔ یعنی انسان برے ماحول میں رہ کر بھی اچھے اور پسندیدہ اخلاق سے مزین ہو سکتا ہے۔

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری

وضاحت اللہ تعالٰی علیم و بصیر ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

دنیا کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا اُسے علم نہ ہو۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ میرے اچھے یا بُرے اعمال اور اُن کی حقیقت سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ اس کے باوجود روزِ محشر بر پا کر کے مجھ سے میرے اعمال کے بارے میں سوال و جواب کئے گئے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو میرے اعمال کی خبر نہ تھی بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شرمندہ اور رسوا کرنا چاہتے ہیں۔

ے میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ میرا اور محبوب کا آمنا سامنا ہونے پر جو کچھ پیش آیا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ البتہ آمنا سامنا ہوتے ہی میں جس طرح مٹ گیا، وہ دیکھنے کی چیز تھی۔ یہ منظر کوئی دیکھتا تو لطف اندوز ہوتا، اس کے بیان میں کچھ لذت نہیں۔

غزل ۶

⑩

تعارف اس غزل کے نو شعر سرِ دست دیے گئے ہیں۔

حلِ لغات وضع: روش، انداز، ڈھنگ، طرز۔ سوزن: سوئی۔ خانماں: گھر بار

ے انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں ۔ ۔ ۔

وضاحت عشق کرنے والوں کا رنگ ڈھنگ اور اندازِ زندگی دنیا کے باقی انسانوں سے بالکل مختلف ہے اور اپنی طبیعت کے باعث یہ لوگ ساری دنیا سے بالکل الگ ہیں۔ معلوم نہیں کہ آخر یہ لوگ کس بستی اور کس علاقے کے رہنے والے ہیں۔ یعنی ان کا تعلق اسی دنیا سے ہوتا تو یہ بھی باقی لوگوں جیسے ہوتے۔ ان کا دوسروں سے مختلف ہونا ہی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کسی اور دنیا کے رہنے والے ہیں۔

ے علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں ۔ ۔ ۔

وضاحت میں اپنے دکھوں کا علاج کرنا چاہتا ہوں تو بھی علاج کے لیے ایسے طریقے

استعمال کرتا ہوں جن سے میری لذتِ درد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر مجھے اپنے پاؤں کے آبلوں میں چبھے ہوئے کانٹے نکالنا مقصود ہوں تو وہ بھی سوئی سے نکالتا ہوں جس سے مزید تکلیف ہوتی ہے لیکن اِس تکلیف میں بھی ایک لذت موجود ہے۔ غالب نے اِسی مضمون کو اس طرح بیان کیا تھا

ؔ زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

ؔ پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری امیدوں کا ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ! میری آرزوؤں کا گلشن ہمیشہ ہرا بھرا رہے۔ اس لئے کہ میں نے اِن آرزوؤں اور تمناؤں کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ یعنی ان کی پرورش اور حفاظت و نگہبانی میں بے انتہا محنت و مشقت برداشت کی ہے۔

ؔ رُلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی ۔ ۔ ۔

وضاحت میں رات کو آسمان پر ستاروں کو خاموش دیکھتا ہوں تو رونے لگتا ہوں، اِس سے اندازہ کر لیجئے کہ میرا عشق اور میری آہ وزاری ساری دنیا سے الگ ہے یا نہیں یعنی دوسرے عشاق تو محبوب کے مظالم اور ستم کی وجہ سے نالہ و فریاد کرتے ہیں لیکن میں اِس قدر حساس ہوں کہ ستاروں کی خاموشی پر بھی گریہ کناں ہو جاتا ہوں۔

ؔ نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی ۔ ۔ ۔

وضاحت شاعر اپنی بربادی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے کسی نے برباد نہیں کیا بلکہ برباد رہنے میں میں خود ایک لذت اور لطف محسوس کرتا ہوں جس کے حصول کے لیے میں خود ہی اپنے آشیاں بنا بنا کر جلاتا رہتا ہوں اور یوں میں نے اپنے سینکڑوں ہی آشیانے جلا ڈالے ہیں۔

ؔ نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال چنگاری سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آخر تو اس قدر جلد کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ آخر ہم انسان بھی تو بہت جلد ختم اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ اور یوں بھی اپنے ہمسفروں سے جدائی اچھی نہیں ہوتی۔ سب کو ساتھ مل کر چلنا چاہیئے۔ اس شعر میں اقبال نے انسان کے فانی ہونے اور بہت مختصر وقت کے لیے اِس دنیا میں آنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ؔ اُمیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو ۔ ۔ ۔

وضاحت واعظ اور ناصح حضرات بظاہر بہت سیدھے سادے اور شریف لگتے ہیں لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی نیکو کاری اور پرہیزگاری کا بھی ایک مقصد ہے اور وہ ہے جنت میں حوروں کا حصول ۔ اِس شعر میں اقبال نے واعظوں اور ناصحوں کی عام ریاکاری کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ غالب بھی کہتا ہے ۔

ؔ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ؔ میرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اقبال میرے شعر مجھے کیوں اچھے نہ لگیں ۔ یہ تو میرے ناکام و مایوس دل سے نکلنے والے نالوں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

غزل ۷

(۱۰۲)

اِس غزل کے سات شعر سرودِ رفتہ میں درج ہیں جن میں یہ مشہور مقطع بھی شامل ہے ۔

ؔ اقبال عشق نے مرے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

حلِ لغات واکرنا : کھولنا ، **منصور** : حسین بن منصور حلاج کی طرف اشارہ ہے ۔ لبِ گویا : بولنے والے ہونٹ ، **عذر آفریں** : بہانے کرنے والا ، اُڑ بیٹھنا : ضد کرنا ۔

ؔ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

وضاحت اے اللہ اگر کوئی شخص تجھے دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنی ظاہری آنکھ سے

تجھے کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ البتہ اگر وہ اپنے دل کی آنکھ کھول لے تو خدا کا نظارہ زیادہ مشکل نہیں اور اِس طرح وہ نظر آسکتا ہے۔

؎ منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر کسی کو عشق ہو جائے تو اسے اِس حد تک صبر وضبط سے کام لینا چاہیئے کہ اپنی زبان سے عشق کرنے کا دعویٰ بھی نہ کرے۔ اس لئے کہ اس کے دعویٰ کی وجہ سے نہ صرف اُس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ خود اس کی جان چلی جائے گی۔ اِس کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ منصور نے اللہ تعالیٰ سے عشق کیا اور وہ 'انا الحق' کہہ بیٹھا، اور یہی بات کہنے کے جرم میں اُسے سولی پر چڑھا دیا گیا۔

؎ ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ شعر مطلع کے مفہوم سے ملتے جلتے معنی رکھتا ہے۔ اِس شعر میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے اپنی آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔ اس لئے کہ آنکھیں کھلی رکھ کر اللہ کا دیدار ناممکن ہے۔ البتہ اگر ظاہری آنکھیں بند کر کے دل کی آنکھ کھول لی جائے تو انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا نظارہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

؎ میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن ۔ ۔ ۔

وضاحت میں عشق کی آخری منزل پر پہنچا ہوا ہوں اور تو حسنِ کامل کا مجسمہ ہے۔ اور اگر میں اور تو ایک ساتھ لوگوں کے سامنے ہوں تو دیکھنے والوں کو سخت مشکل پیش آجاتی ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ مجھے دیکھیں یا تجھے اپنی نظروں کا مرکز بنائیں۔

؎ عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست ۔ ۔ ۔

وضاحت محبوب یعنی اللہ تعالےٰ کا حسن محبت وعشق کے جرم کے مختلف بہانے تراش رہا ہے۔ یعنی مواقع پیدا کر رہا ہے اور ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اللہ تعالےٰ سے میری محبت شدید ہوتی جا رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کے باوجود قیامت کے دن اللہ تعالےٰ محبت کرنے کا کوئی اور بہانہ پیدا نہ کر دیں۔ وہ بہانہ یقیناً بے حجاب دیدارِ عام ہی ہو سکتا ہے۔

؎ چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق، ہم نشیں ۔ ۔ ۔

وضاحت اے میرے قریب بیٹھے ہوئے ساتھی! میں جس طرح محبوب کو دیکھتا ہوں، وہ

محبت کی نظر ہے اور محبت کی نظر چھپ نہیں سکتی ہمیشہ پہچان لی جاتی ہے جس کے سبب رسوائی ہوتی ہے اور محبوب خفا ہو جاتا ہے تو مجھے بتا کہ اگر دیکھنے کا یہ انداز مناسب نہیں ہے تو پھر محبوب کو کس طرح دیکھنا چاہیے۔

؎ اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم ۔ ۔ ۔

وضاحت حضرت موسیٰ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ جب انھوں نے بہت زیادہ اصرار اور ضد کر کے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تو جلوۂ خداوندی دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر ان میں اتنی ہی طاقت تھی تو پھر انھوں نے اللہ کا جلوہ دیکھنے کے سلسلے میں اس قدر ضد اور اصرار کیوں کیا اور یہ خواہش کیوں کی۔ مطلب یہ ہے کہ خواہش ہمت اور صلاحیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

؎ نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت حسن کا دیدار کرتے ہوئے عاشق پلک بھی جھپکنا نہیں چاہتا۔ ایسے میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نرگس کی طرح کھلی آنکھوں سے مسلسل دیکھا جائے۔ نرگس کو شعراء عموماً آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں جو نظارے میں محو ہونے کے باعث ایک ہی جانب دیکھتی رہتی ہے۔

؎ کھُل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر محبوب دو چار روز کے لیے میرے عشق میں گرفتار ہو جائے اور وہ اِسی طرح میری تمنا کرنے لگے جس طرح میں اُس کی آرزو میں مبتلا ہوں تو اُسے معلوم ہو جائے کہ عشق میں کس طرح کا لطف ہے۔ یہاں "مزے" کا لفظ طنزیہ مفہوم میں استعمال ہُوا ہے۔

غزل ۲

(۱۰۲)

تعارف یہ غزل ۱۹۰۳ء میں مخزن کے ایک شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ نظرثانی میں اِس کے گیارہ شعر قلمزد کر دیئے گئے تھے جو سرودِ رفتہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

حلِ لغات آرزو تے بے دلی: یہاں مراد ہے دل کے جانے کی آرزو، عاشق

ہونے کی خواہش ؛ سودائے زیاں : نقصان اور خسارے کا کاروبار ؛ ہوائے گل : گلستان کی سیر کی خواہش ؛ چمن افروز : گلستان کو رونق بخشنے والا ؛ رحیل : روانگی ؛ عقدہ : گرہ ؛

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے ـــ ـــ ـــ

وضاحت میں کیا بتاؤں کہ مجھے اپنے دل کے جانے یعنی عشق اختیار کرنے کا کسقدر شوق ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے آرزوؤں اور تمناؤں کا جو بازار سجا رکھا ہے اس کی تمام تر رونق اُس وقت تک ہے جب تک میں کوئی نقصان اور خسارے کا کاروبار نہیں کر لیتا۔ جیسے ہی خسارے کا لین دین ہوا اور میرا دل گیا تو میرے بازار کی رونق بھی ختم ہو جائے گی۔ ویسے بھی ہر بازار اور دکان کی رونق اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک کاروبار میں منافع ہوتا ہے۔

وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں ـــ ـــ ـــ

وضاحت شاعر گلستان کی سیر کر رہا ہے لیکن کہتا ہے کہ مجھے سیر گلستاں کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو صرف اُس وقت تک سیر گل کیا کرتا ہوں جب تک میرا ماہر بال شراب پلانے والا نہیں آتا۔ جیسے ہی وہ آئے گا اور شراب پلانا شروع کر دے گا تو بہت زیادہ شراب پینے کے باعث میرا چہرہ سرخ ہو کر پھولوں کا سا رنگ و روپ اختیار کر لیتا ہے اور ایسے میں پھول دیکھنے اور گلستان کی سیر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک ـــ ـــ ـــ

وضاحت صیاد باغ کو صرف اتنی دیر تک رونق بخشے گا جب تک میں نغمے گا رہا ہوں، پھر وہ مجھے گرفتار کر کے باغ سے چلا جائے گا۔ یعنی اس کا مقصد محض میری گرفتاری ہے۔ اسی طرح بجلی بھی صرف میرا نشیمن اور گھونسلا جلا دینے کے لیے بے چین و مضطرب ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں مجھ پر ہر قسم کی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔

وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں ـــ ـــ ـــ

وضاحت میں اگرچہ مٹھی بھر خاک اور مٹی سے بنا ہوں لیکن اگر میں بکھر جاؤں تو صحرا کی وسعت پانے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ آپ میری وسعت کے بارے میں سوال نہ کریں اور اس کا اندازہ صرف اس امر سے کر لیں کہ میں زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا ہوں۔ اس شعر میں انسان کی بے پایاں صلاحیتوں کی طرف اشارہ ہے۔

ہ جرس ہوں، نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ وپے میں ۔۔۔۔

وضاحت میں گھنٹی ہوں اور میرے رگ و پٹھے میں نالے اور آہیں سو رہی ہیں۔ آپ میری ظاہری خاموشی سے دھوکا نہ کھائیں۔ میں تو صرف اُس وقت تک خاموش ہوں جب تک کارواں بکھرا ہوا ہے۔ جونہی قافلہ روانہ ہونے والا ہوگا تو میں بھی نالہ و فریاد میں مصروف ہو جاؤں گا۔ مراد یہ ہے کہ قوم میں بیداری کے ذرا سے آثار پیدا ہوتے تو میں بھی نالہ و فریاد میں مصروف ہو جاؤں گا۔

ہ سکونِ دل سے سامانِ کشود کار پیدا کر ۔۔۔

وضاحت اگر تم اپنے لیے آسانیاں چاہتے ہو تو اطمینانِ قلب پیدا کرو۔ دیکھو کہ پانی میں بھنور اُسی وقت تک پڑتے رہتے ہیں جتنی دیر تک وہ بہتا رہتا ہے۔ اگر وہ بہنا چھوڑ دے تو بھنور بھی ختم ہو جائیں۔ اسی طرح اگر تم سکون اختیار کرو گے تو پریشانیاں بھی از خود ختم ہو جائیں گی۔

ہ چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل ۔۔۔

وضاحت اے بلبل محبت کے گلستان میں خاموشی کا دوسرا نام موت ہے۔ یہاں تو ہر عاشق اُسی وقت تک عاشق ہے جب تک وہ نالہ و فریاد کی رسم کو پورا کرنے میں سرگرم رہتا ہے۔

ہ جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی، لطفِ تمنا بھی ۔۔۔

وضاحت جب تک میں جوان ہوں اُس وقت تک محبوب کو دیکھنے کا ذوق وشوق بھی موجود ہے اور اس کی تمنا کرنے میں لطف و لذت بھی۔ گویا جب تک ہمارے گھر میں مہمان موجود ہے اُس وقت تک گھر کی رونق بھی قائم ہے۔ دوسرے مصرع میں جوانی کو مہمان قرار دیا گیا ہے۔

ہ زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی ۔۔۔

وضاحت میں پوری دنیا میں بدنام و رسوا ہو چکا ہوں لیکن میری سادگی دیکھئے کہ اب تک یہی سمجھتا ہوں کہ میرے عشق کا راز میرے رازداں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

اصل میں یہ رازداں پر بڑی گہری طنز ہے۔ غالب نے بھی کہا تھا ہ

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اِس محبت کو!

نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

غزل ۹

(۱۰۳)

تعارف یہ غزل جنوری ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں تین شعر قلمزد کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حلِ لغات ظلمت خانۂ دل : دل کا تاریک گھر۔ **مذاقِ جبہ سائی** : سجدہ کرنے کی لذت۔ ناخدا : ملاح۔ **ناز آفریں** : عشوے پیدا کرنے والا مراد محبوب' اللہ تعالیٰ؛ شمع کشتہ : بجھی ہوئی شمع۔ **ید بیضا** : سفید ہاتھ۔ حضرت موسیٰؑ کے معجزے کی طرف اشارہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آستین سے ہاتھ نکالتے تو وہ انتہائی روشن اور سفید ہوتا۔ **نگاہِ نارسا** : حقیقت تک نہ پہنچ سکنے والی نظر۔ **ما عرفنا** : یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو اس طرح نہ پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا۔ **باریک بیں** : گہرائی میں جا کر دیکھنے والے فلسفی۔ **قرینہ** : سلیقہ، ڈھنگ، طریقہ۔ **نکتہ چیں** : تنقید کرنے والا، نقائص نکالنے والا۔

؎ جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں ۔۔۔

وضاحت جنھیں میں آسمانوں اور زمینوں میں تلاش کرتا رہا وہ مجھے اپنی ذات سے باہر کسی مقام کی بجائے میرے اپنے دل کے تاریک اور اندھیارے گھر میں ملے۔ اس شعر میں اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے دل میں رہتا ہے۔

؎ حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی

وضاحت جب مجھ پر اپنی حقیقت اور اصلیت ظاہر ہوئی تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے۔

؎ اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی سے ۔۔۔

وضاحت اگر خانہ کعبہ کے دروازے پر لگا ہوا پتھر سجدے کرنے کی لذت سے واقف ہوتا تو پھر وہ بھی کعبے کے دروازے کا پتھر بنے رہنے کی بجائے اُن میں شامل ہو جاتا جو خانہ کعبہ کو سجدے کرتی رہتی ہیں۔

؎ کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے مجنوں کیا تو نے کبھی اپنی حقیقت اور اصلیت پر غور کیا ہے ؟ اگر تو ایسا کر لے تو تجھے معلوم ہو جائے کہ تو بھی لیلیٰ کی طرح محمل میں چھپا ہُوا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو پوری طرح نہیں پہچان سکتا ۔

؎ مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اس شعر میں علامہ اقبال نے عاشق کے نقطہ نظر سے وصل اور فرقت کے زمانے میں فرق واضح کیا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ وصال کے مہینے بھی ہوں تو لمحوں کی طرح بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں اور اگر عاشق اپنے محبوب سے دور ہو تو تکلیف اور درد کے احساس کے باعث فرقت میں گزرنے والے لمحے بھی مہینوں کی طرح طویل ہو جاتے ہیں ۔

؎ مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے ملاح تو مجھے ڈوبنے سے کس طرح روکے گا ؟ زیادہ سے زیادہ تو یہ کرے گا کہ مجھے سمندر میں نہیں کودنے دے گا لیکن تجھے شاید یہ معلوم نہیں کہ جن کی قسمت میں ڈوبنا ہو وہ کشتی میں بیٹھے بٹھائے بھی ڈوب جاتے ہیں ۔

؎ چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت جس ہستی یعنی اللہ تعالےٰ نے اپنا حسن اپنے کلیم یعنی حضرت موسیٰؑ سے بھی چھپا کر رکھا تھا وہی عشوے اور ناز پیدا کرنے والا دنیا بھر کے ناز کرنے والوں میں اپنے جلوے دکھا رہا ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھنے کے لئے لازم نہیں کہ کوہِ طور پر ہی جایا جائے ۔ دیکھنے والی نگاہیں اُسے ہر چیز میں دیکھ لیتی ہیں ۔

؎ جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ تیرے عاشقوں کے سینے میں آخر کون سی قوت چھپی ہوتی ہے کہ ان کی پھونک سے بجھی ہوئی شمع بھی جل اٹھتی ہے ۔ حالانکہ پھونک سے تو شمع کو بجھنا چاہیئے لیکن وہ جل اٹھتی ہے اور یہی اصل کمال ہے ۔

؎ تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر تو دل کے درد کی خواہش رکھتا ہے اور یہ دولت پانا چاہتا ہے تو اللہ والوں کی خدمت کر ۔ یہ موتی ایسا نہیں ہے جو بادشاہوں کے خزانوں میں مل سکے ۔

ہ نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو ۔ ۔ ۔

وضاحت موٹا جھوٹا لباس اور گدڑی پہننے والوں کی کیفیت نہ پوچھ ۔ اگر ان سے عقیدت و محبت ہو تو ان کو غور سے دیکھنا چاہیئے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی آستینوں میں معجزے چھپائے بیٹھے ہیں یعنی انتہائی صاحبِ کرامت لوگ ہیں ۔

ہ ترستی ہے نگاہِ نارسا جن کے نظارے کو ۔ ۔ ۔

وضاحت حقیقت تک نہ پہنچ سکنے والی آنکھیں جن مناظر کو ترس رہی ہیں وہ تمام مناظر جو درحقیقت اس دنیا کی رونق اور چہل پہل کا سبب ہیں ، انہی تارک الدنیا بزرگوں کے باعث دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے ۔

ہ کسی ایسے شررسے پھونک اپنے خرمنِ دل کو ۔ ۔ ۔

وضاحت اپنے دل کی کھیتی کے حاصل اور کھلیان کو کسی ایسی چنگاری سے جلا کہ قیامت کے دن روشنی و حرارت پیدا کرنے والا یہ سورج بھی تجھ سے فیض حاصل کرنے کی خواہش کرے ۔

ہ محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا ۔ ۔ ۔

وضاحت محبت کے لیے کوئی ایسا دل تلاش کر جو ٹوٹ سکے ۔ اس لیے کہ محبت ایسی شراب ہے جو بہت ہی نازک اور جلد ٹوٹ جانے والے برتنوں میں رکھی جاتی ہے ۔ یعنی محبت حساس دلوں میں ہی گھر بناتی ہے ۔

ہ سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق ۔ ۔ ۔

وضاحت اے دل ! کیا دنیا کی خوبصورت ہستیوں میں کوئی ایسی خوبصورت ہستی بھی ہے جس کے حسن کا عاشق خود بھی سر سے پاؤں تک حسین ہو جاتے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ایسی ہستی ہے ۔

ہ پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ نعت کا شعر ہے ۔ شعر میں کہا گیا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے یہ فرمایا کہ ہم نے خدا کو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح اُسے پہچاننے کا حق تھا تو یہ اظہار عجز اللہ تعالیٰ کو بہت بھایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا مقام و مرتبہ دنیا بھر کے خوبصورت لوگوں سے بڑھا دیا ۔

؎ نمایاں ہو کے دِکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ شعر بھی نعت کا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے رسول اللہؐ : دنیا کے فلسفی ایک عرصے سے آپؐ کی ذاتِ صفات اور کمالات کے بارے میں غور و فکر کر رہے ہیں ۔ لیکن حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ اب آپؐ انہیں اپنا جلوہ دکھا دیجئے ۔ حقیقتِ حال ان کی سمجھ میں آجائے گی ۔

؎ خموش اے دل بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا ۔ ۔ ۔

وضاحت اے دل تو درد و غم کی شدت کے باعث نالہ و فریاد کر رہا ہے ۔ حالانکہ تجھے بالکل خاموش رہنا چاہیئے ۔ اس لیے کہ دکھ اور تکلیف کے باوجود محبت کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ادب کا ڈھنگ جانتا ہو ۔ میر تقی میر نے مندرجہ ذیل اشعار میں تقریباً یہی بات کہی ہے ۔ ؎

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تلک آئے تھے

؎ دور بیٹھا غبارِ میرؔ اُن سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

؎ بُرا سمجھوں انہیں ؟ مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اقبال ! کیا میں اپنے ناقدین اور معترضین کو بُرا کہنے لگوں ۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا ۔ اس لیے کہ میں خود بھی تو اپنا ناقد اور نکتہ چیں ہوں ۔

غزل نمبر

(۱۰۵)

تعارف یہ غزل جنوری ۱۹۰۴ء مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔ نظرِ ثانی میں دس شعر حذف کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں شائع ہو چکے ہیں ۔

حلِ لغات **وعدۂ بے حجابی :** پردے اٹھا دینے کا وعدہ ۔جلوہ دکھانا ۔ **صبر آزما :** صبر و ضبط کا امتحان لینے والا ۔ **لن ترانی :** وہ جواب جو کوہِ طور پر حضرت موسےٰؑ کی طرف سے دیدار کے تقاضے کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے دیا تھا یعنی تو نہیں دیکھ سکتا ۔

تِرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔

وضاحت اے محبوب میں یہ چاہتا ہوں کہ ترے عشق کی آخری حد تک پہنچوں ۔یعنی تمہارے عشق کی آخری سطح کو چھُو لوں ۔ گو بظاہر یہ ایک ناممکن بات ہے لیکن میری سادگی ملاحظہ کریں کہ میں یہی خواہش رکھتا ہوں ۔

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی ۔ ۔ ۔

وضاحت مَیں آپ کی طرف سے کوئی ایسی بات چاہتا ہوں جو میرے صبر و ضبط کا امتحان لے اِس کے لیے خواہ مجھ پر مظالم توڑے جائیں اور خواہ مجھ سے ملنے اور جلوہ دکھانے کا وعدہ کیا جائے گویا شاعر کے نزدیک دونوں صورتیں اپنی کیفیت کے اعتبار سے یکساں نوعیت کی ہیں ۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو ۔ ۔ ۔

وضاحت اے محبوب میں جنت کا طلب گار نہیں ہوں ۔ بیشک یہ اُن کو مل جائے جو اس کے لئے زحمت اٹھاتے اور اس کے لیے تکلیفیں اٹھاتے ہیں ۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے کا خواہاں ہوں ۔یعنی میرے لئے خدا کا دیدار ہی سب کچھ ہے ۔

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ میرا دل چھوٹا سا ہے لیکن اِس قدر شوخ ہے کہ تمھاری طرف سے بار بار ملنے اور جلوہ دکھانے سے انکار سننا چاہتا ہے ۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اہل دنیا ! میں تم لوگوں میں اُس مہمان کی طرح ہوں جو بہت تھوڑی دیر کیلئے آیا ہو ۔ میں اُس چراغ کی مانند ہوں جو صبح کے وقت جل رہا ہو ۔یعنی صبح کی روشنی تھوڑی سی اور پھیلے گی تو اُسے گل کر دیا جائے گا ۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی ۔ ۔ ۔

وضاحت اے محبوب وہ باتیں جنھیں تو عام لوگوں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں میں نے وہ بھی برملا اور سب کے سامنے کہہ دی ہیں اور یہ ایسی گستاخی ہے جس پر مجھے سزا

ملنی چاہیئے۔ گویا شاعر نے یہ گستاخی صرف اِس لیے کی ہے کہ اُسے سزا ملے اور وہ سزا سے لطف اندوز ہو۔

غزل ۱۱

(۱۰۶)

تعارف یہ غزل جون ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں پانچ شعر قلمزد کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حل لغات کشادہ : کھلا ہوا۔ بے نیاز : بے پروا، بے تعلق، عاجزی نہ کرنے والا مراد اللہ تعالےٰ۔ احتراز : پرہیز، دور رہنا۔ رند : شراب پینے والا۔ مدام : ہمیشہ۔ گداز : پگھلانا۔ حجاز : سعودی عرب کا ایک صوبہ جس میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔

ے کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے ۔ ۔ ۔

وضاحت جب اللہ تعالےٰ مہربانی کا برتاؤ کرے تو عاجزی کرنے والے لوگ اپنے عجز پر کیوں فخر و غرور نہ کرنے لگیں۔

ے بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے واعظ تو جس انداز میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اُس سے یہ گمان گذرتا ہے جیسے اللہ تعالےٰ عرش پر رہتا ہے۔ جبکہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ آخر اللہ کا یہ کیسا تصور ہے جس کے مطابق اللہ تعالےٰ کو اپنے بندوں اور اپنی مخلوق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ے مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی ۔ ۔ ۔

وضاحت اے ساقی میں اس شخص کو شراب پینے والا مان ہی نہیں سکتا جو مستی اور ہوش کی کیفیت میں تمیز کر سکتا ہو۔ یعنی شراب نوش تو وہ ہے جو ہمہ وقت مستی و سرشاری کی حالت میں رہتا ہو۔

ے مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا ۔ ۔ ۔

وضاحت تجھے چاہیئے کہ ہمیشہ اپنے دل کی طرف متوجہ رہے اور اپنے کان اس کی طرف

لگاتے رکھے۔ اِس لئے کہ دل ایک ایسا سانہ ہے کہ اگر یہ ٹوٹ جائے یعنی ناکام و مایوس ہو جائے تو پھر اسرارِ حیات و کائنات کو کھولنے لگتا ہے۔ یعنی ناکامیاں ہی اسرارِ حیات سکھاتی ہیں۔

ے کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت واعظ اور دین کا پرچار کرنے والے اکثر کہا کرتے ہیں کہ جس شخص کے عمل اچھے نہ ہوں گے وہ بخشا نہ جائیگا۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ اور بندے کا معاملہ ہے اور اللہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ چاہے تو گناہگار انسان کو بھی بخش دے۔ بھلا واعظ سے پوچھو تو سہی کہ اگر اللہ تعالےٰ اپنے گناہگار بندوں کو بھی بخش دے تو اِس میں تیرا کیا نقصان ہے۔

ے سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ آخر شعر و شاعری میں سوز و غم کی کیفیات کس طرح پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تو وہ کیفیات ہیں کہ انسان تو انسان پتھر کو بھی پگھلا دینے کی قوت رکھتی ہیں۔

ے تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل ۔ ۔ ۔

وضاحت بلبل گلاب کے پھول کی عاشق ہے اور جب یہ پھول مرجھا جاتے ہیں تو بلبل گلاب کے پھولوں کے ہجر میں آہ و زاری کرتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ بلبل کو یہ تکلیف اِس لئے اٹھانا پڑتی ہے کہ وہ مختلف پھولوں میں فرق اور امتیاز کرتی ہے۔ اُسے ایک پھول سے شدید محبت ہے اور دوسرے پھول سے وہ بالکل بے تعلق ہے۔ اگر بلبل کو تمام پھولوں سے یکساں محبت ہوتی تو اُسے آہ و زاری نہ کرنا پڑتی۔ اقبال اِس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان کو اِس دنیا کی مختلف اشیا میں تمیز اور فرق نہیں کرنا چاہیئے۔ اور بلا تفریق سب سے محبت کرنی چاہیئے۔

ے غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت واعظ کو اپنے زہد اور عبادت پر حد درجہ فخر و غرور ہے اور اس وجہ سے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ قیامت کے دن وہ ضرور بخشا جائے گا۔ جبکہ باقی لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے سزا پائیں گے۔ اِس فخر و غرور اور تکبر کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں پر طنز و تعریض کرتا اور ان کی دلآزاری کا باعث بنتا ہے۔

ے ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت خدا کرے کہ کوئی ایسی ہوا چلے کہ میں حجاز یعنی مکہ و مدینہ منورہ کے راستے کا غبار بن جاؤں۔ مطلب یہ کہ خدا کرے کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ میں حجاز پہنچ جاؤں۔

غزل ۱۲

(۱۰۷)

تعارف یہ غزل دسمبر ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظر ثانی میں اِس کے آٹھ شعر قلمزد کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں موجود ہیں۔

حلِ لغات جلوہ پیرائی: نظارہ دکھانا، سامنے آنا؛ نمود: ظاہر ہونا؛ غوطہ زن: ڈبکی لگانے والا؛ خزف چیں: کنکر چننے والا۔

سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں ـ ـ ـ

وضاحت دل میرا دوست ہے اور غیر ظاہر ہے کہ دشمن۔ لیکن میری عجیب حالت ہے کہ میں اپنے دل پر سختی کرتا ہوں اور اِس کی آرزوئیں پوری نہیں کرتا اور رقیبوں کی دشمنی سے بھی مکمل طور پر غفلت برتتا ہوں ایسے میں اگر مجھے ظالم اور جاہل کہا جائے تو یہ بہت عمدہ بات ہے۔ بعض شارحین کے نزدیک اِس شعر میں تخلیقِ کائنات اور انسان کی طرف سے بار نیابت سنبھالنے کے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی ـ ـ ـ

وضاحت علامہ اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں اُسی وقت تک موجود رہ سکتا تھا جب تک اللہ تعالیٰ کا جلوہ ظاہر نہ ہوا تھا۔ جب وہ ظاہر ہو گیا تو میرا وجود ختم ہو گیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو میرا وجود اُس باطل کی مانند ہے جو حقیقت اور سچائی کے ظاہر ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست ـ ـ ـ

وضاحت جو لوگ علم کے دریا میں اترے اور ڈوب گئے وہ تو اپنے ہاتھوں میں موتی لے کر دریائے علم سے باہر آئے جبکہ میری محرومی دیکھئے کہ میں دریائے علم کے کنارے کھڑا کنکر پتھر چننے میں مصروف ہوں۔

ہے میری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل ۔ ۔ ۔

وضاحت

علامہ اقبال نے اِس شعر میں انسان کی غفلت اور اس کی عظمت کا تقابل کیا ہے ۔ اِنسان کی غفلت کی انتہا یہ ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی جس کی پاداش میں اسے جنت سے نکلنا پڑا ۔ اِس سے انسان کی اس قدر ذلت اور رسوائی ہوتی کہ خود فرشتوں نے بھی اس پر افسوس کیا اور آنسو بہائے اور یہی بات انسان کی عظمت اور شرافت کو ثابت کرتی ہے ۔ یعنی یہ اِس قدر عظیم ہستی ہے کہ اگر یہ غفلت برتنے اور غلطی کرے تو فرشتے بھی افسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

بزمِ ہستی ! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو ۔ ۔ ۔

وضاحت

اے دنیا تو اپنی سجاوٹ اور آرائش پر فخر و ناز نہ کر ۔ اس لیے کہ تیری حیثیت محض ایک بے جان تصویر کی ہے جبکہ اس کی اصل رونق تو میری یعنی انسان کی وجہ سے ہے ۔

اقبال کے اِس شعر کو دیکھیئے تو اِس شعر میں اقبال کی ایک نظم 'انسان اور بزمِ قدرت' کی روح کار فرما نظر آتی ہے اور یہ شعر بھی اقبال کے تصورِ خودی کے بنیادی نقش و نگار پیش کرتا ہے ۔

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو ۔ ۔ ۔

وضاحت

میں خود ہی اپنے آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اور اس طرح دیکھا جائے تو میں خود ہی مسافر ہوں اور خود ہی اپنی منزل بھی ہوں ۔

غزل ۱۳

(۱۰۷)

تعارف

یہ غزل مئی ۱۹۰۵ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔ نظرثانی میں اِس کے دو شعر قلمزد کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں درج ہیں ۔

حلِ لغات

مراد : مقصود ؛ عقبیٰ : آخرت ؛ خامہ : قلم ؛ مدار : انحصار

سوالِ مکرر : دوبارہ سوال کرنا

ے مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت مجنوں نے عشق سے مجبور ہو کر شہر چھوڑ دیا تھا اور وہ صحراؤں میں رہنے لگا تھا اگر تم عشق اختیار کرتے ہو تو تمہیں شہر کے ساتھ ساتھ صحرا بھی ترک کر دینا چاہیئے اور اگر تم اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے ہو تو پھر لیلیٰ یعنی ہر طرح کے دنیوی محبوب کا تصور بھی اپنے ذہن سے نکال دو۔ اِس کے بغیر اللہ تعالیٰ کی قربت ناممکن ہے ۔

ے واعظ ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے نصیحت اور واعظ کہنے والے ! عشق کی دنیا میں ہر طرح کی خواہشوں اور آرزوؤں سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد ہی منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے ۔ اس لئے اگر تُو نے عشقِ خداوندی میں دنیا سے متعلق خواہشات ترک کر دی ہیں تو پھر آخرت اور وہاں پر جزا سزا کے لالچ اور خوف کو بھی خیر باد کہہ دے اور کسی توقع کے بغیر نہایت اخلاص سے اللہ کی عبادت کر ۔

ے تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی ۔ ۔ ۔

وضاحت تقلید اور پیروی کرنے سے بہتر ہے کہ انسان خودکشی کر لے ۔ دنیا میں جینے کا بہتر ین ڈھنگ یہی ہے کہ انسان اپنا راستہ خود تلاش کرے اور اِس ضمن میں حضرت خضرؑ تک کو پانے اور راہنما بنانے کا جنون ترک کر دے ۔

ے مانندِ خامہ تیری زباں پہ ہے حرفِ غیر ۔ ۔ ۔

وضاحت اِقبال کہتے ہیں کہ قلم کس قدر خوبصورت حرف والفاظ لکھتا ہے لیکن اِس میں اس کا کوئی کمال نہیں ہے ۔ یہ تو لکھنے والے کا کمال ہے ۔ قلم جو کچھ لکھتا ہے اُسکی مرضی سے لکھتا ہے ۔ تو قلم کی روش اختیار نہ کر اور دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر غیر ضروری فخر و غرور نہ کر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا ۔

ے لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دِل میں دردِ عشق ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر دل میں درد نہ ہو تو شعر میں بھی سوز و ساز کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی ۔ اِس صورت حال میں یہی مناسب ہے کہ اگر ایک آدمی زخمی نہ ہو تو اسے تڑپنا بھی نہیں چاہیئے ۔ دراصل اقبال اِس شعر میں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ شاعری کو صحیح معنوں میں شاعر کی ترجمانی کرنی چاہیئے ۔

۵ شبنم کی طرح پھولوں پہ رو اور چمن سے چل ۔ ۔ ۔

وضاحت اِس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان کو اِس دنیا میں اپنا دل نہیں لگانا چاہیئے اِس لئے کہ یہاں پر اس کا قیام چند روزہ اور محض عارضی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح شبنم بہت تھوڑے وقت کے لئے گلشن اور پھولوں پر آنسوؤں کی صورت میں گرتی اور پھر اُڑ جاتی ہے ، تجھے بھی اِس دنیا میں اسی طرح جینا چاہیئے اور اِس کائنات میں ہمیشہ رہنے کا جنون ترک کر دینا چاہیئے ۔

۵ ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ عشق کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ مذاہب اور عبادت گاہوں کے معاملے میں فرقہ واریت کا قائل نہیں ہوتا ۔ اگر تو بھی عشق کا دعویٰ کرتا ہے تو بت کدے ، کعبے اور کلیسا کے اختلافات بھول کر ان سب سے الگ ہو جا ۔

۵ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے حقیقتِ حال سے بے خبر انسان تو خدا کی عبادت یہ سوچ کر کرتا ہے کہ اس کے بدلے تجھے انعام ملے گا اور تو جنت میں چلا جائے گا ۔ لیکن اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہوگا کہ یہ تو تجارت ہوتی اور عبادت تجارت کی طرح نہیں کی جاتی ۔ اگر تو عبادت کرتا ہے تو جزا اور انعام کی امید نہ رکھ ۔

۵ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ بہت اچھی اور مستحسن بات ہے کہ دل اور عقل ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہیں اور انسان کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ہمت و بہادری کے علاوہ اپنی عقل سے بھی اُس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کے بارے میں مشورہ کرے ۔ لیکن زندگی کے ہر موڑ پر عقل کے مشورے مفید اور کافی نہیں ہوتے اور انسان کو اپنے جذبے پر انحصار کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے ۔ لہٰذا ایسے مقامات پر عقل کے مشورے نظر انداز کر دینے چاہئیں ۔

۵ جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال نے شہرت اور ناموری کو دوسروں کا محتاج قرار دیا ۔ اس لیے کہ شہرت دوسروں ہی کی زبان و قلم سے ہوتی ہے اور یوں مشہور آدمی دوسروں کی وجہ سے مشہور ہوتا ہے ۔ لہٰذا اقبال کہتے ہیں کہ ایسی زندگی بے معنی ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ انسان شہرت

حاصل کرنے کی بجائے اپنے عمل کی اچھائی اور بہتری پر توجہ کرے۔

؎ شوخی سی ہے سوال مکرر میں اے کلیم ۔۔۔

وضاحت اے حضرت موسیٰؑ! تم نے کوہِ طور پر جاکر اللہ تعالےٰ سے جلوہ دکھانے کا تقاضا کیا۔ اللہ تعالےٰ نے اس سے انکار کر دیا۔ تم نے اللہ کی رضا کے مطابق سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے بہ اصرار دوبارہ سوال کیا، حالانکہ دوبارہ سوال کرنا بے ادبی کے زمرے میں شامل ہے جو نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ یعنی اگر اللہ تعالےٰ اپنا جلوہ نہیں دکھانا چاہتا تھا تو تمھیں دوبارہ سوال نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

؎ واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں ۔۔۔

وضاحت صوفیاء اور شعراء نے ہمیشہ واعظ کو اپنی دشمنی اور مخالفت کا ہدف قرار دیا۔ یہاں تک کہ اُس کی درست بات کی بھی مخالفت کی گئی۔ اقبال بھی اِس شعر میں واعظ کے بارے میں یہی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر واعظ شراب کو جائز قرار دینے کے لئے ثبوت پیش کرے تو میں اس کی مخالفت کرتے ہوئے شراب پینا بالکل ترک کر دوں گا۔

دورِ دوم

۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء

محبّت

(۱۱۱)

تعارف

یہ نظم جنوری ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شائع ہوئی۔

حلِ لغات

عروس: دلہن۔ **لذتِ رم**: چلنے کا لطف۔ **آئینِ مسلّم**: طے شدہ قاعدہ اور دستور۔ **امکاں**: عدم مراد ہے یعنی نہ ہونا۔ **ظلمت خانہ**: تاریک گھر۔ **پہنائے عالم**: دنیا کی وسعت۔ **خاتم**: انگوٹھی۔ **کیمیا گر**: سونا بنانے والا۔ **اسمِ اعظم**: اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور عظیم نام جس کے واسطے سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کا کونسا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "حیّ" اور "قیوم" میں سے کوئی نام اسم اعظم ہے۔ جبکہ بعض کے نزدیک "اللہ" ہی اسمِ اعظم ہے۔ **فکرِ اجزا**: جزوں کی تلاش۔ **محرم**: واقف، شناسا۔ **ربوبیت**: خدا کی پالنے کی صفت۔ **افتادگی**: گر پڑنے کی عادت، انکساری، خاکساری۔ **حیواں**: آبِ حیات جسے پی کر روایت کے مطابق ہمیشگی کی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ **مہوس**: کیمیا گر: ادنےٰ درجے کی دھاتوں کو سونا بنانے والا۔

؎ عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے — — —

وضاحت

علامہ اقبال نے اِس نظم میں کائنات کے وجود پذیر ہونے کے ابتدائی لمحات کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب رات کی زلفوں میں پیچ وخم نہ آئے تھے۔ آسمان کے ستاروں نے اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلنا شروع نہیں کیا تھا

چاند اپنے نئے لباس میں اجنبی اجنبی سا لگتا تھا اور اسے ہمہ وقت گردش میں رہنے کے طے شدہ قاعدے کا علم نہیں تھا۔ دنیا نئی نئی پیدا ہوئی تھی۔ ہر شے زندگی کے حقیقی تقاضوں سے بے خبر تھی۔ زندگی کا وہ طے شدہ نظام جو اب اپنی مکمل تشکل میں ہمارے سامنے ہے، اس وقت ابتدائی مراحل میں تھا۔ گویا ابھی تک انگوٹھی کی آنکھ نگینے کی تمنا کر رہی تھی اور کائنات کی زینت اور آرائش کا عمل مکمل نہیں ہوا تھا۔

سنا گیا ہے کہ اس وقت عالم ابد میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو مٹی سے سونا بنا لیتا تھا اور جس کے پاؤں کی دھول میں بھی جامِ جمشید سے زیادہ صفائی تھی۔ یقینی طور پر یہ انسان تھا۔ اللہ کے عرش پر ایک نسخہ لکھا ہوا تھا اور فرشتے اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی صورت یہ انسان اس نسخے تک نہ پہنچ سکے جبکہ انسان کی نگاہیں ہمہ وقت اس نسخے کی تلاش میں رہتی تھیں۔ اس لیے کہ وہ اس نسخے کو اللہ کے اُس نام سے زیادہ موثر سمجھتا تھا جس کے باعث ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ یہ انسان ایک روز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کہتے ہوئے آگے بڑھا اور آخرِ کار مسلسل کوشش کے بعد اس کے دل کی آرزو پوری ہو گئی۔ یعنی اس نے وہ نسخہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انسان نے اس نسخے کے اجزاء کی تلاش شروع کی اور تمام دنیا کو کنگھال ڈالا اور ان چیزوں کو پا لیا۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اُس شخص سے کیسے چھُپ سکتی ہے جو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ تک کا واقف ہو۔

انسان نے نسخے کے اجزاء کی صورت میں ستارے سے اس کی روشنی اور چاند کے جگر پر لگا ہوا داغ مانگا۔ رات سے تھوڑی سی تاریکی حاصل کی۔ بجلی سے تڑپ اور جنت کی حُور سے پاکیزگی لی اور حضرت عیسےٰؑ کے سانس سے حرارت و گرمی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ سے بے نیازی طلب کی۔ فرشتوں سے عجز و انکسار اور شبنم کی قسمت سے خاکساری لی۔ پھر ان تمام اجزاء کو آبِ حیات میں حل کیا اور جو دوا تیار ہوئی اُسے انسان نے محبت کا نام دیا۔

جب یہ دوا یا نسخہ تیار ہو گیا تو اس کیمیا گر یعنی انسان نے اس کو نئی نئی پیدا ہونے والی زندگی پر چھڑکا اور اس طرح گویا دنیا کے تمام کاموں کا آغاز کر دیا۔ اس کے بعد ہر چیز حرکت میں آ گئی، سوئے ہوئے ذرے بیدار ہو گئے اور اپنے اپنے ساتھیوں سے گلے ملنے لگے۔ سورجوں اور ستاروں نے نہایت خوبصورت ادا کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ غنچوں نے چٹکنا شروع کر دیا اور لالہ کے پھول کے سینے پر داغ نمایاں ہو گئے۔

گویا شاعر کے نزدیک زندگی کی اصل محبت ہے اور اسی سے زندگی کا وجود قائم ہے۔

حقیقتِ حُسن

(۱۱۲)

یہ نظم مارچ ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظم کے ساتھ علامہ اقبال کا جو نوٹ شائع ہوا تھا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ نے اس نظم کا بنیادی خیال جرمن نثر سے لیا تھا۔ ابتدا میں اس نظم کا عنوان "حُسن اور زوال" تھا۔ بانگِ درا کی اشاعت کے وقت عنوان بدل دیا گیا۔

حلِ لُغات

لازوال: کبھی ختم نہ ہونے والا، ابدی۔ تصویر خانہ: تصویروں کا گھر، غیر حقیقی اور ناپائیدار۔ عدم: وجود کی ضد، کسی شے کا نہ ہونا۔ رنگِ تغیر: جلد تبدیل ہو جانے کا انداز۔ محرم: شناسا، واقف۔

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا ۔ ۔ ۔

وضاحت

ایک دن حُسن نے اللہ سے پوچھا کہ آخر تو نے مجھے دنیا میں لافانی اور ابدی کیوں نہ بنایا۔ جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اگر اِس دنیا کی حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا محض بے حقیقت ہے اور عدم کی طویل رات کا ابتدائیہ ہے۔ جب دنیا کو میں نے ناپائیدار بنایا ہے تو وہی چیز حسین اور خوبصورت قرار پائی جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے جلد ختم ہو جانے والی ہے۔

یہ گفتگو جو خدا اور حُسن میں ہوئی تھی، آسمان سے قربت کی وجہ سے چاند نے بھی سُن لی اور اُس نے اسے سارے آسمان پر عام کر دیا۔ جس کی وجہ سے صبح کو طلوع ہونے والا ستارہ بھی اِس سے واقف ہو گیا، ستارے نے یہ بات شبنم کو بتادی اور شبنم چونکہ زمین سے بھی تعلق رکھتی ہے اور یہ اس کی رازدار اور آشنا ہے لہٰذا شبنم کی وجہ سے زمین پر رہنے والوں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

جب یہ بات پھول نے سنی تو وہ رونے لگا اور شدتِ غم کے باعث کلی کا چھوٹا سا دل بھی پگھل گیا اور موسمِ بہار روتا ہوا چمن سے رخصت ہو گیا اور جوانی سیر کے لیے آئی تھی، انتہائی غمزدگی کی کیفیت میں واپس چلی گئی۔

پیام

(۱۱۳)

تعارف یہ نظم "پیام راز" کے عنوان سے فروری ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شیخ عبدالقادر کے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم ایک خط کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ ابتدا میں نظم کے بارہ شعر تھے نظر ثانی میں صرف سات شعر باقی رہ گئے۔

حل لغات **ذوقِ تپش**: جلنے کا شوق ؛ **حاصل**: نتیجہ، ثمر ؛ **مدار**: انحصار ؛ **عشق گرہ کشا**: مشکلات حل کرنے والا عشق ؛ **بلند بال**: اونچی پرواز کرنے والا ؛ **پیرِ مغاں**: شراب خانے کا مالک ؛ **نشاط**: عیش و مسرت

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اگر تجھ میں عشق کے باعث جلنے کا ذوق پیدا ہو گیا ہے تو تو محفل میں جلنے والی شمع کی طرح محفل یعنی اہلِ دنیا کو اپنے سوز و ساز اور جلن کے ثمرات سے فیض یاب ہونے کا موقع دے یعنی صرف جلنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ پر جو کیفیات طاری ہیں اُن سے مخلوقِ خدا کو بھی فائدہ پہنچے۔

• مشکلات کو حل کر دینے والے عشق کا دار و مدار اور انحصار اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ مہربانی کرے تو یہ دولت انسان کو حاصل ہو جائے۔ ورنہ اس میں ذاتی کمال کو دخل نہیں۔ اور اس سلسلے میں نہ اس بات کی قید ہے کہ کوئی مسلمان ہے یا نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی شانِ بے نیازی کے باوصف جسے چاہے یہ دولت عطا کر دے۔

آپ شمع کو دیکھئے اگر اسے شعلے کی صورت میں نور کا لباس ملا ہے تو اس کی وجہ اس کا جلنا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی شخص کو شمع کی طرح دل و جان پگھلا دینے والی گریہ و زاری عطا نہ کر دے اُس وقت تک یہ نور کا لباس نہیں مل سکتا۔ مراد یہ کہ کوئی بھی اعلیٰ چیز تکلیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہی قدرت کا اصول اور قانون ہے۔

اے انسان تو مختلف چیزوں میں امتیاز و تفریق کرتا ہے اور محض اُن کی ظاہری شکل و صورت

کی وجہ سے انھیں ایک دوسرے سے مختلف تصور کرتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اِس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ستاروں، چاند اور صبح کے جلوؤں اور نظاروں سب میں اللہ ہی کا پرتو موجود ہے اور یوں سب اشیاء کی اصل ایک ہی قرار پاتی ہے۔

عشق عاجزی اور انکساری کے دستور سے بہت بالا ہے اور وہ اس انداز کو کبھی اختیار نہیں کرتا۔ اگر حسن اپنے ناز و ادا میں مست و سرشار نظر آتا ہے تو تجھے بھی جھکنے اور خاکساری کی بجائے اِسی انداز سے جواب دینا چاہیئے۔ مراد یہ کہ عشق انسان کو عاجزی نہیں سکھاتا۔

اے شراب بیچنے والے! مغرب کی شراب پی کر مسرت و شادمانی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اِس شراب میں غم کی کیفیت نہیں ہے۔ مجھے تو دیسی اور گھر کی بنی ہوئی شراب پلا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ پرانی بزم اب بدل گئی ہے اور اس کے قاعدے بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے لیے اب ان کو مجاز کی شراب نہ پلا بلکہ حقیقت و اصلیت سے آگاہ کر۔

سوامی رام تیرتھ

(۱۱۴)

تعارف یہ نظم جنوری ۱۹۰۷ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرثانی میں ایک شعر حذف کر دیا گیا جو سرودِ رفتہ میں درج ہے۔

سوامی رام تیرتھ کا اصل نام تیرتھ رام تھا۔ یہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ناسازگار حالات کے باوجود امتیاز کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کی۔ کچھ عرصے کے لیے مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں پڑھاتے رہے۔ پھر مشن کالج لاہور میں آ گئے اور ریاضی پڑھانے لگے۔ ۱۸۹۹ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اس لیے کہ ان پر ویدانت کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ ہفتوں دریائے راوی کے کنارے بیٹھے رہتے۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں اشنان کرتے ہوئے دریائے گنگا میں ڈوب گئے۔ علامہ اقبال کو اپنے اس دوست کی وفات کی اطلاع یورپ میں ملی تو یہ نظم لکھی۔

حل لغات گوہر نایاب: ایسا موتی جو مل نہ سکے، بہت ہی قیمتی موتی؛ غوغا: شور

آزر: بت تراش جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد یا چچا تھے۔ تسنیم: جنت میں بہنے والی ایک نہر۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال نے سوامی رام تیرتھ کو بیتاب اور مضطرب قطرہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ تو دریا سے ہم آغوش ہو گیا ہے۔ پہلے تو صرف موتی تھا لیکن اب ایک ایسا موتی بن گیا ہے جو تلاشِ بسیار کے باوجود بھی نہ مل سکے۔ اِس شعر میں علامہ اقبال نے بظاہر تو تیرتھ رام کے ڈوبنے کا ذکر کیا ہے لیکن اصطلاحات تصوف کے پردے میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ پردۂ وجود ختم ہونے کے بعد تو خدا سے جا ملا ہے اور یوں اپنے مقصود تک پہنچ کر انتہائی قیمتی موتی بن گیا ہے۔

تو نے کتنی عمدگی کے ساتھ اِس کائنات کے رازوں کو منکشف کر دیا ہے۔ لیکن میں ابھی تک کائنات کی مختلف چیزوں میں تمیز و تفریق کرنے میں اُلجھا ہوا ہوں۔

تیری زندگی کا شور و غوغا ختم ہوا تو قیامت کا ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ تیری زندگی کی چنگاری بجھی تو اُس سے آزر کا بہت بڑا آتشکدہ پیدا ہو گیا۔ مراد یہ کہ فوت ہونے کے بعد سوامی رام تیرتھ کی حیثیت و اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔

حقیقتِ حال سے آگاہی رکھنے والے دل کے نزدیک ہستی کو مٹا دینا ایک معمولی کام ہے۔ اس لئے کہ دلِ آگاہ یہ بات جانتا ہے کہ نفی کے بعد ہی اثبات کا مرحلہ آتا ہے۔ اپنے وجود کو مٹا نہ دیا جائے تو خدا کے اقرار کی صورت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

اندھی آنکھ انجام نہیں دیکھ سکتی۔ مثلاً پارے کو دیکھئے کہ وہ اُسی وقت تک پارہ ہے جب تک مضطرب اور متحرک رہے۔ اگر اس کا اضطراب ختم کر دیا جائے تو وہ محض کچی چاندی رہ جائیگا۔

عشق کا ابراہیم ہستی کے تمام بتوں کو توڑ دیتا ہے اور عقل و خرد اور ہوش و حواس کا علاج عشق کی پاکیزہ ندی کی طغیانی ہے۔ یعنی عشق ہی ہوش و خرد کے طلسم اور جادو کو ختم کر کے انسان کو اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام

(۱۱۴)

تعارف یہ نظم جون ۱۹۰۷ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اِس کے کل بارہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں پانچ شعر قلمزد کر دیئے گئے۔ دیگر کئی اشعار میں بھی جزوی ترمیمات کی گئیں۔ بعض قرینوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم علامہ اقبال نے اس وقت لکھی جب علیگڑھ کالج کے طالب علموں نے اپنے انگریز پرنسپل کے خلاف ہڑتال کی تھی۔

حل لغات **طائرِ زیرِ دام**: جال میں پھنسا ہوا پرندہ مراد قیدی پرندہ، **طائرِ بام**: چھت پر بیٹھا ہوا پرندہ مراد آزاد پرندہ، **مورِ ناتواں**: کمزور چیونٹی، **فروغ**: رونق، زیبائش، **غمکدۂ نمود**: غموں کا ایسا گھر جس میں نمائش ہی نمائش ہو، **بادۂ نیم رس**: وہ شراب جو پوری طرح تیار نہ ہوئی ہو، **خم**: شراب کا مٹکا، **خشتِ کلیسا**: کلیسا کی اینٹ (مراد انگریز پرنسپل)

ع اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے ـ ـ ـ

وضاحت دوسرے شاعر، ادیب اور رہنما جو کچھ تمہیں کہتے رہے ہیں، میرا پیغام اُن سب سے مختلف اور الگ نوعیت کا ہے۔ دراصل میرے دل میں عشق کا پیدا کردہ درد موجزن ہے اور اِس وجہ سے میرا اندازِ گفتگو بھی بالکل انوکھا اور نیا ہے۔ تم اُن لوگوں کی تو بہت سی باتیں سُن چکے ہو جو کسی نہ کسی طرح فرنگ کے قیدی ہیں۔ اب ذرا اُس پرندے کی آواز بھی سنو جو جسمانی و ذہنی طور پہ بالکل آزاد ہے۔ میری آواز تمہیں اِس لئے سننا چاہیئے کہ میں ایک بالکل مختلف پیغام دے رہا ہوں۔

پہاڑ سے یہ آواز آ رہی تھی کہ زندگی کا راز سکون میں پوشیدہ ہے۔ یعنی جو چیز پرسکون رہے گی اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گی وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جبکہ کمزور چیونٹی کہہ رہی تھی کہ اگر اس بات کو درست بھی مان لیا جائے تو بھی چلنے اور حرکت کرنے میں ایک عجیب لطف اور مزہ ہے۔

حجاز کی محفل یعنی ملتِ اسلامیہ کی تمامتر رونق اور زیبائش کعبہ کی محبت اور عشق کی

وجہ سے ہے - اِس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دیگر قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے اصول بھی مختلف ہیں اور اُن کی زندگی کا نظام بھی یکسر جداگانہ ہے ۔

اگر انسان کو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی عیش و عشرت حاصل ہو اور اُس کے دل میں آرزو اور تمنا نہ ہو تو یہ عیش و عشرت انسان کو کاہل و سست بنا دے گی اور یوُں یہ اس کی موت کا سامان بن جائے گی۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان اور شراب کے پیالے کی گردش میں بہت فرق ہے ۔ پیالے کو گردش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا جب کہ انسان کو سب کچھ گردش اور جد وجہد کے باعث ملتا ہے ۔

ساری رات جلتے رہنے اور صبح کو بجھ جانے والی شمع جلتے جاتے ایک پیغام دے گئی اور وہ یہ کہ جلنا اور دکھ اٹھانا زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے ۔ یہ دنیا جو محض غم والم اور دکھاوے پر منحصر ہے اِس میں ہمیشہ پانے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان جد وجہد اور جستجو میں لگا رہے اور چین و سکون سے درگزرے ۔

ابھی تک شراب پوری طرح تیار نہیں ہوئی اور شوق و عشق میں بھی پختگی نہیں آئی اس لئے بہتر یہ ہے کہ اپنے شراب کے مٹکے پر اہل کلیسا یعنی عیسائیوں کی اینٹ رکھی رہنے دی جائے ۔ مراد یہ ہے کہ ابھی اپنے جذبات کا بے لگام اظہار مناسب نہیں ۔ خشتِ کلیسا سے مراد وہ انگریز پرنسپل ہے جو علیگڑھ کالج کے طلبہ کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتے تھے اور جن کے خلاف طلبہ نے ہڑتال کی تھی ۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب تک تم لوگ اپنی تعلیم و تربیت مکمل نہیں کر لیتے ، اس وقت تک یہ جد وجہد نہ صرف فضول بلکہ ضرر رساں ہے ۔ گویا اس دور میں علامہ اقبال بھی سر سید احمد خاں کے سیاسی نظریات سے اتفاق کرتے تھے ۔

اخترِ صبح

(۱۱۵)

حلِ لغات
بساط : حیثیت ، وقعت ۔ نفس : سانس ۔ حباب : بلبلہ ۔ تابندگی : چمک ، روشنی ۔ ریاض : گلستان ۔ بنا : بنیاد ۔ ابد : ہمیشگی ۔

۵ ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا ۔ ۔ ۔

وضاحت صبح کے وقت طلوع ہونے والا ستارہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اللہ کی طرف سے مجھے نگاہ اور بینائی تو دی گئی لیکن اتنی فرصت و فراغت نہ دی گئی کہ میں اِس بینائی کو کام میں لا کر مناظرِ فطرت کو دیکھ سکوں ۔ اِس لیے کہ تھوڑی دیر بعد آفتاب نکلنے لگے گا اور میں غروب ہو جاؤں گا ۔ ستارہ کہتا ہے کہ دنیا میں سورج کی کرنوں سے ہر چیز زندہ ہو جاتی ہے لیکن صبح کے دامن کے نیچے مجھے پناہ نہ مل سکی ۔ بھلا اِس کائنات میں صبح کو طلوع ہونے والے ستارے کی کیا حیثیت و وقعت ہے میری مثال تو اُس ہوا کی ہے جو بلبلے میں مقید ہوتی ہے اور مقدار کے اعتبار سے بہت ہی معمولی اور کم ہوتی ہے ۔ یا پھر صبح کا ستارہ چنگاری کی روشنی کی مانند ہوتا ہے جو ایک دم کے لیے چمکتی اور پھر فنا ہو جاتی ہے ۔

ستارے کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ اے صبح کی پیشانی کے زیور کیا تجھے فنا ہو جانے کا غم لاحق ہے ۔ اگر ایسا ہے تو تو آسمان کے گنبد سے نیچے اُتر آ ۔ آسمان کی بلندی سے شبنم کے ساتھ زمین پر ٹپک پڑ اور میری شاعری کے گلستان میں آ جا ۔ میری شاعری روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی ہے ۔ میں باغبان کی حیثیت رکھتا ہوں اور محبت میری شاعری کی بہار ہے اور یہ ایسا گلستان ہے جس کی بنیاد ہمیشگی کی طرح مضبوط اور مستحکم ہے یعنی میری شاعری کو کبھی زوال نہیں آئے گا ۔

حُسن و عشق

(۱۱۶)

حلِ لغات کشتیٔ سیمینِ قمر : چاند کی سفید کشتی ۔ ہنگام : وقت ، موقع ۔ یدِ بیضائے کلیم : حضرت موسیٰؑ کا چمکدار ہاتھ ۔ یہ موسےؑ کا معجزہ تھا کہ جب وہ اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکالتے تو ہاتھ انتہائی سفید اور روشن ہوتا ۔ نہال : پودے ۔

۵ جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جس طرح صبح کے چاند کی سفید کشتی صبح کے وقت سورج کی روشنی میں چھپ جاتی ہے یا جیسے بالکل سفید رنگ کا کنول کا پھول

چاند کی چاندنی میں رنگ کی یکسانی کی وجہ سے کھو جاتا ہے یا جس طرح طور کے اُس جلوے کے سامنے جس میں اللہ تعالیٰ کا نور ظاہر ہوا تھا، موسیٰؑ کا سفید ہاتھ کم روشن ہو جاتا ہے یا جیسے صبح کے وقت گلستان کی خوشبو کی موجوں میں ایک چھوٹے سے پھول کی خوشبو خود کو فنا کر دیتی ہے۔ اسی طرح میرا دل بھی تیری محبت اور عشق کے سیلاب میں خود کو گم کر رہا ہے۔

؎ تُو جو محفل ہے، تو ہنگامۂ محفل ہوں میں ۔ ۔ ۔

وضاحت اے محبوب اگر تو محفل ہے تو پھر میں یعنی عشق تیری بزم کی رونق ہوں اور اگر تجھے بجلی قرار دیا جائے تو میری حیثیت اُس کھلیان کی ہے جسے بجلی اپنا تختۂ مشق بناتی ہے۔ اگر تو صبح ہے تو میرے آنسو تیری شبنم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر میں مسافرت اور بے سروسامانی کے عالم میں آنے والی شام ہوں تو میری شفق اور رنگینی کا سامان تجھ سے ہے۔ بکھر جانے کے سبب جو حالت تیری زلفوں کی ہے وہی میرے دل کی ہے اور تیری تصویر میں میری حیرت موجود ہے۔ یعنی پریشانی اور حیرت کسی طور سہی لیکن حسن اور عشق دونوں کی مشترک خصوصیت ہے۔ اے حُسن اگر تُو اپنی انتہا اور کمال پر پہنچا ہوا ہے تو عشق بھی کمال کی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔

؎ ہے میرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار ۔ ۔ ۔

وضاحت اے محبوب تو میری شاعری کے لئے موسمِ بہار کی ہوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو نے میرے بے چین و مضطرب خیالات کو ٹھہراؤ اور قرار عطا کر دیا ہے۔ اے حسن جب سے میرے دل میں تیری آرزو پیدا ہوتی ہے، اُس وقت سے مجھ میں نئی نئی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ دراصل عشق کے دل میں حسن کی بدولت کمال حاصل کرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری امیدوں اور آرزوؤں کے پودے تیری ہی وجہ سے سرسبز و شاداب ہوئے ہیں اور تجھے پانے ہی میرا قافلہ اپنی منزل تک پہنچ گیا ہے۔

۔۔۔۔ کی گود میں بلّی دیکھ کر

(۱۱۷)

تعارف بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نظم عطیہ فیضی یا جاوید اقبال سے متعلق ہے۔ لیکن

یہ درست نہیں اور نہ ہی اِس نظم کا تعلق اُس دور سے ہے جس میں یہ شامل ہے اور جو علامہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور کہلاتا ہے ۔ علامہ اقبال نے یہ نظم اپنی شاعری کے تیسرے دور میں لکھی تھی لیکن چونکہ اپنے انداز کے اعتبار سے یہ دوسرے دور کی منظومات سے قریب تر ہے لہٰذا بانگ درا کی اشاعت کے وقت اسے دوسرے دور میں شامل کر لیا گیا ۔ اگر یہ نظم دوسرے دور میں تصنیف کی گئی ہوتی تو کچھ ناقدین و محققین اسے جاوید اقبال سے ہرگز منسوب نہ کرتے ۔ دراصل یہ نظم نہ جاوید اقبال کے لیے لکھی گئی اور نہ عطیہ فیضی کیلئے بلکہ اِس سے متعلق شخصیت بمبا دلیپ سنگھ ہے ۔ یہ پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی پوتی تھیں اور اقبال کا بہت احترام کیا کرتی تھیں ۔ اقبال بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے ۔

حلِ لغات

دزدیدہ نگاہی : کنکھیوں سے دیکھنا ؛ رمز : راز، بھید ؛ ذکاوت : دانائی، عقلمندی ؛ چڑھ : نفرت ؛ ۔

۵ تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے ۔ ۔ ۔

وضاحت

علامہ اقبال بلی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تجھے یہ کنکھیوں سے آنکھیں چرا کر دیکھنا کس نے سکھا دیا ہے ۔ یہ تو محبت کرنے والوں کا انداز ہے ۔ تجھے یہ راز کس نے بتا دیا ہے ؟ تیری ایک ایک ادا سے محبت ظاہر ہو رہی ہے اور تیری نیلی آنکھوں سے ذہانت اور ہشیاری کا اظہار ہو رہا ہے ۔ تو کبھی گود میں اٹھانے والے کو دیکھتی ہے اور کبھی شرما کر آنکھیں جھکا لیتی ہے کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور کبھی لیٹ کر سونے لگتی ہے ۔ تیری آنکھیں آئینے کی طرح حیرت کی مظہر ہیں ، شاید تیری آنکھیں آگہی کے نور کو جانتی اور پہچانتی ہیں ۔ تو نے ناز و ادا کا عجیب انداز اختیار کر رکھا ہے کہ تو انہیں پنجوں سے مارتی ہے ۔ پتا نہیں چلتا کہ نفرت اور غصّے کا اظہار ہے یا یہ محبت کرنے کا انداز ہے ۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تو بہت زیادہ شوخی کا مظاہرہ کرے گی تو وہ تجھے گود سے اتار دیں گے اور اگر ان کے سینے پر اٹکا ہوا پھول گر گیا تو پھر تجھے سزا بھی دیں گے ۔

آخر تجھے کس چیز کی تلاش ہے اور تُو کس کی آرزومند ہے ۔ کیا تیرے سر میں بھی عشق کا جنون سمایا ہوا ہے ۔ کیا یہ سمجھا جاتے کہ حسن کا احساس صرف انسان تک محدود نہیں بلکہ جس طرح ہر جاندار کے سینے میں دل ہے اسی طرح عشق بھی ہر چیز کو ودیعت کیا گیا ہے ۔ اِس زمانے میں عشق بالکل اسی طرح ہے جس طرح شراب کے پیالے میں شراب ہوتی ہے ۔ عشق سورج کی روح کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور چاند کی کرنوں کی حقیقت و اصلیت کی حیثیت بھی ۔ دنیا کے ایک ایک ذرے کے دل میں اس کی چبھن موجود ہے ۔ اور عشق کی مثال اُس نور کی ہے جس کی جھلک دنیا کی ہر چیز میں ہے ۔ عشق کہیں خوشی اور شادمانی کا

پیغام لاتا ہے اور کہیں غم کا باعث بنتا ہے ۔ یہ کہیں موتی کی حیثیت رکھتا ہے اور کہیں آنسو اور شبنم کی ۔

کلی

(۱۱۸)

حلِ لغات: عارض: رخسار، گال؛ **جلوہ آشام:** آشام کے لفظی معنی پینے والے کے ہیں یہاں مراد ہے جلوؤں سے فیض یاب ہونے والا؛ **سینہ تنگافی:** چھاتی پھٹنا؛ **گہوارہ:** پالنا، جھولا؛ **طرب اندوزِ حیات:** زندگی کی مسرتیں حاصل کرنے والا؛

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا ۔ ۔ ۔

وضاحت جب صبح اپنے رنگین اور خوبصورت رخسار دکھاتی ہے تو کلی اپنا سنہری سینہ کھول کر اس کی روشنی سے لطف اندوز ہوتی ہے ۔ کلی صبح کے میخانے کے جلوؤں اور نظاروں سے فیض یاب ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا سامان سورج کے پیالے کی وجہ سے ہے ۔ یہ کلی سورج کے سامنے اپنا دل چیر دیتی ہے اور اس کے لطیف نور کو اپنے سینے میں جذب کر کے سینہ کھولنے کا لطف حاصل کرتی ہے ۔

میرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب کبھی تو بھی اپنے چہرے کا پردہ اٹھا کر بے حجاب ہو جا کیونکہ میری مضطرب اور بے چین نگاہیں تجھے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہیں ۔ اے محبوب حقیقی میری خواہش یہ ہے کہ کبھی تیرا نور میرے دل کو اپنا گھر بنائے اور میرے دل کے آئینے میں تیرا نور رہنے لگے ۔ میرے دل کے لئے ترے جلوے زندگی کا سامان پیدا کر دیں اور میرے دل کے لئے تیری روشنی جھولے اور پالنے کا کام کرے ۔ جب یہ ہو جائے گا تو یقیناً میری خاک کا ایک ایک ذرہ زندگی کی حقیقی مسرت حاصل کرے گا اور پھر میری فکر اور سوچ کے ذریعے زندگی کا سوز عیاں ہو گا ۔ میں دور سے اپنے محبوب کا نظارہ کروں گا اور جس طرح کلی اور غنچہ سورج کی روشنی سے بغل گیر رہتے ہیں، اسی طرح میں بھی نور سے بغل گیر رہوں گا ۔ پھر میں اپنی بے قرار اور

بے چین جان کی اصلیت و حقیقت سب پر روشن کر دوں گا۔ اور میرے دل میں جو خیالات اب تک چھپے ہوئے ہیں انھیں بھی ظاہر کر دوں گا۔

چاند اور تارے

(۱۱۹)

حلِ لغات دمِ سحر: صبح کا وقت۔ **مدام**: ہمیشہ۔ **ستم کشِ سفر**: سفر کی صعوبتیں جھیلنے والے۔ **حجر**: پتھر۔ **ہم نشینو**: دوستو، ساتھ بیٹھنے والو۔ **مزرعِ شب**: رات کی کھیتی۔ **خوشہ چینو**: خوشے چُننے والو، فیض اٹھانے والو۔ **اشہب**: گھوڑا۔ **تازیانہ**: چابک۔ **بے محل**: بے موقع۔ **اجل**: موت۔

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے ــــ ــــ ــــ

وضاحت تاروں نے صبح کے وقت سے ڈرتے ڈرتے چاند سے کہا کہ اگرچہ ہم چمک چمک کر تھک گئے ہیں لیکن آسمان کے منظر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی یعنی ہمارا چمکنا بیکار ثابت ہوا۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ہمیشہ بغیر رُکے رات دن چلتے رہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز مضطرب ہے اور جس چیز کو سکون کہا جاتا ہے وہ اس دنیا میں نہیں۔ دنیا کی ہر چیز خواہ وہ انسان ہوں، درخت ہوں یا پتھر، ہمیشہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی یہ سفر ختم بھی ہوگا اور ہم سب کو اپنی منزل نظر آئے گی۔

کہنے لگا چاند! ہم نشینو ــــ ــــ ــــ

وضاحت تاروں کے سوال کے جواب میں چاند نے کہا کہ اے میرے ساتھیو اور اے رات کی کھیتی سے فیض حاصل کرنے والو دنیا کی زندگی حرکت کی وجہ سے ہے اور یہ اس کائنات کا بہت پرانا اصول ہے۔ زمانے کا گھوڑا خواہش کے چابک کھا کھا کر دوڑتا ہے یعنی ہر حرکت کے نیچے کسی نہ کسی طرح کی خواہش پوشیدہ ہے اور دنیا کے راستے میں ٹھہر جانا بے موقع اور نامناسب ہے۔ اس لئے کہ رکنے اور ٹھہرنے کا دوسرا نام موت ہے۔ جو لوگ اپنی منزل کی طرف

رواں رہے وہ دوسروں سے آگے نکل گئے اور جو رُک گئے انھیں پیچھے سے آنے والوں نے روند ڈالا۔ حرکت اور روانی ہی اشیاء کو بناتی سنوارتی ہے گویا چلتے رہنے ہی میں حسن ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں عشق کی وجہ سے حرکت شروع کرتی ہیں اور اس حرکت کی بدولت آخر میں سنور کر حسین بن جاتی ہیں۔

وصال

(۱۲۰)

تعارف اس نظم کے بارے میں نسیم امروہوی فرہنگ اقبال میں لکھتے ہیں :

"یہ بانگ درا میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان ہے جو انھوں نے ۱۹۰۸ء میں ملک جرمنی کے شہر (Munich) میونخ میں کہی تھی جبکہ وہ فلسفے میں پی ایچ ڈی کرنے وہاں گئے تھے۔"

اس کے علاوہ بعض قرائن سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم عطیہ فیضی کے لئے لکھی تھی اور انہی کو پیش کی تھی۔

حلِ لغات سیماب : پارہ ؛ ارتکاب کرنا : عمل میں لانا ؛ شبِ دیجور : اندھیری رات ؛ ضَو : روشنی ؛ تابندہ : چمک دار۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے — — —

۵

وضاحت اے بلبل میں جس پھول کی تلاش میں تڑپا کرتا تھا خوش نصیبی سے مجھے وہ پھول مل گیا ہے۔ اس سے پہلے میں خود بھی تڑپا کرتا تھا اور دیگر اہل چمن کو بھی مضطرب اور بے چین رکھتا تھا اور بلبل جب رنگین نغمے گاتا تھا تو میں شرمندہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے پہلو میں دل نہیں بلکہ پارہ ہے جو ہر وقت متحرک اور بیتاب رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل محبت کا جرم کرنے کے لئے بے قرار رہا کرتا تھا۔ پھولوں یعنی حسینوں کی محفل میں میری بد قسمتی مشہور تھی اور میری صبح سیاہ رات کی مانند تاریک ہوا کرتی تھی۔ میرے خون شدہ سینے میں سانس نشتر کا کام کرتا تھا اور میری خاموشی میں قیامت کے ہنگامے

نتیجے ہوتے تھے۔

ماب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت لیکن اب میرے احساسات کی دنیا میں پہلے جیسی پریشانی نہیں ہے اور میری غزلیں اور نغمے اہلِ چمن کے لئے ناگوار نہیں ہوتے۔ عشق کی گرمی کے باعث میرے آہلوں میں شعلوں جیسی حرارت پیدا ہو گئی ہے اور اب میرے نالوں میں بھی بجلی جیسی تاثیر آگئی ہے یعنی وہ بجلی ہی کی طرح بلند، تیز اور جلانے والے ہو گئے ہیں۔ محبت کے غازے نے میرے دل کی مٹی کو آئینے کی طرح شفاف اور روشن کر دیا ہے اور اِس آئینے میں پرانے دوست اور محبوب کی تصویر جھلک رہی ہے۔ میں عشق کی قید میں گرفتار ہوا تو مجھے صحیح معنوں میں آزادی حاصل ہوتی اور دل کے لٹنے کے بعد میری آرزوؤں اور ارمانوں کی دنیا آباد ہوتی۔ میری قسمت کا ستارہ اُس سورج یعنی محبوب کی روشنی سے روشن اور چمکدار ہو گیا ہے جس کے راستے میں اٹھنے والے غبار سے خود چاند کی روشنی بھی شرمندگی اور خجالت محسوس کرتی ہے۔

تو نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور مجھے عشق میں اپنی ہستی مٹا دینے کا طریقہ سکھا دیا۔ وہ دن کتنا اچھا تھا جب تو نے میرے جسم کے خاشاک کو جلا کر بھسم کر دیا تھا۔

سلیمیٰ

(۱۲۱)

حلِ لغات نمود: اظہار ؛ ستارہ بیں: ستارے دیکھنے والا مراد نجومی ؛ بانکپن: حسن ؛ پیدا: ظاہر ؛ ہویدا: ظاہر، عیاں ؛ پیرہن: لباس سکوت: خاموشی ؛ کاشانہ: گھر ؛ جمال: حسن ؛

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے ۔ ۔ ۔

وضاحت جس حُسن کا اظہار نجومی کی آنکھ نے سورج، چاند اور ستاروں میں دیکھا اور جسے صوفیا نے دل کے تاریک گھر میں پایا۔ شاعر نے حسن کو فطرت کے

حسن میں تلاش کیا اور جس کی روشنی شبنم کے قطروں اور جس کی خوشبو پھولوں کے لباس سے نمایاں ہوتی ہے۔ جو حسن صحرا میں خاموشی پر چھایا ہوا ہے ۔ اور جس کے دم سے گلستان میں ہمہ وقت ہنگامے بر پا ہیں۔ اے سلیمیٰ یوں تو ہر چیز میں وہی حسن یعنی حسنِ ازل نمایاں ہے لیکن اگر اس کا کمال دیکھنا ہو تو وہ تیری آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے یعنی شاعر کے نزدیک سلیمٰی کی آنکھیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ حسین اور خوبصورت ہیں۔ بقول فیض :

ع تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

بعض شارحین نے لکھا ہے کہ اس نظم میں علامہ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز میں حسنِ باری تعالےٰ موجود ہے جسے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے صرف انسان دیکھ سکتا ہے لیکن اگر یہی معنی مراد ہوتے تو نظم کا عنوان "سلیمٰی" رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

عاشقِ ہرجائی

(۱۲۲)

یہ نظم علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے تیسرے دور میں کہی تھی لیکن عنوان اور موضوع کی مناسبت سے چونکہ یہ نظم دورِ دوم سے متعلق تھی لہٰذا اسے دوسرے دور کی نظموں میں شامل کر دیا گیا۔

عاشقِ ہرجائی کے چار شعر جو نظرِ ثانی میں حذف کر دیے گئے تھے، باقیاتِ اقبال اور روزگار فقیر جلد دوم میں موجود ہیں۔

حلِ لغات ہرجائی : یہ لفظ عام طور پر بُرے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن علامہ اقبال نے یہ لفظ کم از کم دو جگہ اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کی ظاہری معنویت یعنی "بے وفا" کے علاوہ دیگر جہتیں بھی سامنے آتی ہیں، یعنی ہر جگہ موجود رہنے والا۔ کسی خاص مقام سے وابستہ اور متعلق نہ ہونے والا، ہر ایک سے تعلق رکھنے والا؛ **مجموعۂ اضداد** : متضاد اوصاف کا حامل؛ **رفعت** : بلندی؛ **زمیں فرسا** : زمین پر چلنے والا؛ **فلک پیما** : آسمان کی پیمائش کرنے والا مراد بہت بلند۔ **مشرب** : طریقہ، مسلک؛ **حکمت** : دانائی؛ **افتادہ** : مصیبت کا مارا ہوا، گرا پڑا، **تفنن** :

تبدیلی، انقلاب ۔ مدار: انحصار۔ جبیں فرسا: سجدہ کرنے والا۔ تلون کیش: بدلتے رہنے والا۔ سیماب: پارہ۔ آشفتگی: پھیلاؤ، وسعت، بکھرنے کی قوت۔ رستخیز: ہنگامہ، قیامت۔ شرار جستہ: بے تاب چنگاری۔ مدعا: خواہش۔ افلاس: ناداری، یہاں مراد ہے نارسائی۔ نکتہ چیں: تنقید کرنے والا۔ نقش: تصویر۔ تنک جلوہ: معمولی اور تھوڑا سا جلوہ دکھانے والا۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو ۔ ۔ ۔

وضاحت اس بند میں یہ تاثر دیا گیا ہے گویا کوئی شخص اقبال سے اس کے بعض تضادات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ اے اقبال تیری ذات میں مختلف اور متضاد صفات جمع ہوگئی ہیں۔ ایک طرف محفل کی ساری رونق تیری وجہ سے ہے اور دوسری طرف انجمن آرائی کے باوجود تو خود کو تنہا بھی محسوس کرتا ہے۔ اے بہترین شاعری کرنے والے دیوانے! تیری وجہ سے گلشن اور صحرا دونوں پُر رونق ہیں۔ تُو اپنی پرواز کی بلندی کے باعث ستاروں کا ساتھی ہے یعنی انہی کی طرح بلند ہے اور اے زمین پر رہنے والے یُوں تو آسماں کی پیمائش کرتا ہے یعنی آسمان پر رہتا اور چلتا پھرتا ہے، تُو شراب پیتا ہے لیکن شراب پیتے ہوئے اللہ کے حضور سجدے بھی کرتا ہے جس سے یوں لگتا ہے کہ تیرے مسلک میں شراب کی صراحی کا انداز بھی شامل ہے۔ جس طرح پھول کی خوشبو کسی خاص رنگ کے لباس کی محتاج نہیں ہوتی، اِسی طرح تُو بھی بالکل عریاں اور بے لباس ہے۔ اگرچہ تو دانائی کی باتیں کرتا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ جیسے تجھے جنون بھی ہے۔ موج کی طرح اپنے پاؤں کا نشان چھوڑے بغیر تو اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے لیکن اپنی تمامتر حرکت کے باوجود دریا کے کنارے کی طرح ایک ہی مقام پر پڑا ہوا بھی ہے۔ تیری طبیعت کے لئے عورت کا حسن بجلی کی تاثیر رکھتا ہے اور تیری طبیعت میں اِس حسن کے لیے بے پروائی کا رویہ بھی موجود ہے جو روایتی عاشق کا شعار نہیں۔ تیری زندگی کا انحصار صرف انقلاب اور تبدیلی پر ہے۔ کیا تو نے کبھی وفا کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی ایک ہی آستانے پر سجدے کئے ہیں؟ حسین لوگوں نے تجھے وفا سے ناواقف شخص کا خطاب دے رکھا ہے اور اے بدلتے رہنے والے شخص اس اعتبار سے تو شہرت بھی رکھتا ہے اور بدنام بھی ہے۔ تو دنیا میں پارے جیسی طبیعت لے کر آیا ہے۔ تیری بیقراری کے قربان! تو عجیب بے چین و بیتاب انسان ہے۔

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے ۔ ۔ ۔

وضاحت اس بند میں اقبال کی طرف سے پہلے بند کے اعتراضات کے جواب میں بعض باتیں کہی گئی ہیں۔ میں نے اپنے لباس کے نیچے مٹی کی ایک ایسی مٹھی یعنی ایسا

جسم چھپا رکھا ہے جسے عشق کی پریشانی اور بکھر جانے والی طاقت نے صحرا کر دیا ہے۔ میرے سینے میں جو دل ہے اُس کی مثال اُس ترشے ہوئے ہیرے کی ہے جو ہزار ہا پہلو رکھتا ہے۔ اور ہر پہلو کا رنگ دوسرے پہلوؤں سے مختلف ہے، شاعر کا دل، دل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو جذبات و احساسات کا ایک ہنگامہ اور قیامت ہوتا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ میرے سینے کے اندر کیا ہے؛ میرے ہر جذبے اور ہر احساس میں نئے نئے جلوؤں کی خواہش بھری ہوئی ہے۔ میں بہت بے چین ہوں اور میرا دل سکون سے بالکل بیگانہ ہے۔ گو میرے پیشِ نظر ہمیشہ کوئی نیا مظہر حسن ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ میں نے حسن کے ساتھ وفا کا نہایت مضبوط عہد باندھ رکھا ہے۔ جس چیز کو بے نیازی کہا جاتا ہے یہی چیز میری طبیعت میں عجز و انکسار پیدا کرتی ہے۔ میرے دل میں صبا کی طرح تلاش و جستجو کا سوز بھرا ہوا ہے۔ ایک لمحے کے لئے چمکنے اور بجھ جانے والی چنگاری کا نظارہ میرے لیے سکون بخش نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ میرا دل تو بجلی سے واقف ہے جو جلا کر خاکستر کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ گویا اقبال انسانی حسن کے نہیں بلکہ حسنِ خداوندی کے عاشق ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میری خواہش تو اُس مکمل جلوے کو دیکھنے کی ہے جس کو دیکھنے کے بعد عشق کا ہر تقاضا پورا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی تلاش مجھے دنیا کی مختلف اشیاء کی طرف مائل کرتی ہے۔ دراصل حسن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اور میرا درد بھی ایسا ہے جس کی کوئی دوا نہیں ہے۔ محبت میں ناکامیوں کے دُکھ سہنے میں میرے لیے زندگی ہے۔ اِسی لیے میں اپنے عشق کو وفا کے قاعدوں سے آزاد رکھتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے سچی بات پوچھے تو وفا محض تخیل کے مفلس ہونے کا دوسرا نام ہے اور چونکہ میرا تخیل مفلس نہیں ہے لہٰذا میں اپنے دل میں ہر لمحہ ایک نئی قیامت اٹھاتے رکھتا ہوں۔ میرے دل کا ظرف اِس قدر فراخ ہے کہ اس میں دریا اور سمندر سما سکتے ہیں۔ جبکہ ساقی جو کچھ دے رہا ہے اُس کی مثال صرف شبنم جیسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ سے پیاسا ہوں اور میں انتہائی بے چین و بیتاب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے دراصل اپنا نقاد پیدا کر لیا ہے۔ میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تصویر ہوں لیکن مجھے اپنے بنانے والے سے شکایت ہے۔ اگر اس دنیا میں حسن کا نظارہ اتنا ہی کم تھا تو مجھے وہ فکر و تخیل کیوں دیا گیا جس کی پرواز کی کوئی حد نہیں اور اصل میں مجھے خدا سے یہی شکایت ہے۔

ہم تلاش و جستجو کے صحرا میں مسلسل کوشش کرنے والے ہیں۔ ہم سمندر کی موجیں ہیں اور اپنی شکست کا سامان خود اپنے کندھوں پر اٹھاتے پھرتے ہیں یعنی جس طرح سمندر کی موجیں منزل تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اسی طرح ہم بھی منزل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔

کوششِ ناتمام

(۲۴)

تعارف

ابتدا میں یہ نظم دو بندوں پر مشتمل تھی ۔ اقبال نے نظرِ ثانی میں نہ صرف دوسرا بند حذف کر دیا بلکہ پہلے بند کے بھی دو شعر قلم زد کر دیئے ۔ حذف شدہ تمام اشعار باقیاتِ اقبال اور روزگارِ فقیر جلد دوم میں موجود ہیں ۔

حلِ لغات

فرقت : جدائی ، **خوں فشاں** : خون بہانے والی ، **اخترِ شام** : شام کو طلوع ہونے والا ستارہ یعنی زہرہ ۔ **روز** : دن ، **تابِ دوام** : ہمیشہ رہنے والی روشنی ، **قطبِ آسماں** : شمال کی طرف نظر آنے والا ایک ستارہ جو رات بھر ایک ہی جگہ رہتا ہے ۔ **سوتے** : زمین سے نکل کر بہنے والا پانی چشمہ ، **خجستہ گام** : مبارک قدم ، خوش نصیب ۔

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ وتاب صبح ـ ـ ـ

وضاحت

صبح سورج کی جدائی میں بے چین و مضطرب رہتی ہے اور شفق کی آنکھ شام کے ستارے کے طلوع ہونے کے انتظار میں خون بہاتی ہے ۔ دن کا مجنوں ، شام کی لیلیٰ کو پانے کی خواہش رکھتا ہے اور صبح کا ستارہ جو تھوڑی دیر کے لیے طلوع ہوتا ہے ، ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی روشنی حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے ۔ قطب ستارہ ، ستاروں کے قافلے سے یہ بات کہہ رہا تھا کہ اے ساتھیو میں تو ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں اور چلنے کا لطف حاصل کرنے کے لیے ترس رہا ہوں ۔ چشمے ندیوں تک پہنچنے اور ندیاں سمندروں میں ملنے کے عشق میں مبتلا رہتی ہیں ۔ جبکہ سمندر کی موجیں چودھویں رات کے چاند کے عشق میں گرفتار ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کا حُسن جو لالہ و گل اور دیگر مظاہرِ فطرت میں چھپا ہوا ہے ، اپنے عام نظارے کے لئے بیتاب ہے ۔

ان سب باتوں کے باوجود اگر تو زندگی کا راز پوچھنا چاہے تو مبارک قدم خضر سے پوچھ ۔ وہ یہی کہے گا کہ دنیا کی ہر چیز تلاش و جستجو اور حرکت و عشق کے باعث زندہ ہے ۔

نوائے غم

(١٢٤)

حلِ لغات رباب : ایک ساز کا نام ؛ بربط : ایک ساز کا نام ؛ محشرستان : قیامت کا میدان ؛ منت کش : احسان اٹھانے والا ؛ مضراب : ساز بجانے کا آلہ۔

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش ۔ ۔ ۔

وضاحت میری زندگی اُس رباب کی طرح ہے جو اگرچہ خاموش ہو لیکن جس کی گود ہر طرح کے ہزاروں نغموں سے بھری ہوئی ہو اور جس کی خاموشی پر کائنات کا وہ ساز بھی قربان کیا جا سکتا ہے جس کے ہر تار میں سینکڑوں ہزاروں نغمے دفن ہیں۔ جس کی خاموشی قیامت پیدا کر دینے والے نغموں کی امانت دار ہے اور جس کی خاموشی نے کبھی ہنگامے اور شور و غل کا احسان نہیں اٹھایا۔

افسوس کہ میری محبت کرنے کی اُمید اور توقع کبھی پوری نہ ہوئی اور میرے ساز نے کبھی مضراب کی چوٹ نہیں کھائی۔ گویا اقبال کے نزدیک یہ محبت ہی ہے جو انسان کی زندگی کے رباب کو نغمہ سرائی پر مجبور کرتی ہے اور اس کی صلاحیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

مگر آتی ہے نسیم چمن طور کبھی ۔ ۔ ۔

وضاحت لیکن کبھی کبھی کوہِ طور کے چمن کی نسیم جو کسی حور کی سانس جیسی معطر ہے، میرے پاس آ جاتی ہے۔ یہ چیز بس میری زندگی کے تار کو چھیڑ دیتی ہیں جس کی وجہ سے زندگی کے دام میں آئی ہوئی روح آزاد ہو جاتی ہے اور پھر مایوسی و ناکامی کی ہلکی سی آواز بلند ہوتی ہے اور آنسوؤں کے قافلے کے لئے گھنٹی کی آواز ثابت ہو جاتی ہے یعنی میرے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

اِس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ چلنے اور سفر کرنے کے شوق کی وجہ سے شبنم زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچتی ہے۔ اِس طرح غم و اندوہ اور ناکامی و نامرادی کے گیت کے باعث انسان کی فطرت میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔

عشرتِ امروز

(۱۲۵)

حلِ لغات اجل : موت ۔ شرابِ طہور : پاکیزہ شراب ۔ فریفتہ : عاشق ۔ سلسبیل : جنت کی ایک نہر کا نام ۔ کلام نہ ہونا : اختلاف و اعتراض نہ ہونا ۔ فردا : آنے والی کل یعنی مستقبل ۔

۵ نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیامِ عیش و سرور ۔ ۔ ۔

وضاحت مجھے یہ بات نہ بتا کہ موت عیش و عشرت کا پیغام ہے ۔ یعنی موت کے بعد عیش و عشرت میسر آئے گی ۔ میرے سامنے جنت میں ملنے والی پاکیزہ شراب کا تذکرہ بھی نہ کر ۔ تجھے چاہیئے کہ تو حُور کی فرقت اور جدائی میں غمگین نہ ہو اور پری کو الفاظ کے شیشے میں مت اتار ۔ مجھے بہت حسین و جمیل ساقی کا عاشق نہ بنا اور میرے سامنے حوروں اور جنت میں بہنے والی نہر کا ذکر بھی نہ کر ۔ مجھے اِس بات سے اختلاف نہیں کہ جنت میں ہر طرح سے امن و امان ہو گا ۔ لیکن اے واعظ تیرا یہ پیغام جوانی کے لئے موزوں نہیں ہے یعنی جوانی اِس پر کان نہیں دھرتی ۔

جوانی ایک حد تک تو شاید انتظار کر لے لیکن بیحد و نہایت انتظار اِس کے بس کی بات نہیں ۔ جوانی کے نزدیک اس عیش کو عیش نہیں کہا جاتا جس کا انتظار کرنا پڑے ۔ بھلا وہ بھی کوئی حسن ہے جو دیکھنے والی آنکھ کا محتاج ہو اور اپنے اظہار کے لیئے مستقبل کا احسان اٹھانے پر مجبور ہو ۔

زندگی کا احساس بہت عجیب چیز ہے ۔ جوانی کا عقیدہ تو یہ ہے کہ عیش و عشرت وہی ہے جو آج حاصل ہو ۔

انسان

(۱۲۶)

حلِ لغات رازجُو : بھیدوں کو تلاش کرنے والا ۔ آگہی : جاننا ، واقف ہونا ۔

جادہ : راستہ ؛ سحر خیز : صبح کو اٹھنے والا ؛ برخیز : اٹھنے اور کھڑا ہونے کا حکم ؛ نمود : اظہار، ظاہر ہونا۔

؎ قدرت کا عجیب یہ ستم ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ عجیب و غریب ستم کیا ہے کہ ایک طرف تو اُسے ایسی طبیعت عطا کر دی جو ہر لحظہ کائنات کے بھیدوں کو جاننے کی کوشش میں لگی رہے۔ اور دوسری طرف انسان کی نگاہوں سے کائنات کے تمام راز چھپا دیئے ہیں۔ انسان کے دل و دماغ میں اشیاء کو جاننے کا شوق بے چین و مضطرب ہے لیکن اِس اضطراب و بے چینی کے باوجود انسان پر زندگی کا راز منکشف نہیں ہوتا۔ انسان کو اپنی سعی اور کوشش کی ابتداء اور انجام پر صرف حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کیوں نہ ہو شیشے کے گھر میں اس کے علاوہ اور مل بھی کیا سکتا ہے۔ اقبال نے اِس کائنات کو شیشے کا گھر قرار دیا کہ آئینہ بھی حیران رہتا اور حیران کر دیتا ہے اور اس کائنات کے راز بھی انسان کو حیرت زدہ کئے رکھتے ہیں۔

؎ ہے گرمِ خرام موجِ دریا ۔ ۔ ۔

وضاحت دریا کی لہریں تیزی سے سفر کر رہی ہیں جبکہ دریا ہمہ وقت سمندر کی طرف جانے والے راستے کو ناپ رہا ہے یعنی سمندر کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔ ہوا کے دوش پر بادل اُڑا جا رہا ہے۔ تارے اپنے اس انداز کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں جو ازل سے اُن کیلئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ وہ آسمان کے قید خانے میں مقید ہیں اور اُن کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ صبح کو اُٹھ کر مصروفِ عبادت ہونیوالا سورج اور ساری کائنات کے لئے اٹھنے اور اپنے کام دھندے میں مصروف ہونے کا حکم لانے والا سورج شام کے وقت مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ جاتا ہے اور وہاں شفق کی شراب پیتا ہے۔

اِس طرح دیکھا جائے تو پتا چلے گا کہ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود اور زندگی کی لذت و مسرت سے سرشار ہو رہی ہے اور اپنے وجود کو ظاہر کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اِس پوری کائنات میں انسان کے دُکھ بانٹنے والی کوئی ہستی نہیں ہے۔ چاروں طرف بیشمار مظاہرِ فطرت ہونے کے باوجود انسان کائنات کے رازوں کو پانے کے معاملے میں ضرور اکیلا رہتا ہے۔ اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے شب و روز کس قدر تکلیف دہ ہیں۔

جلوۂ حسن

(۱۲۷)

تعارف اِس دور کی دیگر نظموں کی طرح "جلوۂ حسن" کے سنہ تصنیف کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔ اِس نظم کے وہ دو شعر باقیاتِ اقبال اور روزگارِ فقیر میں درج کئے گئے ہیں جو نظر ثانی میں حذف کر دیئے گئے تھے۔

حلِ لغات آغوش : گود۔ ابدی : ہمیشہ رہنے والا۔ سر بہ گریباں ہونا : غور و فکر کرنا۔ گریزاں ہونا : پہلو بچانا۔ ادراک : عقل، سمجھ۔ خاتم : انگوٹھی۔

ے جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب — — —

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ حسن جو ہماری آرزوؤں کو بیتاب و مضطرب کئے رکھتا ہے، جس کی پرورش جوانی اپنے تخیل کی گود میں کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ عارضی اور بہت جلد فنا ہو جانے والی دنیا ہمیشگی پا لیتی ہے اور جس کی وجہ سے خود جوانی بھی ایک نہایت ہی رنگین اور قابلِ توجہ کہانی کے مرتبے پر فائز ہو جاتی ہے۔ وہ حسن جو ہمیں غور و فکر سکھاتا ہے اور جس کی وجہ سے ہم اپنے حال اور اِس کے مسائل سے کٹ جاتے ہیں جو ہماری سوجھ بوجھ اور عقل کی خامیوں کو دور کر دیتا ہے اور جس کی وجہ سے عقل و خرد تاثر و احساس کے تابع ہو جاتی ہے۔ کیا اِس دنیا میں وہ حسن کہیں موجود بھی ہے؟ اگر اِس کائنات اور زمانے کو انگوٹھی فرض کیا جائے تو حسن اس کے نگینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن حسن کے نہ ہونے کے باعث یہ انگوٹھی ایسی ہے جو نگینے سے خالی ہو۔

ایک شام

(۱۲۸)

تعارف یہ نظم ۱۹۰۷ء میں اُس وقت لکھی گئی تھی جب علامہ اقبال فلسفے میں پی ایچ ڈی

کرنے کے لئے جرمنی کے شہر میونخ میں مقیم تھے۔ علامہ میونخ سے چند روز کے لیے ہائیڈل برگ گئے تاکہ وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کر سکیں۔

حلِ لغات نیکر: جرمنی کا ایک دریا جو دریائے رائن کا معاون دریا ہے۔ ہائیڈل برگ دریائے نیکر کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ **نوا فروش**: نغمے گانے والے یعنی خوش الحان پرندے۔ **سبز پوش**: سبز پتوں سے ڈھکے ہوئے درخت مراد ہیں۔ **سکوت**: خاموشی۔ **فسوں**: جادو۔ **بے درا**: گھنٹی کے بغیر۔ **مراقبہ**: گردن جھکا کر غور و فکر کرنے کا عمل، بالکل خاموش بیٹھ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہونے کا عمل۔ **استغراق**: گیان دھیان۔

؎ خاموش ہے چاندنی قمر کی ـ ـ ـ

وضاحت چاند کی چاندنی بالکل خاموش ہے اور درختوں کی شاخوں پر بھی خاموشی طاری ہے اس وادی کے تمام پرندے اور پہاڑوں پر اُگے ہوئے تمام درخت بالکل خاموش کھڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مظاہرِ فطرت کی ہر چیز اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے اور رات کی گود میں سو رہی ہے۔ چاروں طرف خاموشی کا کچھ ایسا جادو چل رہا ہے کہ دریائے نیکر کا بہتا ہوا پانی بھی ساکن نظر آتا ہے۔ ستاروں کا قافلہ بھی نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے اور یہ قافلہ گھنٹی کی آواز کے بغیر رواں دواں ہے۔ اس وادی کے پہاڑ، صحرا اور دریا سب خاموش ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے فطرت نہایت انہماک کے ساتھ گیان دھیان اور غور و فکر میں مصروف ہے۔

اے دل ایسے میں تجھے بھی خاموش ہو کر غم کی آغوش میں سو جانا چاہیئے۔

تنہائی

(۱۲۹)

تعارف ابتدا میں یہ نظم سات اشعار پر مشتمل تھی۔ نظرِ ثانی میں دو شعر حذف کر دیے گئے جو باقیاتِ اقبال اور روزگارِ فقیر میں درج ہیں۔

حلِ لغات حزیں: غمگین۔ ہمنشیں: ساتھی۔ **رفعت**: بلندی۔

خوابیدہ : سوئی ہوئی ؛ ہم نفس : ساتھی ۔

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا ۔ ۔ ۔ ۵

وضاحت اے انسان اِس دنیا میں تو خود کو تنہا اور اداس کیوں محسوس کرتا ہے ۔ اس سے کیا حاصل ہو سکتا ہے اور اِس کی ضرورت بھی کیا ہے ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ رات کی اِس تنہائی میں ستارے بھی تیرے ساتھی ہیں ۔ تو ذرا غور کرے تو تجھے معلوم ہوگا کہ آسمان اپنی تمام تر بلندی کے باوجود بھی خاموش ہے ۔ زمین سوئی ہوئی ہے اور پوری دنیا شور و شغب سے خالی ہے ۔ مظاہرِ فطرت کو دیکھئے ان میں چاند صحرا اور پہاڑ سب کچھ شامل ہے ۔ ان کی وجہ سے تمام کائنات پھولوں کا تختہ اور گلستان بنی ہوئی ہے ۔ اِس سے بھی زیادہ یہ کہ تیرے پاس آنسو بھی ہیں جو ستاروں اور موتیوں کی طرح ہیں ۔ ان سب چیزوں کے باوجود اے دل ! تجھے آخر کس چیز کی تمنا ہے جب کہ تمام مظاہرِ فطرت تیرے جذبات کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہو کر تیرے ساتھی بن چکے ہیں ۔

پیامِ عشق

(۱۲۹)

تعارف اِس نظم کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر مطالبِ بانگِ درا میں لکھتے ہیں :

" یہ نظم غالباً ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی اور مخزن میں چھپی تھی ۔ اقبال کی فکر و نظر میں بنیادی تبدیلی اُسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب وہ ولایت پہنچے تھے ۔ آہستہ آہستہ اس تبدیلی کا رنگ گہرا ہونے لگا ۔ پیامِ عشق اِس حالت کا ابتدائی نقشہ پیش کر رہی ہے "

پیامِ عشق کے چار شعر جو نظرِ ثانی میں حذف کر دیئے گئے تھے روزگارِ فقیر میں موجود ہیں ۔

حلِ لغات ناز : فخر ، افتخار ، ادا ، نخرہ ، یہاں مراد محبوب ؛ نیاز : عجز ، انکسار ، یہاں پر عاشق مراد ہے ؛ غزنوی : فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی ؛

سومنات : ہندوؤں کا ایک بہت ہی متبرک شہر جس کے مندر میں رکھے ہوئے بتوں کو سلطان محمود غزنوی نے توڑا تھا ؛ ایاز : سلطان محمود غزنوی کا ایک نائب جو کچھ عرصے تک پنجاب کا گورنر بھی

رہا۔ ایاز اگرچہ سلطان محمود کے حکام و عمال میں سے تھا لیکن شعری وادبی روایات میں اُسے سلطان کا محبوب قرار دیا جاتا ہے۔ بعض روایتوں میں اُسے محمود غزنوی کا عاشق بھی کہا گیا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ وہ سلطان کی فرمانبرداری میں دوسرے حکام و اعمال سے کہیں آگے تھا۔ **گردوں** : آسمان ؛ **شانِ سکندری** : مشہور یونانی بادشاہ سکندر جیسی شان وشوکت ؛ **پیکار** : جنگ، کشمکش ؛ **ہلال** : پہلی رات کا چاند ؛ **گلچیں** : پھول توڑنے والا ؛ **وفور** : زیادتی ؛ **شمعِ سوزاں** : جلتی ہوئی شمع ؛ **مجازی** : غیر حقیقی ؛ **آذری** : بت تراشی، بت پرستی ؛

سن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا ۔۔۔

وضاحت اے اپنے دل میں عشق کا درد پیدا کرنے والے انسان! تو ذرا توجہ سے میری بات سن میں ناز و ادا یعنی محبوب ہوں اور تو عاشق بن جا اور عجز وانکساری کا رویہ اختیار کرے۔ میں دل کے بت خانے کا غزنوی ہوں۔ میرے مقابل تجھے ایاز ہو جانا چاہیئے یعنی تجھے میرے سامنے اسی عجز وانکساری اور فرمانبرداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے جو محمود کے سامنے ایاز اختیار کرتا تھا۔ دنیا میں عروج اور کمال حاصل کرنے کے لیے سکندر جیسے عظیم بادشاہ کی شان وشوکت ضروری نہیں ہوتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عروج حاصل کرنے اور اپنی شخصیت کو بہتر بنانے کا تمام سامان تیرے سینے میں رکھ دیا ہے۔ بس تجھے خود آئینہ ساز ہو کر اس سارے سامان کو اپنے کام میں لانا چاہیئے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو تجھے بھی کمال حاصل ہو جائے گا۔ اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر مطالبِ بانگِ درا میں لکھتے ہیں کہ جب سکندر نے مصر فتح کیا تو اوّل تو یہاں پر اپنے نام سے ایک شہر بسایا۔ پھر اس ساحلی شہر میں بحری جہازوں کی رہنمائی کے لیے ایک بہت بلند مینار تعمیر کرایا جس میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی اور ملاحوں کو اس کی روشنی میں سمتوں اور اپنی منزل کے تعین میں آسانی رہتی تھی۔ شعراء نے بعد ازاں اسی مینار کو جادوئی آئینہ کہنا شروع کر دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جادوئی آئینہ یا مینار تعمیر کرنا صرف سکندر سے مخصوص نہیں بلکہ کوئی شخص بھی عزم وہمت سے کام لے تو اس قسم کے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ اس شعر کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ حضرت علامہ نے یہاں وہی بات کہی ہے جو بعد ازاں ان کے فلسفۂ خودی کی بنیاد قرار پائی۔

زندگی میں جدوجہد اور کشمکش کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس کشمکش اور جدوجہد سے گزر کر تو عروج حاصل کرے اور اگر تیری مثال پہلی رات کے چاند کی طرح ہے تو کشمکش سے گزرنے کے بعد تیری ذات میں نکھار پیدا ہو اور تو بدرِ کامل بن جائے۔ تُو اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ایک خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ تجھے چاہیئے کہ اپنی پوری صلاحیتیں اِس مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دے۔ جس طرح نماز پڑھے بغیر ادا نہیں ہوسکتی اسی طرح اِس مقصد کے حصول کے بغیر تو بھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

اے پھول توڑنے والے! تجھے صبر و قناعت کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ اِس سے تیری شان و شوکت برقرار ہے۔ اگر بالفرض گلستان میں اتنے پھول کھلے ہوئے ہیں کہ تیرے دامن میں سمانا مشکل ہے تو پھولوں سے دستِ کش ہونے کی بجائے تجھے اپنے دامن کی وسعت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔

اِس شعر میں علامہ اقبال صوفیوں اور رہبانیت پسند ملاؤں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب وہ دَور نہیں رہا جب زندگی اور اِس کے مسائل سے صرفِ نظر کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بیٹھ جانے پر بھی گذارہ ہو جاتا تھا۔ اب اِس رہبانیت اور صحرا نوردی کو ترک کر کے جلتی ہوئی شمع کی طرح محفل کو روشن و منور کرنا چاہیئے۔ یعنی اپنی صلاحیتوں سے قوم و ملّت کو فائدہ پہنچانا چاہیئے۔

افراد کی زندگی مجازی اور غیر حقیقی ہوتی ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شخص آج زندہ ہے اور کل نہیں۔ اس کے مقابلے میں قوم کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔ قوم زندہ رہتی ہے۔ اگر یہ اصول قبول کر لیا جائے تو پھر افراد کو چاہیئے کہ ذاتی اور انفرادی نفع و نقصان سے بے پروا ہو کر قوم کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہو جائیں اور مجاز کے جادو کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ علامہ اقبال کا شعر اُن کی فارسی مثنوی رموزِ بے خودی کے مضامین کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس مثنوی کا بنیادی موضوع بھی یہی ہے کہ فرد کو انفرادی خودی قومی و ملی خودی پر قربان کر دینی چاہیئے۔

اے اقبال! ہندوستان کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بت تراش اور بت پرست ہیں اور ان کا تعلق آزر سے بنتا ہے۔ انھوں نے قوم اور فرقوں کے بت تراش رکھے ہیں لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر قوم اور فرقوں کے بتوں کی پوجا کرنے کی بجائے تجھے حجاز کے راستے کی مٹی بن جانا چاہیئے۔ یعنی ایک مسلمان کو نسلی اور فرقہ پرستی کے بتوں کی نفی کر کے محض اسلام کا علم بردار ہونا چاہیئے۔

فراق

(۱۳۱)

حلِ لغات عزلت : تنہائی ۔ دلبری : محبوبیت ۔ طفلک گفتار آزما : وہ بچہ جو ابھی بولنا سیکھ رہا ہو ۔ جلوس : میٹھنا ، یہاں پر ستاروں کا طلوع ہونا مراد ہے ۔ ناشکیبا : بے صبر ۔ شکیب : صبر ۔

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں — — —

وضاحت میں اپنے لیے کوئی ایسی جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہوں ، جہاں مجھے تنہائی میسر آسکے ۔ اسی لیے میں پہاڑ کے دامن میں آکر چھپ گیا ہوں ۔ یہاں پہاڑوں پر بہنے والے چشموں کے نغمے میں حد درجہ دلکشی اور محبوبیت ہے ۔ یہ نغمہ ایسا ہے جیسے کوئی بچہ بولنے کی کوشش کر رہا ہو ۔ چھوٹے بچے کی توتلی زبان بہت دلکش ہوتی ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ شام کا وقت ہے اور سورج کے غروب ہونے کے باعث پھیلنے والی شفق کے پس منظر میں شام کا ستارہ طلوع ہوا ہے ۔ دیکھنے والی آنکھ کے لیے یہ منظر جنت کے مناظر کی طرح حسین ہے ۔ ہجر اور فرقت کی شام کی خاموشی میرے لیے بہانہ ثابت ہوتی اور میرے محبوب کی یاد نے مجھے نغمے گانے پر مائل کر دیا ۔

یہ کیفیت ہے میری جانِ ناشکیبا کی — — —

وضاحت میری بے صبر اور مضطرب و بے چین روح کی حالت ایک چھوٹے اور تنہا بچے جیسی ہے ۔ چھوٹا اور تنہا بچہ بولنے کی کوشش میں غوں غاں کرتا ہے اور اس سے جو آواز پیدا ہوتی ہے ۔ اُسے وہ کسی دوسرے شخص کی آواز سمجھ کر خوش ہوتا ہے ۔ میں بھی اس چھوٹے تنہا بچے کی طرح اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یوں نغمے گا گا کر اپنی شبِ فراق کو فریب دینے کی کوشش میں مصروف ہوں ۔ نسیم امروہوی فرہنگِ اقبال میں لکھتے ہیں کہ اس نظم میں وہی کیفیت ہے جو مومن کے درج ذیل شعر میں ہے ۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

عبدالقادر کے نام

(۱۳۲)

تعارف یہ نظم شیخ عبدالقادر کے نام ایک خط کے طور پر لکھی گئی تھی۔ شیخ عبدالقادر نے دسمبر ۱۹۰۸ء میں اسے اپنے ایک نوٹ کے ساتھ مخزن میں شائع کر دیا۔ یہ نظم اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں علامہ اقبال نے ایک داعی کی حیثیت سے اپنے آئندہ منصوبوں کا تفصیلی خاکہ پیش کر دیا ہے۔

یہ نظم ابتداء میں سولہ اشعار پر مشتمل تھی۔ نظرثانی میں پانچ شعر حذف کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ، مطالب بانگ درا اور باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔

حلِ لغات **خاور**: مشرق۔ **سپند**: ہرمل۔ **بساط**: طاقت، حیثیت۔ **صیقل**: صفائی، جلا۔ **امروز**: آج، حال۔ **فردا**: آنے والی کل، مستقبل۔ **گم گشتہ**: کھویا ہوا۔ **زلیخا**: مصر کے بادشاہ عزیز مصر کی بیوی جو حضرت یوسفؑ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ **یثرب**: مدینہ منورہ کا پرانا نام۔ یہاں پر اسلامی ممالک مراد ہیں۔

۵ اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر

— — — —

وضاحت حضرت علامہ اقبال ایک داعی اور پیغامبر کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مشرقی افق پر جسے روشنی کا منبع ہونا چاہیئے تھا، تاریکی اور اندھیرا چھا گیا ہے۔ ایسے میں ہمیں جدوجہد کرنی چاہیئے اور دلوں کو تڑپا دینے والی شاعری سے اپنی محفل کو روشن کر دینا چاہیئے۔

ہمارے پاس ہرمل کے دانے جیسی غوغا آرائی تو ہے۔ ہمیں چاہیئے اسی فریاد اور ہنگامے سے کام لے کر اپنے ارد گرد کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیں۔

محفل میں موجود تمام لوگوں پر یہ بات واضح کر دیں کہ اگر عشق کو اپنے شب و روز سنوارنے اور نکھارنے کے کام میں لایا جائے اور ہر کام سچے جذبے اور والہانہ تڑپ سے کیا جائے تو ہمارے حال کا پتھر مستقبل کے آئینے میں بدل سکتا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کے حال کو پتھر قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ محنت میں مسلمان تنزل کا شکار ہیں۔ جبکہ شاعر نے مستقبل کو آئینہ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ محنت کے بعد آنے والا دور یقیناً عروج و فراغت کا دور ہو گا۔

اپنی قوم کو اس کے تابناک ماضی کی جھلک دکھا کر اس کے افراد کے دلوں میں وہی جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیں جو یوسف کو دیکھنے کے بعد زلیخا کے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال نے اِس شعر میں، قوم کو زلیخا سے اور قوم کے روشن ماضی کو یوسف سے تشبیہ دی ہے۔

اپنی قوم کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے قاعدے سے اِس حد تک آشنا کر دیں کہ اگر یہ شبنم کا ایک بے حیثیت قطرہ ہے تو ترقی کر کے دریا میں بدل جائے۔ یعنی قوم زوال کا شکار ہے لہٰذا اسے زوال کی کیفیت سے نکال کر عروج کی منزل کی طرف گامزن کرنے کی کوشش کی جائے۔

اب تک ہم چین کے بتکدے میں رکھے ہوئے بتوں کے عاشق و شیدائی تھے۔ لیکن اب ہمیں چاہیئے کہ چین کے بتکدے سے اپنا ساز و سامان اٹھا لیں اور اِس سے رشتہ منقطع کر کے اپنی پوری قوم کو اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی اصولوں کا گرویدہ و عاشق بنا دیں۔ مراد یہ ہے کہ قوم جو اپنے عادات و اطوار اور رسم و رواج کے اعتبار سے مسلمان ہونے کے باوجود کفر سے قریب تر ہے، اسے دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل کر دیں کہ یہی اس کی ترقی کا راز ہے۔

ذرا غور کرو گے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اب اسلامی دنیا میں لیلیٰ کی اونٹنی بیکار ہو چکی ہے اور اب اس میں اتنی صلاحیت نہیں رہی کہ وہ عشاق کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔ لہٰذا اب یہ بات لازم ہے کہ مجنوں کو نئی نئی آرزوؤں اور تمناؤں سے واقف کر دیں۔ مراد یہ کہ اب اسلامی ممالک اور مسلمان اپنی پرانی ڈگر پر چل کر ترقی نہیں کر سکتے۔ اِس کے لیے اب نئے وسائل و ذرائع ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔

اب عام سی شراب پلا کر لوگوں کو مدہوش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اب تو بہت پرانی اور بہت تیز شراب چاہیئے۔ ایسی شراب جو شیشہ، پیمانہ اور مینا یعنی تمام آلاتِ مےنوشی کو پگھلا کر رکھ دے۔ یہاں پر شراب سے مراد اصولِ زندگی ہیں اور شیشہ، پیمانہ اور مینا کا مطلب اُمتِ اسلامیہ کے مختلف طبقوں اور حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔

مغرب میں شدید سردی کے باوجود جو داغ ہمیں مصروفِ جدوجہد رکھتا تھا ہمیں چاہیئے کہ اب اُسے مزید نہ چھپائیں۔ بلکہ اپنا سینہ چاک کر کے وہ داغ سب کو دکھا دیں۔ یہاں پر سردی سے مراد یورپ کے موسم کی شدید سردی بھی ہے اور تہذیبِ فرنگ کی وہ تاثیر بھی جو رفتہ رفتہ دلوں سے حرارتِ ایمانی کو سرد کر دیتی ہے۔ اِس کے علاوہ اِس شعر سے علامہ اقبال اور شیخ عبدالقادر کے بارے میں یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زمانۂ طالب علمی کے باوجود یہ دونوں عظیم شخصیتیں یورپ میں ملّت کی بہتری کے منصوبے بناتی رہتی تھیں۔ داغ سے اِسی جدوجہد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال شمع کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شمع کو دیکھئے۔ شمع خود جلتی ہے لیکن اِس کا سوز و ساز اور اُس کی جلن دوسروں کے لیے بھی روشنی کا باعث بن جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہمیں بھی یہی کرنا چاہیئے۔ ہمیں نقصان ہو تو بھی قوم و ملّت کے فائدے کے لئے ہمیں اپنا مشن جاری رکھنا چاہیئے۔ تاکہ ہماری قوم ترقی کر سکے۔

اقبال اِسی تشبیہہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان بہت کچھ سوچتا ہے۔ بہت سی باتیں اُس کے خیال میں آتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ اُس کے سب خیالات ظاہر و نمایاں ہو جائیں، لیکن شمع ایسا نہیں کر سکتی۔ شمع پر جو کچھ گذرتی ہے وہ اُس کی زبان پر آجاتی ہے اور لوگ اُس کی حالت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ دراصل سوچنے اور جلنے میں بہت فرق ہے۔ خیال کو چھپایا جا سکتا ہے۔ لیکن جلنے کی کیفیت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ مطلب یہ کہ ہمیں بھی شمع کی روش اختیار کرنی چاہیئے کہ جو کچھ ہمارے دل پر گذرے وہ نہایت دیانتداری اور خلوص کے ساتھ ہماری شاعری کا جزو بن جائے۔

صقلیہ

(۱۳۳)

تعارف جولائی ۱۹۰۸ء میں علامہ اقبال نے یورپ سے ہندوستان آتے ہوئے بحری جہاز پر سے صقلیہ کی روشنیاں دیکھیں تو انھیں اِس جزیرے کا وہ ماضی یاد آگیا جب یہاں اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی عملداری کا غلغلہ تھا اور جہاں اب ڈھونڈے سے بھی اسلامی تہذیب کے آثار نہیں ملتے۔ انھیں جذبات کے ہجوم میں علامہ اقبال نے یہ نظم لکھی جو اگست ۱۹۰۸ء کے مخزن میں شائع ہوئی اور "مرثیہ سسلی" کے نام سے مشہور ہوئی۔

نظر ثانی میں اِس نظم کا کوئی شعر حذف تو نہیں ہوا البتہ کچھ اشعار میں ترامیم کی گئیں۔ ترمیم شدہ اشعار اپنی پہلی شکل میں باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حلِ لغات دیدۂ خونناب بار: خون کے آنسو بہانے والی آنکھ، بہت زیادہ رونے والی آنکھ۔ بازی گاہ: کھیل کا میدان۔ عصر کہن: پرانا زمانہ

ناصبور : بے صبر ۔ **قُم** : عربی زبان میں اٹھنے اور کھڑے ہونے کیلئے صیغۂ امر ۔ یہاں پر حضرت عیسٰیؑ کے معجزے کی طرف اشارہ ہے ۔ وہ 'قُم' کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیتے تھے ، دوبارہ زندہ کرنا ۔ **مدام** : ہمیشہ ۔ **ابنِ بدرون** : عربی زبان کا ایک مشہور شاعر ، درحقیقت شاعر کا نام ابن عبدون تھا ۔ ابنِ بدرون جس کے کلام کا شارح تھا ؛ **ایام سلف** : گذرے ہوئے دن ، ماضی ۔

؎ رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار ۔ ۔ ۔

وضاحت اے میری خون کے آنسو رونے والی آنکھ ! اب تو دل کھول کر رو لے ۔ وہ سامنے عرب مسلمانوں کی تہذیب کا مزار نظر آ رہا ہے ۔ ایک زمانے میں یہاں پر صحرا میں رہنے والے اُن مسلمانوں کا دور دورہ تھا جن کے جہازوں کے لیے سمندر محض کھیل کے میدان کی حیثیت رکھتا تھا ۔ اور جن کے خوف سے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں زلزلے آجاتے تھے اور جن کی تلواروں میں بجلیاں بھری ہوتی تھیں ۔ یعنی جس طرح آسمان پر بجلی چمکتی ہے اسی طرح ان مسلمانوں کی تلوار میدانِ جنگ میں چمکتی اور لہراتی تھی ۔ وہ عرب مسلمان جو دنیا میں ایک نئے پیغام کا باعث بنے اور جن کی بے صبر دیے تاب تلوار پرانے زمانے اور اُس کی فرسودہ روایات کو کھا گئی ، جن کے حکم سے مردہ دنیا دوبارہ زندہ ہو گئی اور آدمی توہمات کی زنجیروں سے آزاد ہوا ۔ جن کے غلغلوں اور ہنگاموں سے ہمارے کان اب تک لطف حاصل کر رہے ہیں اقبال پوچھتے ہیں کہ کیا وہ نعرۂ تکبیر اور خدا کی عظمت بیان کرنے والی آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہے ۔ یہ سوال اس لیے پوچھا گیا کہ عربوں کے زیرِ حکومت رہنے والا یہ جزیرہ جب یورپی استعمار کے قبضے میں چلا گیا تو یہاں سے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا ایک ایک نقش مٹا دیا گیا ۔

؎ آہ ! اے سسلی ! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے جزیرۂ سسلی سمندر کی عزت تیری وجہ سے ہے ۔ اگر سمندر کو پانی کا صحرا قرار دیا جائے تو تیرا وجود اس صحرا میں بھولے بھٹکے جہازوں کے لئے اور انسانوں کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے ۔ علامہ اقبال نے جزیرۂ سسلی کو تل سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ خدا کرے تو تل کی طرح سمندر کے چہرے کی زیب و زینت اور آرائش کا باعث بنا رہے اور جہاز رانوں کو تیری شمعوں اور روشنیوں سے اطمینان ملتا رہے ۔ خدا کرے کہ سمندر میں سفر کرنے والوں کے لیے تیرا نظارہ ہمیشہ ہمیشہ موجود رہے اور تیری موجیں ہمیشہ ہمیشہ ترے ساحل کی چٹانوں پر ناچتی رہیں ۔ شاعر جزیرۂ سسلی کو ہمیشگی کی دُعا اس لئے دیتا ہے کہ اُس کے نزدیک یہ جزیرہ اُس قوم کی تہذیب کا گہوارا تھا جس کے نظارے کی حرارت 'وحدت اور روشنی ساری

دنیا کو متاثر کرتی رہی تھی ۔

؎ نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت بلبل شیراز یعنی شیخ سعدی نے بغداد کی تباہی پر نالہ وزاری کی۔ نواب داغ نے دہلی کے لٹنے اور برباد ہونے پر خون کے آنسو بہائے۔ جب گردشِ فلک سے غرناطہ کی حکومت پر زوال آیا تو مشہور اندلسی شاعر ابنِ بدرون کے دکھیا دل نے آہ و فریاد کی۔ لیکن اے جزیرۂ سسلی تیرے ماتم کا فریضہ غم زدہ اقبال کے سپرد ہوا اور یوں قسمت نے تیرے مرثیے کے لیے اس شخص کو منتخب کر لیا جس کا دل تیری قدر وقیمت اور اہمیت کے علاوہ تیری حالت سے بھی واقف و آگاہ تھا۔

؎ ہے تیرے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں ۔ ۔ ۔

وضاحت تیری پرانی اور برباد ہو جانے والی عمارتوں میں کس کی داستان چھپی ہوئی ہے؟ گو تیرا کنارہ بظاہر خاموش ہے لیکن اسے دیکھ کر یہ خیال گذرتا ہے کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اے جزیرۂ سسلی تو اپنا دکھ درد اور اپنی کیفیت بے کم وکاست مجھے بتا دے۔ اس لئے کہ میں دردمند ہونے کے باعث تیری کہانی سُن سکتا ہوں۔ دراصل جس قوم نے تجھے اپنی منزل بنایا تھا اور جو لوگ تیری سرزمین پر آباد ہوئے تھے میں بھی اُنہی لوگوں کے قافلے کی گرد ہوں۔

اے جزیرۂ سسلی تو پرانی تصویر میں رنگ بھر کے یعنی اُسے واضح کرکے دکھا دے اور گزرے ہوئے زمانے کی کہانیاں سُنا کر مجھے بے چین و بیتاب کر دے۔ میں تیری کہانی کو تحفہ تصور کرکے ہندوستان لے جاؤں گا۔ تیری زبانی یہ قصہ سن کر میں یہاں رو رہا ہوں اور جب میں یہ قصہ ہندوستان میں سناؤں گا تو وہاں بھی لوگ انقلاب او رگردشِ زمانہ پر آنسو بہائیں گے۔

غزلیات حصّہ دوم

غزل ۱

(۱۳۵)

حلِ لغات دم : سانس ۔ رم : جانا ، رخصت ہونا ۔ محرم : واقف ، جاننے والا ۔ زائر : زیارت کرنے والا ۔ زمزم : خانۂ کعبہ میں کھدے ہوئے ایک کنوئیں کا پانی جسے حاجی اپنے ساتھ تحفے کے طور پر لاتے ہیں ۔

؎ زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں ـــ ـــ ـــ

وضاحت انسان کی زندگی ایک سانس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۔ اور یہ سانس بھی کیا ہے ؟ صرف ہوا کی ایک موج جو رک نہیں سکتی ۔ آج اِدھر جاتی ہے کل اُدھر ۔ یعنی انسان کی زندگی پائیدار نہیں ہے ۔ اور نہ اِسے ہوا کی موج کی طرح قرار ہے بلکہ یہ بیقرار اور فانی ہے ۔

؎ گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر ـــ ـــ ـــ

وضاحت زندگی اچھی ہے نہ بُری ۔ ناخوشگوار ہے نہ خوشگوار ، بلکہ اِس کا اچھا یا بُرا ہونا انسانی تجربے پر منحصر ہے ۔ یہی بات اقبال نے پھول اور شمع کے حوالے سے واضح کی ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ پھول کے نزدیک زندگی صرف مسکرانے کا دوسرا نام ہے جبکہ شمع کے نزدیک رونے اور آنسو بہانے کے سوا زندگی کا کوئی مفہوم نہیں ۔ شاعر نے پھول کے کِھلنے کو اُس کی مسکراہٹ اور شمع کے پگھلنے اور اُس کے موم کے قطرہ قطرہ ہو کر بہنے کو آنسو قرار دیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کا خوشگوار سفر کرنے والے کے لیے زندگی خوشگوار ہے اور دکھیا دلوں کے لیے پریشان کُن ہے ۔

؎ رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو ـــ ـــ ـــ

وضاحت جب تک کوئی شخص زندگی کے رازوں سے واقف نہ ہو جائے ۔ اُس وقت تک زندگی اُس کے لئے راز ہی رہتی ہے لیکن جب کسی شخص پر یہ راز

کھل جائے تو پھر اُس شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کائنات کے تمام راز اس کے دوست بن گئے ہیں۔ یعنی تمام رازوں کا اس پر انکشاف ہو گیا ہے۔

ے زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی ۔۔۔

وضاحت اے اقبال! کعبہ کی زیارت کرنے والوں یعنی حاجیوں سے یہ بات پوچھنی چاہیئے کہ وہ حج سے واپس آتے ہوئے آبِ زمزم کیوں لاتے ہیں؟ کیا خانہ کعبہ میں اس سے بہتر کوئی دوسرا تحفہ نہیں۔ یعنی آبِ زمزم اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے علاوہ دین و ایمان کی حرارت ساتھ لانی چاہیئے۔

غزل ۲

(۱۳۵)

حلِ لغات **خجستہ پے** : مبارک قدم ؛ **سودائے بخیہ کاری** : سینے اور ٹانکنے کا جنون ؛ **سرپیرہن** : لباس ؛ **ہم نفس** : ساتھی، دوست ؛ **چرخِ کہن** : پرانا آسمان ؛ **معمار** : تعمیر کرنے والا، مراد آنحضرتؐ ؛ **حصار** : قلعہ ؛ **عقبیٰ** : آخرت ؛ **مدیر مخزن** : مشہور و معروف ادبی رسالے مخزن کے مدیر یعنی شیخ عبدالقادر جو علامہ اقبال کے گہرے دوست تھے ؛ **مذاقِ سخن** : شاعری کا شوق ؛

ے الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے ۔۔۔

وضاحت اقبال عقل پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ مبارک قدم والی عقل کو تھوڑی سی دیوانگی بھی سکھا دے۔ اس لئے کہ میں اپنے جنون اور سودا کی شدت کے باعث لباس برداشت نہیں کرتا اور اسے تار تار کر رہا ہوں جبکہ عقل اسے سینا چاہتی ہے جو جنون و سودا اور عشق کے بنیادی رویئے کے خلاف ہے۔

ے ملا محبت کا سوز مجھ کو تو بولے صبحِ ازل فرشتے ۔۔۔

وضاحت جب اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کیا اور مجھے محبت کی جلن بھی عطا کر دی تو فرشتوں

نے کہا کہ بیشک تجھے عشق کی جلن عطا کر دی گئی ہے لیکن دنیا میں تیری حیثیت شمعِ محفل کی بجائے مزار پر جلنے والی شمع کی ہوگی ۔ یعنی جس طرح قبر پر جلنے والی شمع اور اس کی روشنی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا بالکل اسی طرح یہ کائنات اور اِس کے مظاہر تیرے سوز سے بیگانہ رہیں گے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اِنسان بالکل تنہا ہے اور کوئی شے اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں شریک نہیں ہے ۔

؎ یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل ۔ ۔ ۔

وضاحت اے دل یہ دیس یہ دنیا ایسی ہے جہاں کسی دوست اور غمخوار کی توقع عبث ہے ۔ یہاں پر کوئی ساتھی نہیں مِل سکتا ۔ اگر اس کے باوجود تو کسی دوست کی خواہش کرتا ہے تو گویا تُو ایسی چیز چاہتا ہے جو اِس بوڑھے آسمان کے نیچے نابید ہے ۔

؎ نرال سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال نے اِس شعر میں غالباً پہلی بار نظریۂ وطنیت کی تنقیص کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج دنیا میں تقریباً تمام قومیں کسی خاص خطۂ ارض کے حوالے سے اپنا وجود رکھتی ہیں لیکن آنحضرتؐ نے ملتِ اسلامیہ کو بالکل نئی اور انوکھی ترکیب سے بنایا ہے ۔ ہماری ملّت کے قلعے کی بنیاد میں کسی وطن اور اُس کی وحدت کا تصور نہیں بلکہ اس کی بنیاد و اساس صرف اور صرف مذہب ہے ۔ علامہ اقبال ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۔

؎ اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

؎ کہاں کا آنا، کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ ۔ ۔ ۔

وضاحت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان عدم سے آتا ہے اور پھر مرنے کے بعد وہیں چلا جاتا ہے لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عدم و وجود اور دنیا و آخرت کا تصور محض دھوکا ہے ۔ ہم مسلمان ہیں اور کوئی دنیا خواہ وہ آخرت ہی کیوں نہ ہو، ہمارا وطن نہیں بن سکتی ۔ ہم تو ہمہ وقت ہر چیز میں موجود ہیں ۔

ے مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے - - - -

وضاحت کوئی مخزن کے مدیر یعنی سر عبدالقادر تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ وہ تمام قومیں جو دنیا میں اپنے کارناموں کی بدولت زندہ اور ترقی کے راستے پر گامزن ہیں، شعر و شاعری نہیں کرتیں اور بڑا نہیں اِس کا شوق ہے ۔ غالباً یہ شعر اُس دور کا ہے جب علامہ اقبال نے شعر گوئی ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور عبدالقادر اس فیصلے کے خلاف تھے۔

غزل ۳

(۱۳۶)

تعارف یہ غزل اپریل ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔ نظرِ ثانی میں اِس کے دو شعر قلمزد کر دیئے گئے ۔ قلمزد کئے جانے والے شعر باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں درج ہیں ۔

حلِ لغات **محشر** : قیامت ، ہنگامہ ؛ **صدف** : سیپ ؛ **کنارِ جو** : ندی کا کنارہ ؛ **نگارخانہ** : آراستہ مقام ؛ **گلچیں** : پھول توڑنے والا ؛ **ریاضِ ہستی** : زندگی کا باغ ؛ **عیب جُو** : نقص تلاش کرنے والا ، نقاد ؛ **سپاس** : شکر گزاری ؛ **مجاز** : حقیقت کی ضد ؛ **یارا** : طاقت ؛

ے زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا - - -

وضاحت جب میرے دل میں گفتگو یعنی شعر و شاعری کا ہنگامہ برپا ہو گا اور میری آواز لوگوں تک پہنچے گی تو ساری دنیا کو اِس کی خبر ہو جائے گی ۔ میں فی الحال خاموش ہوں لیکن درحقیقت یہ خاموشی نہیں ہے بلکہ یہ حرفوں اور لفظوں میں ڈھلنے والی آرزوؤں کا مقبرہ اور مدفن ہے جو ایک دن لوگوں کے سامنے آئے گا اور اُن کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گا ۔

ے جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری - - -

وضاحت زندگی کیا ہے ؛ اِس سوال کا جواب ہر شے اپنے احوال و ظروف اور تجربے کے

مطابق دیتی ہے۔ اقبال نے اِس حقیقت کو موج اور موتی کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دریا کی موج کی شان و شوکت اور عزت و تکریم بہتے رہنے اور مسلسل سفر کرتے رہنے میں ہے جبکہ موتی کی عزت اور شان و شوکت اِس وجہ سے ہے کہ وہ صدف میں بند ہو کر بالکل سکون کے ساتھ اپنی زندگی گذارتا ہے۔ اگر پانی کا قطرہ سیپ کی قید کے دُکھ اُٹھانے کی بجائے آزادی طلب کرے تو کبھی موتی نہ بن سکے۔ گویا زندگی کا مفہوم ہر شے کے تجربے اور اُس کی ضرورت کے مطابق متعین ہوتا ہے۔

ے نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے ـــ

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ محض تعلیم و تربیت کے باعث کسی کی طبیعت اور فطرت میں انقلاب لانا ممکن نہیں۔ اگر کسی کی طبیعت اخذ و قبول اور اصلاح کی طرف از خود مائل نہ ہو تو خواہ کتنی بھی تربیت کر لی جائے، مثبت نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ندی کے کنارے ایستادہ سرو کا پودا تو ندی کے پانی سے فیض یاب ہوتا اور سر سبز و شاداب رہتا ہے لیکن اس پودے کا عکس ہمہ وقت پانی میں رہنے کے باوجود پھلنے پھولنے سے عاری رہتا ہے۔

ے کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا ـــ

وضاحت اے اللہ مجھے اِس دنیا میں کوئی دل اور کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس میں کوئی نہ کوئی تمنا اور آرزو سوئی ہوئی نہ ہو۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو تیری دنیا کو آرزوؤں اور تمناؤں سے سجی ہوئی دنیا کہنا چاہیئے۔

ے کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا ـــ

وضاحت مرنے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ہماری زندگی اوّل تا آخر محض آرزوؤں کے جگائے ہوئے جادو کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جسے ہم تمام زندگی مٹی سے بنا ہوا جسم سمجھتے رہے وہ بھی دراصل آرزو ہی کے کوچے کی خاک اور گرد تھی۔

ے اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں ـــ

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی کوئی چیز گم ہو جاتی ہے تو وہ اُسے تلاش کرتا ہے۔ آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا گیا جس کی کوئی شے گم نہ ہوئی ہو اور پھر بھی وہ تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہو۔ مَیں اپنی کیفیت دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کو کسی منظر کی تلاش ہے اور میرے دل کو تلاش و جستجو کا جنون ہے۔ اِس تلاش و جستجو سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یقیناً میری کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ ورنہ میں سراپا تلاش نہ بنا ہوتا۔

ے چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا اتنا بیدرد کیوں ہے انساں ۔ ۔ ۔

وضاحت گلستان میں کلی پھول توڑنے والے سے کہہ رہی تھی کہ آخر انسان اس قدر ظالم اور بیدرد کیوں ہے ۔ انسان کے ظلم اور بیدردی کی کیفیت یہ ہے کہ میرا مٹکا ٹوٹتا ہے تو انسان اسے میری ہنسی اور مسکراہٹ کہتا ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کلی ادھ کھلے پھول کو کہا جاتا ہے جس کی مشابہت مٹکے سے ہوتی ہے اور جب کلی کھل کر پھول بنتی ہے تو اس کا مٹکا ٹوٹ جاتا ہے اور پتیوں کے جدا ہونے سے اس میں جا بجا دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن شاعر اسے پھول کی مسکراہٹ سے تعبیر کرتے ہیں ۔

ے ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا ۔ ۔ ۔

وضاحت زندگی کے باغ کے ایک ایک ذرے میں محبت کا جلوہ نظر آ رہا ہے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر پھول کی حقیقت پر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ پھول کا وجود اس بات پر منحصر ہے کہ خوشبو اور رنگ نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا عہد کر رکھا ہے ۔ اگر یہ عہد ٹوٹ جائے تو پھول کا وجود بھی ختم ہو جائے ۔ بظاہر یہ بات محض شاعرانہ لگتی ہے اور اسے صنعتِ حسنِ تعلیل کی ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ سائنس بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ زندگی صرف اس بات میں مضمر ہے کہ مختلف اشیاء ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتی رہیں اور ان میں یہ سلسلہ ایک خاص تناسب سے برقرار رہے ۔ بصورت دیگر پوری کائنات پلک جھپکتے میں تباہ ہو کر رہ جائے ۔ یہی بات اقبال نے ایک اور مقام پر کہی ہے ۔

ع ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے

ے تمام مضموں مرے پرانے کلام میرا خطا سراپا ۔ ۔ ۔

وضاحت میری شاعری کے تمام مضامین و موضوعات پرانے ہیں اور میری شاعری غلطیوں سے بھری پڑی ہے ۔ اس کے باوجود اگر کوئی نقاد میری شاعری میں کوئی خوبی دیکھتا ہے تو یہ نقاد کی غلطی اور نقص ہے ۔ اس شعر میں اُن ناقدین پر طنز کی گئی ہے جو اقبال کے کلام پر لفظی اعتراضات کیا کرتے تھے ۔

ے سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ میں اسے تیرا کرم اور مہربانی سمجھتا ہوں کہ تُو نے مجھے دل جیسی دولت عطا کی لیکن تیرا یہ کرم بھی ستم سے زیادہ تکلیف دہ ہے ۔ اس لئے کہ اوّل انسان کو دیا

جانے والا دل بہت چھوٹا سا ہے اور پھر وہ بھی آرزو کے دھوکے میں آیا ہوا ہے۔ اگر شکر گذاری ادب کی شرط نہ ہوتی تو یقیناً اِس کرم نما ستم کے بڑے چرچے ہوتے۔

ے کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے ـ ـ ـ

وضاحت اِس کائنات کی ہر چیز ایک ہی چیز سے تعلق رکھتی ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر تم نشتر کی نوک سے پھول کی ٹہنی کاٹنے لگو تو اِس ٹہنی سے انسان کا خون بہنے لگے گا۔ بادی النظر میں یہ شعر محض شاعر کے تخیل کی پیداوار لگتا ہے لیکن حیران کُن امر یہ ہے کہ جدید سائنس اِس کی مکمل طور پر توثیق و تصدیق کرتی ہے۔ مثلاً اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا کی ہر شے کچھ سالمات وجواہر کا مرکب ہے اور یہ جوہر الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون پر مشتمل ہے۔ نیز ہر جوہر کے الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون علی الترتیب یکساں خصوصیت کے حامل ہیں۔ یہی خیال علامہ اقبال نے ایک اور جگہ یوں واضح کیا ہے۔

ے حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

ے گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اُٹھائے ـ ـ ـ

وضاحت ایک زمانہ تھا جب لوگ دوسروں کی پیروی کر کے زندگی گذار لیتے تھے لیکن اب پیروی اور تقلید کا زمانہ گذر گیا۔ اب مجاز اور خلافِ حقیقت باتوں کو اپنا سامان سمیٹ کر رخصت ہو جانا چاہیئے۔ ویسے بھی جب حقیقت نمایاں ہو جائے تو پھر بات کرنے کی تاب وطاقت کس میں رہ جاتی ہے۔

ے جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے ـ ـ ـ

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے وطن یعنی ہندوستان سے دور انگلستان میں حصولِ تعلیم کے لئے مقیم ہوں تو میرے عزیز واقارب کو غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ اُن کے پیشِ نظر یہ بات رہنی چاہیئے کہ موتی اپنے وطن یعنی صدف سے دور جا کر ہی قیمتی بنتا ہے۔ موتی کی طرح میری عزت وتوقیر میں بھی وطن سے دور رہنے کی وجہ سے اضافہ ہو گا۔

غزل ۴

۱۳۸

تعارف یہ غزل دسمبر ۱۹۰۶ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرثانی میں چار شعر حذف کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ میں درج ہیں۔

حلِ لغات عیاں: ظاہر، نمایاں۔ شرارے: چنگاریاں۔ ہویدا: ظاہر، نمایاں۔ افتادگی: عجز، انکساری، خاکساری۔ گرہ بہاں گیر: معترض۔ استعارہ: بیان کی رُو سے مُشبہ بہ بول کر مشبہ مراد لینا۔ کسی لفظ کو مجازی معنوں میں استعمال کرنا۔ لن ترانی: اُس جواب کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰؑ کی طرف سے جلوہ دکھلانے کے تقاضے پر دیا تھا یعنی تُو میرا جلوہ نہیں دیکھ سکتا۔

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں — — —

وضاحت اے اللہ! بجلی، آگ اور چنگاری میں تیری ہی روشنی ہے۔ اسی طرح چاند، سورج اور ستاروں میں بھی تیری ہی جھلک اور تیرا ہی حُسن نمایاں ہے۔

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی — — — —

وضاحت اے اللہ! اگر آسمان بلند ہیں تو تیری وجہ سے اور اگر زمین پست وحقیر ہے تو تیری وجہ سے۔ سمندر کا بہاؤ بھی تیری وجہ سے ہے اور اگر ساحل ایک ہی جگہ پڑا خاکساری کا مظاہرہ کر رہا ہے تو اِس کا باعث بھی صرف تُو ہی ہے۔

شریعت کیوں گرہ بہاں گیر ہو ذوقِ تکلم کی — — — —

وضاحت میری گفتگو اور شاعری پر شریعت معترض ہوتی ہے۔ اِس اعتراض کو دور کرنے کا میں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ اب میں اپنے مطالب تشبیہ اور استعارے کے پردے میں کہہ جاتا ہوں۔ یوں دل کی بات بھی کہہ دیتا ہوں اور شریعت کو اعتراض کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

ے جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت انسان، درخت، پھول، پتھر اور ستارے سب ایک ہی حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بس ان میں فرق یہ ہے کہ جو صلاحیتیں انسان میں جاگ رہی ہیں وہ اِن تمام اشیاء میں محوِ خواب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں کو عزم و ارادہ کی وہ دولت حاصل نہیں جو انسان کا مقدر ہے۔

ے مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ مجھے محبت کے درد کے باعث بہنے والے آنسوؤں کی جلن نے جلا دیا ہے۔ یہ بظاہر پانی کے قطرے ہیں لیکن ان میں اس قدر گرمی اور آگ تھی جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ شاعر نے آنسو کو چنگاری سے تشبیہ دی ہے۔

ے نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو ۔ ۔ ۔

وضاحت میں اِس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو کچھ کر رہا ہوں آخرت میں اس کا کچھ صلہ پانے کی تمنا نہیں رکھتا۔ عام سوداگر نقصان سے بھاگتے اور نفع کے طلبگار ہوتے ہیں۔ لیکن میں ایسا سوداگر ہوں جو خسارے کو اپنا نفع سمجھتا ہوں۔

ے سکوں ناآشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ! پارہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے باعث ہر وقت متحرک رہتا ہے اور یہی اُس کی زندگی کا سامان ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے پارے میں بھی کسی دل کی تڑپ اور بے تابی چھپی ہوتی ہے۔

ے صدائے لن ترانی سُن کے اے اقبال میں چپ ہوں ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اقبال! وہ حضرت موسیٰؑ تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلوہ دکھانے کے تقاضے کا جواب سُن کر بھی اصرار کرتے رہے۔ مَیں یہ اصرار نہیں کر سکتا اور جلوہ دکھانے سے متعلق جواب سُن کر خاموش ہو گیا ہوں۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی فرقت اور جدائی کے غم نے مجھ میں اتنی طاقت ہی نہیں رہنے دی کہ میں اصرار کر سکوں۔

غزل ۵

(۱۳۸)

تعارف نظرِ ثانی میں اِس غزل کے جو دو شعر قلمزد کئے گئے تھے وہ روزگارِ فقیر میں درج ہیں۔

حلِ لغات افسردگی: مایوسی، غم واندوہ ۔ آسودگی: آرام ۔ ماہ سیما: چاند جیسی پیشانی والا یعنی بہت ہی زیادہ خوبصورت ۔

ع یُوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے دنیا! یُوں تو تیرے ہنگامے حد سے زیادہ اچھے اور دلکش تھے لیکن ان میں ایک خرابی بھی تھی کہ ہر منظر اور ہر تماشے میں کچھ اُداسی اور غم بھی ملا ہوا تھا جس کی وجہ سے مسرت وشادمانی کا صحیح لطف اٹھانا دشوار تھا۔ دراصل دنیا کی ہر چیز ناپائیدار ہے اس لئے خوبصورت اشیاء کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔

ع پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت جو شخص تمام عمر حکمت وفلسفہ اور عقل وخرد کی خاک چھانتا رہا تھا اور اِسی وجہ سے بے چین ومضطرب تھا اُسے محبت کے کوچے میں آکر آرام واطمینان نصیب ہوگیا۔

ع کس قدر اے مے تجھے رسمِ حجاب آئی پسند ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے شراب تجھے پردہ کرنا جس قدر پسند ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ تُو پہلے تو انگور کے پردے میں چھپی رہتی ہے۔ وہاں سے نکلتی ہے تو جام وسبو اور مینا میں چھپ جاتی ہے۔

ع حُسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ حُسن حواسِ ظاہری کو متاثر کرتا ہے۔ جبکہ علم کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ اِس طرح گویا علم حُسن سے مغلوب ہو جاتا ہے اور علم حُسن کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ لیکن دنیا بھر کے دانا اور عقلمند لوگ تمام عمر اِس بیکار کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح

علم کے ذریعے حسن کی تاثیر پر غالب آجائیں حالانکہ یہ ایک ناممکن بات ہے۔

میں نے لے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں یورپ میں خوامخواہ حسن اور اُس کی نزاکت ولطافت کی وہ صورت ڈھونڈتا رہا جو ہندوستان کے حسین لوگوں کا شیوہ تھی۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے تہذیبی فرق کی وجہ سے وہ بات یورپ میں مل ہی نہیں سکتی جو ہندوستانیوں کا شیوہ اور طریقہ ہے۔

غزل ۶

(۱۳۹)

حلِ لغات **طوف** : طواف کرنے کا عمل، کسی کے چاروں طرف گھومنا؛ **کلیم** : حضرت موسیٰؑ مراد ہیں اس لیے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کی تھی؛ **حجر** : پتھر **سحر** : جادو؛ **رام کرنا** : گرویدہ بنالینا؛ **مازنی** : اٹلی کا مشہور محب وطن شاعر جس نے آزادی اور جمہوریت کے لیے شدید تکالیف برداشت کیں۔ اِس کا پورا نام جوزف مازنی تھا۔ یہ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ اپنی تحریک اور خیالات کی وجہ سے قید بھی ہوا۔ قید ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ مازنی کے ذکر ہی سے اِس غزل کا سنہ تصنیف متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ غالباً اقبال نے یورپ سے واپسی پر اٹلی کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ شعر کہے تھے یعنی وسط ۱۹۰۸ء میں؛ **دیر** : بُت خانہ؛

مثالِ پرتوِ مے، طوفِ جام کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت ہم شراب کے عکس اور سائے کی طرح ہمیشہ جام کا طواف کرتے رہتے ہیں اور ہمارے نزدیک رات دن یہی کام کرتے رہنا ہی نماز ادا کرنے کے مترادف ہے یعنی ہمیں رات دن شراب پینے کے سوا کچھ کام نہیں اور یہ کام ہم عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔

؎ خصوصیت نہیں کچھ اِس میں اے کلیم تیری ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے موسیٰؑ! تونے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کی لیکن یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے جس پر فخر کیا جائے ۔ اِس لیے کہ اِس کائنات میں درخت اور پتھر تک اللہ تعالیٰ سے گفتگو کر لیتے ہیں ۔

؎ نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیئے کہ یہاں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے شمع لوگ تجھے جلاتے ہیں لیکن مکمل طور پر جل بجھنے سے پہلے ہی گل کر دیتے ہیں ۔ گویا اوّل تو جلایا جاتا ہے لیکن جلنے کا صحیح لطف بھی نہیں اٹھانے دیا جاتا اِس صورت میں کیا ضروری ہے کہ ہم اس دنیا میں رہیں ۔ ہمیں اپنے لیے کوئی نئی دنیا تلاش کرنی چاہیئے جہاں کم ازکم مکمل طور پر جل جانے کی آزادی تو ہو ۔

؎ بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے ساتھیو! اس چمن میں خاموشی بہتر ہے ۔ اِس لیے کہ جو گانا نہ جانتا ہو اُسے قفس میں بھی قید نہیں کیا جاتا ۔ ورنہ خوش آواز پرندوں کو تو جال میں پھانس کر قید کر دیتے ہیں ۔ یہ شعر عام اصولِ زندگی پر تو منطبق ہونا ہی ہے لیکن اُس دور کے ہندوستانی حالات کی بھی مکمل عکاسی کرتا ہے ۔

؎ غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت جو لوگ شراب اس لئے پیتے ہیں کہ اِس سے انھیں خوشی اور سرمستی و شادمانی حاصل ہو وہ حلال چیز کو بھی حرام کر دیتے ہیں ۔ گویا اقبال کے نزدیک شراب محض نشاط و سرمستی کے لئے نہیں پی جانی چاہیئے ۔ جیسا کہ غالبؔ نے بھی کہا ہے ۔

؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

؎ بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے واعظ! بھلا میرے اور تمھارے تعلقات کس طرح نبھ سکیں گے؟ اس لیے کہ میں زمانے میں محبت واخوت کو عام کرنے کا خواہاں ہوں جبکہ تم فرقہ بازی کے ذریعے عام لوگوں میں نفرت اور دشمنی کے بیج بونے پر آمادہ رہتے ہو ۔

؎ الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے خدا ان گدڑی پہننے والے بوڑھوں میں کیا جادو ہے کہ یہ صرف ایک نظر میں نوجوان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں ۔ یہاں خدا رسیدہ درویشوں کی تعریف کی گئی ہے ۔

؎ مَیں اُن کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت مَیں ان لوگوں کی محفلِ عیش و طرب دیکھ کر کانپ جاتا ہوں جو محض نام و نمود کی خاطر محفلِ عیش برپا کرتے اور فضول خرچیوں کے باعث اپنا گھر تباہ و برباد کر لیتے ہیں یا ایسی محافل کے انعقاد سے اپنے اسلاف کی نیک نامی کو بٹہ لگاتے ہیں ۔

؎ ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے جوزف مازنی جیسے محب وطن رہنما کے وطن یعنی اٹلی ! خدا کرے تو ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے ۔ ہم تیرے ساحل کے قریب سے جہاز کے ذریعے گذرتے ہوئے تیری عظمت کو سلام کرتے ہیں ۔

؎ جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اقبال جب کبھی نماز نہ پڑھنے والے کو نماز پڑھنے کا خیال آتا ہے تو وہ بت خانے سے بُلا کر مجھے اپنا امام بنا لیتے ہیں ۔

مارچ ۱۹۰۷ء

(۱۴۰)

تعارف علامہ اقبال نے یہ غزل مارچ ۱۹۰۷ء میں کہی تھی جیسا کہ اس کے اوپر درج ہے ۔ نظر ثانی میں ایک شعر قلمزد کر دیا گیا تھا جو باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں درج ہے ۔

یہ غزل تغزل کے تقریباً تمام صوری و معنوی تقاضے پورے کرتی ہے ۔ لیکن اپنے عنوان اور تسلسلِ مضامین کے اعتبار سے نظم کے دائرے میں بھی آتی ہے ۔ اِس کے علاوہ اِس غزل کی نمایاں خصوصیت

یہ ہے کہ اس میں علامہ اقبال نے کھل کر اپنے شعری وسیاسی مسلک کو واضح کیا ہے۔

حلِ لغات سکوت : خاموشی ۔ بادہ خوار : شراب پینے والا ۔ برہنہ : ننگا ، عریاں ۔ قدسی : فرشتے ۔ پیرِ میخانہ : شراب خانے کا مالک ۔ منہ پھٹ : کھری کھری بات کہنے والا ۔ خوار : ذلیل ، رسوا ۔ کم عیار : کسوٹی اور معیار پر پورا نہ اُترنے والا ، کھوٹا ۔ مورِ ناتواں : کمزور چیونٹی ۔ پابگل : جن کے پاؤں مٹی میں جکڑے ہوئے ہوں ، اسیر ، قیدی ۔ شرر فشاں : چنگاریاں بکھیرنے والی ۔ شعلہ بار : شعلے برسانے والا ۔ نفس : سانس ۔ لمحہ ۔

؎ زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا ۔ ۔ ۔

وضاحت اب وہ عہد آگیا ہے جس میں چہرے سے پردہ اُٹھے گا اور محبوب بغیر کسی شرط اور پابندی کے تمام لوگوں کو اپنے جلوے دکھائے گا ۔ پہلے تو ہمارا راز خاموشی کے پردوں میں چھپا رہتا تھا لیکن اب تمام پردے ہٹ جائیں گے اور یہ بھید ظاہر ہو جائے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے خیالات کو بے خوف وخطر ظاہر کر دوں گا ۔

؎ گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے ۔ ۔ ۔

وضاحت اب وہ دور ختم ہو گیا کہ پینے والے چھپ چھپ کر اور ڈر ڈر کر شراب پیتے تھے ۔ اب نیا زمانہ ہے اور اِس زمانے میں ساری دنیا شراب خانے کی حیثیت اختیار کرے گی اور دنیا کا ہر شخص بلا خوف وخطر شراب پی سکے گا ۔ دراصل اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے تو قوم وملت کی بہتری کے لئے کام کرنے پر ہزاروں طرح کی پابندیاں تھیں جنکی وجہ سے ملی درد رکھنے والے لوگ یہ کام بہت چھپ چھپ کر کیا کرتے تھے لیکن اب وہ ایسا کرنے کی بجائے علی الاعلان اپنے مقاصد کے لیے کام کریں گے ۔

؎ کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے ۔ ۔ ۔

وضاحت اپنے جوش وجنون کی شدت کے باعث جو لوگ صحراؤں اور جنگلوں میں آوارہ گردی کیا کرتے تھے اب وہ اپنی آوارہ گردی ترک کر کے پھر سے شہروں اور آبادیوں میں آجائیں گے ۔ گو ان کے پاؤں اب بھی ننگے ہوں گے یعنی ان لوگوں میں بستیوں اور شہروں میں آکر بھی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا وہی ذوق وشوق موجود ہو گا لیکن اب ان کے سامنے مشکلات کا ایک نیا میدان ہو گا ۔ یعنی پہلے صرف اصلاحِ ذات کی طرف توجہ تھی جو معاشرے سے کٹ کر زیادہ بہتر طور پر ہو سکتی تھی ۔ لیکن اب اصلاحِ قوم بنیادی مقصد ہو گا اور قوم کا درد رکھنے والے لوگ اسی ذوق وشوق سے اپنا نیا

فرض انجام دیں گے۔ لہٰذا اب انھیں مشکلات بھی مختلف قسم کی پیش آئیں گی۔

ے سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر — — —

وضاحت آخر کار حجاز نے خاموشی کے پردے میں انتظار کرنے والے کانوں تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ صحرا میں رہنے والوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا اُسے نئے سرے سے زندگی بخش جائے گی۔ یعنی اسلام اور اس کے حوالے سے مسلمانوں کو دوبارہ عظمت و ترقی نصیب ہوگی۔

ے نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا — — —

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ میں نے فرشتوں سے یہ بات سنی ہے کہ وہ شیر جس نے عرب کے صحرا سے نکل کر روم جیسی عظیم الشان سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، اب پھر بیدار ہوگا اور پھر اسے اپنے سود و زیاں کا احساس ہو جائے گا۔ یعنی مسلمان ایک بار پھر اپنے حقوق و فرائض بجا لاتے اور اسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں کامیابی حاصل کرنے کی جانب گامزن ہوں گے۔ یہ بات فرشتوں سے اس لیے منسوب کی گئی تاکہ زیادہ معتبر اور مصدقہ ہو جائے۔

ے کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں — — —

وضاحت جب شراب پلانے والے نے شراب پینے والوں میں میرا ذکر کیا تو شراب خانے کا مالک جو ان سب میں زیادہ تجربہ کار اور جہاندیدہ تھا، کہنے لگا کہ اقبال چونکہ مصلحت اندیش ہونے کی بجائے کھری کھری بات کہنے کا عادی ہے لہٰذا اپنی اس عادت کی وجہ سے ذلیل و رسوا ہوگا۔ اس لئے کہ سچی اور کھری بات کوئی بھی پسند نہیں کرتا اور سب لوگ ایسے شخص کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

ے دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — — —

وضاحت علامہ اقبال مغرب کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے دنیا کو اپنی تجارتی اغراض پوری کرنے کے لئے دکان سمجھ لیا ہے جبکہ حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ فی الحال تمھارا نقطۂ نظر تمھیں فائدہ پہنچا رہا ہے اور تم اپنے اس اصول کو کھرا اور فائدہ مند سمجھ رہے ہو لیکن بہت جلد یہ اصول کھوٹا اور کسوٹی پر پورا نہ اُترنے والا ثابت ہوگا۔

ے تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — — —

وضاحت علامہ اقبال اہلِ مغرب سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تمھاری تہذیب اپنے ہی ایجاد کردہ ہتھیاروں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرے گی۔ یہ محض دعوٰی نہیں ہے بلکہ اِس خیال کی بنیاد اِس اصول پر ہے کہ اگر کسی نازک شاخ پر گھونسلا بنایا جائے تو شاخ

وزن برداشت نہیں کر سکتی اور بہت جلد وہ گھونسلا برباد ہو جاتا ہے۔ اقبال نے یہی خیال ایک اور جگہ یوں پیش کیا ہے۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا ۔۔۔

وضاحت عام حالات میں کمزور چیونٹی کے لئے دریا پار کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے لیکن اگر چیونٹی دریا پار کرنے کا تہیہ کرے تو چیونٹیوں کا قافلہ پھول کی پتیوں کو جمع کر کے اُن سے اپنی کشتی بنالے گا اور موجوں کے اتار چڑھاؤ اور کشمکش کے باوجود یہ قافلہ دریا کے پار پہنچ جائے گا۔ اِس شعر میں مسلمانوں کو مورِ ناتواں کہا گیا ہے۔ دریا مشکلات کا استعارہ ہے اور سفینۂ برگِ گل سے وہ معمولی ساز و سامان مراد ہے جو عام حالات میں کفایت نہیں کرتا لیکن سچی لگن کی موجودگی میں کامیابی کی ضمانت بن جاتا ہے۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو ۔۔۔

وضاحت علامہ اقبال لالے کے پھول کو نمائش اور دکھاوے کا رسیا قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ لالے کے سینے پر سیاہ داغ نباتیاتی تقاضے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن لالہ پورے باغ میں ان داغوں کی نمائش کرتا پھرتا ہے۔ شاید اسے یہ خیال ہے کہ اس طرح دیکھنے والے اُسے بھی دل جلوں اور عاشقوں میں شمار کر لیں گے اور اِس طرح اس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہو جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ جھوٹے لیڈر قوم کو یہ دھوکا دے رہے ہیں کہ وہ قوم کے سچے خیر خواہ ہیں۔

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا ۔۔۔

وضاحت علامہ اقبال وحدت الوجودی خیالات کے مطابق دنیا کی تمام اشیاء کی اصل اور حقیقت اللہ تعالےٰ کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے نگاہ چاروں طرف بکھری ہوئی کائنات اور اس کے مظاہر اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں لیکن تو نے ان سب میں اختلافات اور امتیازات پیدا کر کے انسان کو دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر تیری حالت ایسی ہی ہے اور تو انسان کو اسی طرح دھوکا دیتی ہے تو اے نگاہ پھر تو ہی بتا کہ آخر تو کس حد تک قابل اعتبار رہے گی اور کون تیرا اعتبار کرے گا؟

؎ کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں ۔ ۔ ۔

وضاحت شعر کی تشریح سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ باغ کے دوسرے تمام درختوں کے مقابلے میں صنوبر کا درخت بہت قدآور ہوتا ہے اور سارے باغ سے نکلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے اُسے آزاد کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود دوسرے درختوں کی طرح اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں لہٰذا اسے پابگل اور اسیر بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس صورتحال کے پیشِ نظر جب میں نے قمری کو یہ بتایا کہ کائنات کے وہ تمام مظاہر جو آزاد تصور کیے جاتے ہیں اپنی آزادی کے باوصف مقید ہوتے ہیں تو غنچے نے فوراً کہا کہ یہ شخص یقیناً ہمارے گلشن کے رازوں سے واقف ہے۔

؎ خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے ۔ ۔ ۔

وضاحت نیکوکاری کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے لو لگائی جائے۔ دوسرا یہ کہ انسانوں اور دیگر مخلوقات کی خدمت کو اپنا شعار بنایا جائے۔ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں دوسرے طریقے کو ترجیح دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہزاروں لوگ علائق دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں میں جا بیٹھے ہیں۔ لیکن میں تو ان لوگوں کی غلامی اختیار کروں گا جنھیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے محبت ہو گی اور جو حقوق العباد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

؎ یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل، گناہ ہے جنبشِ نظر بھی ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال اس دنیا کو بزم فنا قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں کے قانون کے مطابق ہر دُکھ اور مُصیبت شکایت کئے بغیر برداشت کرنی چاہیئے اور ان مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انسان کی آنکھ تک نہیں جھپکنی چاہیئے۔ یعنی ایک لمحے کے لئے بھی اپنے مقصد سے غفلت نہ ہو۔ لیکن اے دل تو بہت ہی بے چین و بیقرار ہے اور اگر تیرے اضطراب کی یہی کیفیت ہے تو پھر اس بزم میں ہماری کیا عزت رہے گی۔ یہ شعر صوفیانہ مسلک سے بھی متعلق ہے اور اس کا مفہوم خدمتِ قوم سے متعلق بھی ہے۔

؎ میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو ۔ ۔ ۔

وضاحت اگرچہ رات اندھیری ہے اور میرا قافلہ اپنے راستے سے بھٹک گیا ہے اور ایسے میں اس کا منزل تک پہنچنا بہت دشوار ہے لیکن میں اس بچھڑے ہوئے قافلے کو لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں گا۔ روشنی کے لیے میری آہیں چنگاریاں برسائیں گی اور میرے سانس

سے شعلوں کی بارش ہوگی ۔ اِس شعر سے حضرتِ علامہ کا نظریۂ شعر و ادب بھی واضح ہو جاتا ہے اور اُن کے مستقبل کے ارادے بھی ۔

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تری زندگی کا ـ ـ ـ ـ

وضاحت اگر زندگی میں تیرا مقصد نمود و نمائش کے سوا کچھ نہیں ہے تو پھر تجھے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تجھے چنگاری کی طرح صرف ایک لمحے کی زندگی میسر آئے گی اور اس کے بعد تیرا خاتمہ ہو جائے گا ۔ یعنی نمود و نمائش کے ذریعے حاصل کی گئی شہرت محض چند روزہ ہوتی ہے جب کہ قوم و ملک کی خدمت کر کے انسان کا نام رہتی دنیا تک رہتا ہے ۔

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی ـ ـ ـ

وضاحت اقبال کا ٹھکانہ نہ پوچھئے ۔ اس کی کیفیت وہی پہلے جیسی ہے ۔ وہ اب بھی کہیں راستے میں بیٹھا محبوب کے انتظار کی تکلیف اٹھا رہا ہوگا

دورِ سوم

بلادِ اسلامیہ

(۱۲۵)

تعارف یہ نظم اپریل ۱۹۰۹ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں اس کے بعض شعر قلم زد کر دیئے گئے اور بعض میں جزوی ترامیم کی گئیں۔ سرودِ رفتہ میں قلم زد کئے گئے تو شعروں کے علاوہ دو ترمیم شدہ مصرعے بھی دیئے گئے ہیں۔

دورِ سوم کی پہلی ہی نظم "بلادِ اسلامیہ" دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ دورِ شاعری میں اسلامی دنیا ہی اقبال کا بنیادی موضوع رہے گی۔

حلِ لغات **مسجود**: جس کو سجدہ کیا جائے ؛ **غم دیدہ**: جس نے غم دیکھا ہو یعنی رنجیدہ اور غمگین ؛ **اسلاف**: آباء واجداد، بزرگ ؛ **خانقاہ**: درویشوں کے رہنے کی جگہ، قبر ؛ **خیر الامم**: تمام امتوں سے بہتر امت یعنی مسلمان ؛ **مدار**: انحصار ؛ **جہاں آباد**: دہلی شہر کا پرانا نام ؛ **کرامت**: عظمت ؛ **بغداد**: عراق کا دارالحکومت، خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں یہی شہر اسلامی دنیا کا مرکز بنا رہا۔ **ہمدوش**: برابر ؛ **ارم**: جنت ؛ **روما**: عیسائیوں کی رومی سلطنت کا دارالحکومت اور موجودہ اٹلی کا صدر مقام روم ؛ **قرطبہ**: اندلس کا مشہور شہر جو طویل عرصے تک مسلمان حکمرانوں کا پایۂ تخت رہا۔ **ظلمت**: تاریکی، اندھیرا ؛ **ملتِ بیضا**: مراد ہے ملتِ اسلامیہ ؛ **قسطنطنیہ**: ترکی کے مشہور شہر استنبول کا پرانا نام۔ یہ شہر خلافتِ عثمانیہ کا صدر مقام رہا۔ قدیم رومی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ اس شہر کے فاتح کے لیے آنحضرتؐ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ اسی بناء پر بیشتر مسلمان حکمرانوں نے اسے فتح کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سعادت ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح کے حصے میں آئی۔ **مہدیٔ امت**: امت کو ہدایت دینے والا۔ یہاں پر سلطان محمد فاتح مراد ہیں۔ **تاباں**: روشن

سطوت : شان و شوکت ۔ **شہِ لولاک** : آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس مراد ہے ۔ **خاتم** : انگوٹھی ۔ **تاباں** : روشن ۔ **ماویٰ** : ٹھکانہ، جائے پناہ ۔

؎ سرزمین دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ رنجیدہ و غمگین دل ہندوستان کے مشہور شہر دہلی کو سجدہ کر رہا ہے ۔ اِس لیے کہ اس شہر کے ایک ایک ذرے میں ہمارے آباء و اجداد اور بزرگوں کا خون محوِ خواب ہے ۔ اس اجڑے ہوئے اور برباد شدہ باغ کی زمین کیونکر پاک نہ ہو آخر یہ اسلام کی عظمت و بزرگی کی خانقاہ ہے ۔ اِس مٹی میں مسلمانوں کے اُن عظیم اور اولوالعزم بادشاہوں کے جسدِ خاکی دفن ہیں جن کی حکومت پر پوری دنیا کے نظم و نسق کا انحصار ہوا کرتا تھا ۔ گو اب دہلی برباد ہو گئی ہے اور یہ شہر اجڑ گیا ہے ، یہاں سے اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا لیکن اب تک اس اجڑی ہوئی بزم کی گرمی اور رونق دل تڑپاتی ہے ۔ گو ہماری حاصل کردہ کامیابیاں خاک میں مل گئیں لیکن ان کی یاد اب تک محفوظ ہے ۔

؎ ہے زیارت گاہ مسلم گو جہاں آباد بھی ۔ ۔ ۔

وضاحت اگرچہ اپنی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے دہلی بھی قابلِ دید شہر ہے لیکن اِس اعزاز و بزرگی اور عظمت کا حق عراق کے شہر بغداد کو بھی حاصل ہے ۔ بغداد وہ گلشن تھا جس پر صحرائی لالہ (یعنی ملتِ اسلامیہ) فخر کرتا تھا ۔ اس شہر کی مٹی آخر کیوں بہشت کی برابری نہ کرے جس پر آنحضرتؐ کے جانشینوں اور پیروکاروں کے قدم پڑتے رہے ۔ یہ وہی باغ ہے جس کے غنچے اور کلیاں بجائے خود پورے گلشن کی آرائش کا سامان کرتے تھے ۔ اور جن اولوالعزم بادشاہوں اور خلفاء سے عیسائیوں کی عظیم رومی سلطنت "سپر پاور" ہونے کے باوجود خوفزدہ رہتی تھی ۔ وہ خلفاء بغداد ہی میں دفن ہوئے ۔

؎ ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نُور ۔ ۔ ۔

وضاحت اندلس کا شہر قرطبہ بھی مسلمانوں کی آنکھوں کی روشنی ہے ۔ یہ شہر اپنے علم و فضل کے باعث یورپ کے تاریک ترین دور میں کوہِ طور کی شمع کی طرح روشن و فروزاں تھی ۔ گو یہ شمع بجھ کر مسلمانوں کی محفل تاریک کر گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ تہذیبِ مغرب کا چراغ قرطبہ ہی کی عنایت کے سبب روشن ہوا ۔ یہ شہر اُس تہذیب کا مدفن ہے جس کے باعث یورپ کے باغ میں اُگنے والی انگور کی بیلیں اور ان کی جڑیں سرسبز و شاداب ہیں ۔ یعنی

اِس تہذیب کے باعث یورپ کو زندگی ملی - یہ صرف شاعرانہ مبالغہ ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی مؤرخین بھی اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں -

؎ خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار - - -

وضاحت قسطنطنیہ کی سرزمین جو رومیوں کے قیصر خاندان کا وطن ہے اور سلطان محمد فاتح کی عظمت وشان وشوکت کا مستقل اور غیر فانی نقش ہے - یہ زمین بھی خانہ کعبہ کی طرح پاکیزہ اور مقدس ہے - یہ طویل عرصے تک اُن خلفاء کا گھر رہا جنھوں نے آنحضرت صلعم کی مسندِ ارشاد سجائی اور اُسے رونق بخشی تھی - اِس خطے کی ہوا بھی پھول کی خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے اور آج بھی حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مقبرے سے یہی آواز آرہی ہے کہ یہ شہر اسلامیانِ عالم کے دل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ شہر آسانی سے حاصل نہیں کیا گیا تھا - بلکہ سینکڑوں برس تک قتل وغارت گری کا سلسلہ جاری رہا تو یہ شہر حاصل ہوا -

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اس شہر کے فاتح کے لئے جنت کی بشارت دی تھی - اِس بشارت کے پیشِ نظر ابتدائے اسلام ہی سے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوششیں شروع ہوگئی تھیں - قسطنطنیہ پر پہلا حملہ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں کیا گیا - حضرت ابوایوبؓ انصاری اپنی پیرانہ سالی کے باوجود لشکر میں شامل تھے - اسلامی لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ حضرت ابوایوبؓ انصاری کا انتقال ہوگیا - شہر کی فصیل سے باہر ان کو دفن کر دیا گیا - گو اُس وقت قبر کے آثار ونشانات مٹا دیئے گئے تھے لیکن بعد میں سلطان محمد فاتح نے تحقیق وتفتیش کے بعد قبر کے مقام پر مقبرہ بنوا دیا -

؎ وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰ - - -

وضاحت لیکن اے وہ شہر جس میں آنحضرت صلعم محوِ خواب ہیں تو اس قدر عظیم ہے کہ خود مسلمانوں کے مرکز یعنی کعبے کے لئے بھی تیری زیارت حجِ اکبر کا درجہ رکھتی ہے - اگر کائنات کو ایک انگوٹھی فرض کیا جائے تو اِس میں تیری حیثیت روشن وچمک دار نگینے کی ہوگی - مسلمانوں کی عظمت وشان وشوکت نے تیری ہی سرزمین میں جنم لیا - تیری سرزمین میں دنیا کے سب سے عظیم بادشاہ کو آرام وسکون میسر آیا جس نے اپنے عمل اور پیغام کے ذریعے دنیا بھر کے انسانوں کو امن وچین دیا تھا - پہلے مصرع میں واقعہ ہجرت اور دوسرے میں آنحضرت صلعم کی رحمۃ اللعالمینی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - وہ شہنشاہ جس کے نام لیوا اور دم بھرنے والے ، دنیا کے عظیم بادشاہوں میں شمار ہوتے ہیں - یہ وہ لوگ ہیں جو قیصر وجمشید یعنے روم وایران جیسی سلطنتوں کے مالک قرار پائے -

اسلامی قومیت اور ملت کا تصور کسی علاقے اور خطے سے وابستہ نہیں ہے لیکن اسے قید میں لانا ہی پڑے تو ہندوستان، ایران اور شام وغیرہ اسلامی قومیت کے تصور کی بنیاد نہیں بن سکتے بلکہ مسلمانوں کا وطن اور پناہ گاہ صرف مدینہ منورہ ہے۔ ہمارے تمام احساسات و تاثرات کو کھینچ لینے والا نقطہ صرف یہی شہر یعنی مدینہ ہے۔

اے مدینہ منورہ جب تک دنیا میں تیرا وجود باقی ہے اُس وقت تک ہم بھی باقی رہیں گے یعنی جب تک ہم تجھے اپنا مرکز تصور کریں گے اُس وقت تک بحیثیت ملت ہم زندہ رہیں گے۔ اس لئے کہ تیری حیثیت صبح جیسی ہے اور ہم شبنم کے قطروں کی مثال ہیں اور شبنم کا وجود صبح سے وابستہ ہوتا ہے۔

ستارہ

(۱۴۷)

تعارف

یہ نظم جولائی ۱۹۰۹ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی اور بلا ترمیم و حذف بانگ درا میں شامل کرلی گئی۔

حل لغات

مآل: انجام ۔ متاع: دولت ۔ ہراس: خوف ۔ زر: سونا ۔ اوج: عروج ۔ پستی: زوال ۔ آفرینش: پیدائش ۔ محال: مشکل ۔ ثبات: استقلال ۔ تغیر: بدلتے رہنے کی کیفیت ۔

۵ قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو ۔ ۔ ۔

وضاحت

حضرت علامہ اقبال ستارے سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے ستارے آخر تو کس چیز سے ڈرتا ہے؛ کیا تو چاند سے خوفزدہ ہے یا صبح سے یا تجھے اپنے انجام یعنی غروب ہونے کی خبر مل گئی ہے۔ کہیں تجھے یہ ڈر تو نہیں کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی تیری روشنی کی دولت لٹ جائے گی یا تجھے یہ خوف ہے کہ تو بھی چنگاری کی طرح تھوڑی دیر چمکنے کے بعد فنا ہو جائے گا۔ اے ستارے! آسمان (یعنی تقدیر) نے تجھے زمین سے بہت دور گھر عطا کیا ہے۔ صرف بلندی ہی نہیں بلکہ تجھے چاند جیسا سنہری لباس یعنی روشنی بھی عطا کی ہے۔

اس کے باوجود تجھ پر خوف طاری رہتا ہے اور تو خوف کی وجہ سے تمام رات کانپتا رہتا ہے۔ یہ شعر حسنِ تعلیل کی اچھی مثال ہے۔ شاعر نے ستاروں کی جھلملاہٹ کو کانپنے سے تعبیر کیا ہے۔

ے چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے ـ ـ ـ ـ ـ

وضاحت اے چمکنے والے مسافر! یہ دنیا بہت عجیب ہے۔ یہاں ہر ایک کا عروج دوسرے کے زوال کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک سورج کا نکلنا لاکھوں ستاروں کی موت ہے، یوں لگتا ہے کہ جسے ہم موت خیال کرتے ہیں وہ بھی دراصل زندگی کی مستی ہی ہوتی ہے۔ غنچے کے بکھرنے میں پھول کی پیدائش کا بھید چھپا ہوا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ موت موت نہیں ہے بلکہ زندگی کے اظہار ہے۔

یہ دنیا اس طور پر بنی ہے کہ اس میں سکون و اطمینان ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کو استقلال ہے تو وہ صرف بدلتے رہنے کی کیفیت ہے۔ یعنی ہمہ وقت انقلاب و تبدیلی ہی اس کائنات کی بنیادی خصوصیت ہے۔

دو ستارے

(۱۴۸)

تعارف یہ نظم اگست ۱۹۰۹ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی اور جوں کی توں بانگِ درا میں شامل کر دی گئی۔

حلِ لغات قِراں: ستاروں کا ایک برج میں جمع ہونا۔ مدام: ہمیشہ۔ ثبات: مستقل مزاجی، استقلال۔ آئین: دستور، قاعدہ۔

ے آئے جو قِراں میں دو ستارے ـ ـ ـ ـ ـ

وضاحت دو ستارے ایک برج میں جمع ہوئے تو اُن میں سے ایک دوسرے کو کہنے لگا کہ ہمارا یہ ملنا ہمیشگی اختیار کرے اور ہمارا سفر ختم ہو جائے تو کتنا اچھا ہے اگر آسمان ہم پر تھوڑا سا مہربان ہو جائے تو ہماری روشنی ایک ہو جائے یعنی ہم ایک ساتھ رہیں اور

ایک ساتھ چمکیں ۔

۵ لیکن یہ وصال کی تمنا ۔ ۔ ۔

وضاحت لیکن اکٹھے رہنے کی یہ خواہش جو ایک ستارے نے ظاہر کی تھی خود جدائی کا پیغام تھی۔ یعنی اس کے فوراً بعد ان ستاروں کو ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑا۔ اس لئے کہ گردش اور سفر ستاروں کی تقدیر ہے اور ہر ستارے کا ایک راستہ بھی متعین و مقرر ہے جس سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا ۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اکٹھے رہنے کو دوام حاصل ہو سکتا ہے تو یہ بات حقیقت نہیں محض خواب ہے اس لئے کہ دنیا کا دستور ہی جدائی اور علیحدگی ہے ۔

گورستانِ شاہی

(۱۴۹)

تعارف علامہ اقبال حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تو وہاں پر اور بہت سی چیزوں کے علاوہ مسلمان بادشاہوں کے مقابر اور مزارات بھی دیکھے ۔ انہیں سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے یہ نظم لکھی جو جون ۱۹۱۰ء کے مخزن میں شائع ہوئی ۔ اس کے ساتھ علامہ اقبال کا ایک نوٹ بھی شائع ہوا تھا۔

نظر ثانی میں نظم کے چھ شعر حذف کر دیئے گئے جبکہ کچھ مصرعوں میں جزوی ترمیمات بھی ہوئیں ۔ یہ سب اشعار سرود رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں درج ہیں ۔

حلِ لغات گورستانِ شاہی : بادشاہوں کا قبرستان ؛ خرقۂ دیرینہ : پرانا لباس ؛ مکدر : دھندلا ؛ حیرت فزا : حیرانی کو بڑھانے والا ؛ بربط : موسیقی کے ایک ساز کا نام ؛ جولاں گاہ : گھوڑے دوڑانے کا میدان مراد میدانِ جنگ ؛ عالمگیر : مشہور مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر جس نے ۱۶۸۷ء میں دکن میں گولکنڈہ کا قلعہ فتح کرنے کے لیے جنگ کی تھی ۔ یہ مقام حیدر آباد سے سات آٹھ میل مغرب کی سمت میں ہے ۔ دوش : کاندھا ؛ سُکانِ کہن : پرانے رہنے والے ؛ روزن : سوراخ ؛ نجم سبز فام : سبز رنگ کا ستارہ ۔ خاکبازی : مٹی کا کھیل، معمولی کھیل جسے کوئی اہمیت نہ دی جائے ؛

خوں گشتہ: خون ہونے والی یعنی مرنے والی۔ **اشک گلگوں**: پھولوں جیسے آنسو یعنی خون کے آنسو۔ **گردوں پایہ**: آسمان کا مرتبہ رکھنے والا۔ **آرزوئے ناصبور**: پوری نہ ہونے والی تمنا۔ **جبیں گستر**: سجدہ کرنے والا۔ **مآل**: انجام۔ **جہانبانی**: حکومت۔ **فغفوری**: فغفور چین کے بادشاہوں کا لقب، مراد ہے بادشاہی۔ **قیصر**: روم کے بادشاہوں کا لقب۔ **غنیم**: دشمن۔ **یورش**: حملہ۔ **کشت**: کھیتی۔ **جادہ**: راستہ۔ **عود**: موسیقی کے ایک ساز کا نام۔ **عرصۂ پیکار**: میدانِ جنگ۔ **بیداد**: ظلم۔ **ریاض**: گلستان۔ **بحرِ ناپیداکنار**: ایسا سمندر جس کا کنارہ نہ ہو۔ **خسِ آتش سوار**: وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو یعنی بہت جلد فنا ہو جانے والا۔ **خوگر**: عادی۔ **تاجور**: بادشاہ۔ **بابل**: ایک قدیم تہذیب کا مرکز جو چار ہزار قبل مسیح میں عراق کا دارالحکومت تھا۔ **آلستن**: حاملِ مراد لینے والا۔ **مہرِ ایراں**: ایران کی تہذیب و تمدن کا سورج۔ اِس میں لطف یہ ہے کہ ایران کے کچھ بادشاہ آریہ مہر بھی کہلاتے تھے، ایران کے آخری بادشاہ رضا شاہ پہلوی کا بھی یہی لقب تھا۔ **ابرِ آذاری**: موسمِ بہار کا بادل۔ **خامہ**: قلم۔ **گلستاں زادے**: درخت۔ **شباں زادے**: گڈریوں کے لڑکے۔ **طفلِ خفتہ**: سویا ہوا بچہ۔

؎ آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے — — —

وضاحت

آسمان نے بادل کا پھٹا پرانا لباس پہن رکھا ہے اور چاند کی پیشانی کا آئینہ دھندلایا ہوا ہے۔ یعنی بادل کی وجہ سے اُس کی روشنی ماند پڑی ہوئی ہے۔ بادشاہوں کے قبرستان کے اِس خاموش منظر میں آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے چاندنی پھیکی پھیکی سی ہے۔ رات کی گود میں صبحِ صادق سو رہی ہے یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہونے والی ہے۔ ایسے میں اگر درختوں کو دیکھا جائے تو اُن کی خاموشی حیرانی کو بڑھانے والی ہے۔ یہ خاموشی دراصل قدرت کے سازِ موسیقی کی ہلکی سی آواز ہے۔

دنیا کا ایک ایک ذرہ سرتاپا باطنی کرب اور درد کا شکار ہے اور زندگی کے ہونٹوں پر خاموشی ایک سرد آہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

؎ آہ جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار — — —

وضاحت

مشہور مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا میدانِ جنگ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اس قلعے نے اپنے کندھوں پر سینکڑوں صدیوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے یعنی اسے تعمیر ہوئے بہت سا وقت گذر چکا ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ قلعہ زندگی کی چہل پہل سے بھرپور تھا۔ لیکن اب اس پر ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ویرانی

دراصل یہاں کی گذری ہوئی زندگی کے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے۔
یہ قلعہ اپنے پرانے رہنے والوں کی مٹی کا عاشق ہے اور پہاڑ کے بالکل قریب اس قبرستان کے محافظ کی طرح کھڑا ہے۔

ابر کے روزن سے وہ بالائے بام آسماں ـــ ـــ ـــ

وضاحت بعض جگہ بادل گہرا نہیں ہے۔ ایسے میں یوں لگتا ہے جیسے بادلوں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ ایک سوراخ میں سے سبز لباس پہنے ہوئے ستارہ آسمان کی بلندیوں سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ دنیا کی وسعت کا منظر اس کے لئے مٹی کا کھیل ہے یعنی انتہائی معمولی بات ہے اس ستارے کو انسان کی تمام ناکامیوں کی کہانی زبانی یاد ہے۔ ازل سے یہ ستارہ اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے اور آسمان سے ان تمام انقلابات کا نظارہ بھی کر رہا ہے جو زمین پر برپا ہوتے رہے ہیں۔ اس ستارے کا مقدر سفر ہے جس کی وجہ سے دنیا میں اس کے لیے ٹھہرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ مرنے والے کی فاتحہ خوانی کے لیے ذرا دیر کو رُک گیا ہے۔ زندگی کی چمک دمک سے زمین کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اور زمین ایسے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے جس میں مرنے اور رفنا ہونے والی سینکڑوں تہذیبیں دفن ہیں۔

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا ـــ ـــ ـــ

وضاحت حسرت اور کرب کو بڑھانے والی یہ منزل یعنی قبرستان بادشاہوں کے سونے کی جگہ ہے۔ اے عبرت حاصل کرنے والی آنکھ! تجھے یہاں پر خون کے آنسوؤں کا خراج پیش کرنا چاہیئے۔ گو یہ قبرستان ہے لیکن دیکھا جائے تو اس کی زمین آسمان کی ہم مرتبہ ہے اور یہ ایک ایسی قوم کی دولت ہے جس کی قسمت اُلٹ گئی ہو۔ مزارات کی شان و شوکت اس حد تک حیرانی پیدا کرتی ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں پلک جھپکانے سے بھی احتراز کرتی ہیں یعنی مسلسل ان مزارات کو تکتی رہتی ہیں۔
اس سارے منظر میں ناکامی کی تصویر کی ایسی کیفیت ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور ـــ ـــ ـــ

وضاحت وہ بادشاہ جنھیں اُن کی پوری نہ ہونے والی بے چین تمنائیں بیتاب رکھتی ہیں اب مرنے کے بعد شہروں اور آبادیوں کے ہنگاموں سے دور خاموشی سے سو رہے ہیں۔ ان سورج جیسے لوگوں کی روشنی جن کے دروازے پر آسمان سجدے کیا کرتا تھا، اب قبر کے اندھیروں میں قید ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ جن لوگوں کے اندازِ حکومت سے خود زوال خوف کھاتا

تھا، کیا ان بادشاہوں کی عظمت اور بڑائی کا یہی انجام ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ چین کے عظیم بادشاہوں کا رعب و دبدبہ ہو خواہ روم کے بادشاہوں کی شان و شوکت، موت ایسا دشمن ہے کہ اُس کے حملے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ عام لوگوں کی طرح بادشاہوں کی زندگی کی کھیتی کا پھل بھی قبر ہے۔ اور عظمت و بڑائی کے راستے کی آخری منزل بھی قبر ہے۔

؎ شورشِ بزمِ طرب کیا! عود کی تقریر کیا ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ اولوالعزم بادشاہ جواب قبروں میں سو رہے ہیں ان کو نہ عیش و عشرت کی محفلوں کے ہنگامے جگا سکتے ہیں نہ عود جیسے سازِ موسیقی کے نغمے۔ نہ اُن دردمندوں اور مصیبت زدوں کی نالہ و فریاد جنھیں یہ بادشاہ اپنی زندگی میں انصاف بہم پہنچایا کرتے تھے۔ ان بہادروں کو اب میدانِ جنگ میں تلوار کے ہنگامے اور ان کے خون کو گرما دینے والا اور ان کے دلوں کو جوش و جذبے سے بھر دینے والا نعرۂ تکبیر بھی بیدار نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ کسی طرح کی آواز ہو لیکن ان سونے والوں کو جگا نہیں سکتی اور جن سینوں سے جان نکل چکی ہے، دوبارہ ان سینوں میں جان نہیں آسکتی۔

روح جسم کی قید میں مظالم برداشت کر رہی ہے۔ جب سانس کی ہوا بانسری میں داخل ہوتی ہے تو یہی ہوا فریاد اور نغمے میں بدل جاتی ہے۔ انسان کی زندگی بھی خوش الحان پرندے کی طرح ہے۔ پرندہ کسی شاخ پر بیٹھتا ہے چند لمحوں کے لئے نغمے گاتا ہے اور پھر اُڑ جاتا ہے۔ افسوس ہم اس دنیا میں کیا آئے اور کیا گئے یعنی اس کی حیثیت و اہمیت کیا ہے؛ بس ہماری زندگی تو اُس پھول کی مانند ہے جو شاخ سے نکلتا ہے، کھلتا ہے اور پھر مرجھا جاتا ہے۔

خواہ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر لیکن موت ہر شخص کے خواب کی تعبیر ہے اور موت جیسی ظالم چیز اپنے ظلم میں بھی انصاف کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔ یعنی موت چھوٹے بڑے کی رعایت نہیں کرتی اور اُس کی نظر میں سب برابر ہیں۔

؎ سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار ۔ ۔ ۔

وضاحت زندگی کا سلسلہ اُس سمندر کی مانند ہے جس کا دوسرا کنارا نہ ہو اور سمندر میں جو حیثیت موجوں اور لہروں کی ہوتی ہے وہی حیثیت انسانی زندگی میں قبروں اور مزارات کی ہے۔ دنیا میں بہت عرصے تک جینے کی خواہش کو خون کے آنسو رونا چاہیئے کہ زندگی ناقابلِ اعتبار اور بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے۔ ناپائیداری کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی شرارے کی مسکراہٹ اور اس تنکے کی مانند ہے جو لوگ کی لپیٹ میں آ

چکا ہے ۔ ظاہر ہے کہ شرارے کی روشنی بھی پل بھر کے لیے ہوتی ہے اور آگ کی لپیٹ میں آجانے والے تنکے کی زندگی بھی ۔

چاند جو زندگی کو پیدا کرنے والی ہستی اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے ۔ آسمان کی وسعتوں میں پارے جیسا سفید لباس پہنے اپنے سفر میں محو ہے لیکن صبح کے وقت جب آسمان پر ستارے نہیں ہوتے ، آسمان کی ڈرا دینے والی وسعت میں کوئی چاند کی بے کسی و بے بسی کا منظر دیکھے ، اُس وقت چاند ، چاند نہیں لگتا بلکہ اس بادل کی مانند نظر آتا ہے جس کے پانی کا آخری قطرہ برسنے کے بعد اس کی موت واقع ہو جائے گی ۔

ع زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار

وضاحت چاند ہی کی طرح قوموں کی زندگی کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ۔ اُن کی تصویر کی بہار ایسی ہے جس کے رنگ اڑ چکے ہوں یعنی ہر قوم بہر حال زوال کا شکار ہو جاتی ہے ۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیا میں خواہ کوئی قوم آسمان جیسی عظمت ہی کیوں نہ رکھتی ہو ، ابد تک وہ بھی قائم و موجود نہیں رہ سکتی اور فنا ہو جاتی ہے ۔ دنیا قوموں کی بربادی کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ قوموں کی تباہی کے منظر کو بالکل لاتعلقی سے دیکھتی رہتی ہے اور اس پر کسی طرح کے غم و افسوس کا اظہار نہیں کرتی ۔ دنیا کی کوئی بھی چیز کسی ایک شکل و صورت میں نہیں رہتی ۔ اس لئے کہ زمانے کا مزاج بہت ہی جدت پسند ہے اور نئی نئی چیزیں بناتا اور تخلیق کرتا رہتا ہے ۔ زمانے کے نگینے کی زیب و زینت ہمیشہ نئے نام سے ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ماں (یعنی دنیا) ہمیشہ نئی نئی قومیں پیدا کرتی رہتی ہے ۔

ع ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گزر ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال دنیا کو ایک راستہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس راستے سے ہزار ہا قافلے گزرے ہیں اور مشہور ہیرا کوہ نور نا معلوم اب تک کتنے بادشاہوں کے تاج کی زینت بن چکا ہے ۔ دنیا سے مصر و بابل جیسی عظیم و قدیم تہذیبیں بھی اس طرح مٹ گئیں کہ آج اُن کے آثار تک موجود نہیں اور گردشِ زمانہ نے یونان اور روم جیسی اقوام کی بڑائی کو بھی لوٹ کر خاک میں ملا دیا ۔

افسوس کہ انہی تہذیبوں اور قوموں کی طرح مسلمان بھی دنیا سے اسی طرح رخصت ہو گئے جیسے آسمان پر بہار کے موسم کا بادل آتا ہے ، برستا ہے اور پھر چلا جاتا ہے اور اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا ۔

ہے رگِ گُل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی ۔ ۔ ۔

وضاحت

پھول کی شاخ صبح کے آنسوؤں یعنی شبنم کے قطروں کے باعث موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی ہے اور شبنم کے کسی کسی قطرے میں سورج کی شعاع اُلجھ گئی ہے ۔ دریا کا سینہ سورج کی شعاعوں کے لئے پالنے کا کام دیتا ہے ۔ ندی کے کنارے سورج کا منظر کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا ہے ۔ یوں لگتا ہے، جیسے صنوبر کا درخت اپنی آرائش میں مصروف ہے اور بہتی ہوئی ندی اس کے لیے آئینے کا کام دے رہی ہے ۔ جبکہ بہار کی زندگی بخش ہوا پھولوں اور غنچوں کے لئے آئینے کا کام کرتی ہے ۔ باغ میں بلبل انسان کی آنکھوں سے چھپ کر اور پتوں میں بیٹھ کر گانا گانے میں مصروف رہتی ہے ۔ گلستان میں رنگین نغمے گانے والی اس بلبل کی وجہ سے گلستان کی فضا میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں ۔ یہ بلبل عشق کی اڑتی ہوئی تصویر ہے اور قدرت کے قلم نے یہ کتنی شوخ عبارت لکھی ہے ۔ باغ میں درخت بالکل چپ چاپ کھڑے ہیں اور پہاڑ کی وادی میں گڈریوں کے بچے کھیل کود میں مصروف ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں ۔ یہ پرانا خاکداں یعنی قلعہ زندگی سے بھرپور ہے اور گو اس قلعے کے رہنے والے موت کا شکار ہو چکے ہیں لیکن یہاں پر موت کے پردے میں زندگی کا اضطراب چھپا ہوا ہے ۔ قلعے میں اُگے ہوئے پودوں کی شاخوں سے موسمِ خزاں کے باعث پھولوں کی پتیاں اِس طرح جھڑ رہی ہیں جیسے سوئے ہوئے بچے کے ہاتھ سے رنگین کھلونے گرتے ہیں ۔

خوشی و مسرت کی اِس دنیا میں اگرچہ انسان کیلئے عیش و عشرت کے بہت سے سامان ہیں لیکن قوم و ملت کا تنزل اور بربادی کا غم ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہنے والا غم ہے ۔

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں ۔ ۔ ۔

وضاحت

ہمارے دل گزرے ہوئے زمانے کی یاد سے خالی نہیں ہیں اور مسلمان قوم نے اپنے گزرے ہوئے بادشاہوں کو فراموش نہیں کیا ۔ یہ برباد شدہ در و دیوار دراصل ماضی کی عظمتوں کے لٹ جانے پر رونے کے بہانے ہیں ۔ ہماری آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھ صرف مسلسل رونے کی وجہ سے دیکھنے کے قابل ہے ۔ ہم مسلمان اپنی رونے والی آنکھ سے زمانے کو موتی عطا کرتے ہیں ۔ موجودہ زمانے کے مسلمان گذرے ہوئے تند و تیز طوفان کے آخری بادل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ لیکن اِس آخری بادل کے دامن میں بھی بے شمار موتی ہیں ۔ اِس کے خاموش سینے میں ابھی بجلیاں باقی ہیں ۔ یہ بادل اب بھی صحراؤں کی مٹی کو گلستانوں میں بدل سکتا ہے اور کسانوں کی اُمید جو مایوس ہو کر سو چکی ہے، اُسے خواب سے بیدار کر سکتا ہے ۔

اگرچہ قوم کی جلالی شان کا اظہار ہو چکا ہے لیکن ابھی قوم کی جمالی شان کا ظہور باقی ہے ۔ شانِ جلالی

سے مراد رعب و دبدبہ، شان و شوکت اور حکمرانی و فتوحات ہیں جبکہ شانِ جمالی کا منشا حسن اخلاق اور ادب و فنون میں کامیابی ہے۔

"نمودِ صبح"

(۱۵۳)

تعارف نسیم امروہوی فرہنگِ اقبال میں لکھتے ہیں کہ نظم نمودِ صبح سنہ ۱۹۱۱ء کے آخری حصے میں کہی گئی تھی۔ جبکہ ماہنامہ مخزن جون سنہ ۱۹۱۰ء میں اِس نظم کے ساتھ علامہ اقبال کا جو نوٹ شائع ہوا تھا اُس کی رُو سے علامہ اقبال نے یہ نظم اس وقت لکھی تھی جب وہ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد دکن گئے تھے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد انھیں سرکشن پرشاد کا ایک خط موصول ہوا۔ علامہ اقبال نے اِس خط کے جواب میں سرکشن پرشاد کی شان میں، ایک قصیدہ لکھا تھا۔ نظم "نمودِ صبح" کے اشعار اُس قصیدے کی تشبیب کے شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں سارا قصیدہ حذف کر دیا گیا۔ البتہ تشبیب کے اشعار مستقل نظم کی صورت میں بانگِ درا میں شامل کر دیئے گئے۔ پورا قصیدہ سرودِ رفتہ میں شائع ہو چکا ہے۔

حلِ لغات آشکار: ظاہر؛ دخترِ دوشیزہ: کنواری بیٹی؛ درودِ فصل انجم: ستاروں کی فصل کاٹنا۔ یعنی ستاروں کا غروب ہو جانا۔ سپہر: آسمان؛ خاور: مشرق؛ عابدِ شب زندہ دار: تمام رات جاگ کر عبادت کرنے والا؛ مضمر: پوشیدہ؛ ناقوس: وہ گھنٹی جو گرجے یا مندر میں بجائی جاتی ہے؛ قانون: ایک ساز کا نام۔

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار — — —

وضاحت نظم "نمودِ صبح" میں رات کے ختم ہونے اور صبح کے طلوع ہونے کا منظر بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ صبح جو رات اور دن کی کنواری لڑکی ہے، افق کے دامن کے نیچے سے نمایاں ہو رہی ہے؛ آسمان نے ستاروں کی ساری فصل کاٹ لی یعنی تمام ستارے ڈوب گئے اور مشرق کی کھیتی میں سورج آئینے کاشت کرنے لگا یعنی مشرقی افق میں روشنی ہو گئی۔ جب آسمان نے سورج کے طلوع ہونے کی خبر سُنی تو رات کے رخصت ہونے کے لیے کام میں آنے والا کجاوا اغیار کے کاندھے

پر سوار کر دیا یعنی رات کو رخصت کر دیا۔ آسمان کے کسان نے ستاروں کی جو چنگاریاں بوئی تھیں اس کھیتی کا حاصل سورج ہے۔ واضح رہے کہ شاعر ستاروں کے ڈوبنے کا ذکر پہلے ہی کر چکا ہے۔ اب اس نے ستاروں کے ڈوبنے کو چنگاریاں بونے سے تشبیہ دی۔ کوئی چیز بوئی جائے تو وہ اُگتی ہے اور اس پر پھل آتا ہے لہٰذا ستاروں کی اِس کھیتی کا پھل سورج کو قرار دیا گیا۔

صبح کا ستارہ آسمان کی وسعتوں سے اِس طرح رخصت ہو رہا ہے جیسے ساری رات جاگ کر مصروفِ عبادت رہنے والا شخص عبادت خانے سے جا رہا ہے۔ مشرقی افق سے جس انداز میں آہستہ آہستہ سورج کی روشنی پھوٹتی ہے اُس کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ اِس منظر کو دیکھیے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی چمکتی ہوئی تلوار کو میان کی تاریکی سے باہر نکال رہا ہو۔ خورشید کے مطلع میں صبح کا مضمون اِس طرح چھپا ہوا ہے جیسے مینا کی تنہائیوں میں شراب چھپی ہوتی ہے۔ اِس شعر میں مطلع اور مضمون کی رعایت بہت عمدہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ربط و ضبط بڑھانے والی صبح کے وقت چلنے والی ہوا کے دامن میں مندر اور گرجوں میں بجنے والی گھنٹی اور اذان کی آواز جمع ہو گئی تھی۔ نغمے گانے والے تمام پرندے کوئل کے گانے سے بیدار ہو گئے اور صبح کے ساز کا ایک ایک تار نغمے بکھیرنے لگا۔

تضمین بر شعر انیسی شاملو

(۱۵۴)

حلِ لغات

تضمین: اصطلاح میں کسی شاعر کے کسی مصرع یا شعر کو مضمون کی مناسبت سے اپنے کلام کا جزو بنانا۔ انیسی شاملو: ایک ترک شاعر جو ایران سے تعلق رکھتا تھا۔ اِس کا نام مرزا یول قلی بیگ تھا۔ دوسرے شعراء کی طرح ہندوستان آیا اور عبدالرحیم خانخاناں صوبیدار گجرات کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی۔ محمود غزنوی اور ایاز کی داستان نظم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی تکمیل سے قبل ہی ۱۶۰۵ء میں فوت ہو گیا۔ جادہ: راستہ۔ پیرِ سنجر: حضرت معین الدین چشتی اجمیری مراد ہیں۔ درماں: علاج۔ گویائی: گفتگو۔ مرقد: قبر۔ زمینِ شور: بنجر زمین۔ نازائی: پیدا نہ ہونا۔ کنشتی: بت خانے سے تعلق رکھنے والا۔

؎ ہمیشہ صورتِ بادِ سحر رہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت مَیں ہمیشہ صبح کی ہوا کی طرح آوارہ اور سرگرداں پھرتا ہوں ۔ اس لیے کہ محبت میں منزل پر پہنچکر آرام کرنے کی نسبت سفر کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے ۔ اِسی عالم میں میرا بے چین دل حضرت معین الدین چشتی کے اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں بے صبری اور بیتابی کے درد کا علاج مل جاتا ہے ۔ وہاں پہنچ کر ابھی میں نے گفتگو شروع نہیں کی تھی اور میری زبان بولنے کا احسان اٹھانے ہی والی تھی کہ معین الدین چشتی اجمیری کی قبر سے آواز آئی ۔ انھوں نے فرمایا کہ اے اپنے بزرگوں کے قاعدے کو چھوڑ دینے والے حرم میں رہنے والوں (یعنی سچے مسلمانوں) کو تجھ سے شکایت ہے ۔ تو اپنے عشق کی وجہ سے مجنوں کی طرح تھا لیکن کیا ہوا کہ اب تیری باطنی جلن ختم ہو گئی ۔ حالانکہ لیلیٰ میں ابھی تک وہی شانِ محبوبیت باقی ہے ۔ تیرے دل کی بنجر زمین میں توحید اور اسلام کا بیج بویا گیا لیکن وہ پیدا نہیں ہوا ۔ جس کی وجہ سے پوری دنیا میں تیری فطرت کا بانجھ پن بدنام ہو گیا ۔ اے غفلت برتنے والے کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری زندگی کیسی ہے ؟ دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسلام کی بجائے تیرے پاس بُت خانے کا ساز ہے ۔ اور اِس میں کلیسا کی آوازیں اور نغمے بھرے ہوئے ہیں یعنی تیری معاشرت اور عادات و اطوار ہندؤوں اور عیسائیوں جیسے ہو گئے ۔ تیری تربیت تو خانہ کعبہ کی گود میں ہوئی تھی لیکن تیرا شوریدہ و دیوانہ دل بت خانے کا عاشق ہے ۔

تُو نے وفا ہم سے سیکھی لیکن اِس وفا کو اغیار کے کام میں لایا ۔ موتی ہم سے حاصل کیا لیکن تو نے اسے دوسروں پر قربان کر دیا ۔

فلسفۂ غم

(۱۵۵)

تعارف علامہ اقبال نے یہ نظم غیر منقسم پنجاب کی مشہور و معروف شخصیت اور اپنے دوست و ہم جماعت میاں فضل حسین بار ایٹ لاء کے والد کی وفات پر مرثیے کے طور پر لکھی تھی ۔ یہ نظم جولائی ۱۹۱۰ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔ نظرثانی میں صرف ایک شعر

میں ترمیم کی گئی۔ یہ شعر سرودِ رفتہ میں درج ہے۔

حلِ لغات

سحاب : بادل ۔ حباب : بلبلہ ۔ الم : غم ۔ خزاں نادیدہ : جس نے خزاں نہ دیکھی ہو ۔ غازہ : گلگونہ، پوڈر ۔ ملال : دکھ، غم ۔ مضراب : ساز بجانے کا آلہ ۔ شہپر : بڑا پر ۔ سرود : نغمہ، گانا ۔ ہم آغوش : بغل گیر ۔ کوکب : ستارہ ۔ گلچیں : پھول توڑنے والا ۔ آزار : دکھ، تکلیف ۔ کلفت : مصیبت، تکلیف ۔ نظمِ دہر : کائنات اور زمانے کا نظام و انتظام ۔ ادراک : عقل، شعور، علم، سمجھ ۔ ابد : وہ لمحہ جب کائنات کا سفر اپنے اختتام کو پہنچے گا ۔ تمہید : آغاز ۔ زندۂ جاوید : ہمیشہ زندہ رہنے والا ۔ پائندہ : ہمیشہ قائم رہنے والا ۔ چُور ہونا : ٹوٹنا، ٹکڑے ٹکڑے ہونا ۔ افتاد : مصیبت ۔ سیمابِ رواں : بہتا ہوا پارا ۔ سیم : چاندی ۔ محصور : مقید ۔ مستور : چھپی ہوئی، پوشیدہ ۔ گوشہ گیر : الگ، کنارہ کش ۔ جادہ : راستہ ۔ ظلمات : تاریک اور اندھیری دنیا۔

۵ گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی — — —

وضاحت

اگرچہ زندگی کی شراب اول تا آخر عیش و عشرت اور مسرت و شادمانی کا لطف اور کیفیت رکھتی ہے لیکن زندگی کے بادل کے دامن میں آنسو بھی موجود ہیں۔ یعنی زندگی میں مسرت و غم دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ زندگی کا بلبلہ غم کی موج پر ناچتا ہے اور اگر زندگی کو ایک کتاب فرض کیا جائے تو غم و الم کا باب بھی اِس کتاب میں شامل ہے۔ اگر کسی پھول کی ایک پتی بھی ٹوٹ جائے اور بکھر جائے تو پھول مکمل نہیں رہتا۔ اور اگر کسی بلبل نے خزاں کا موسم اور اس کے مظالم نہیں دیکھے تو بھی بلبل کہلانے کی مستحق نہیں۔

۵ آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں — — —

وضاحت

دل کی کہانی آرزو اور تمناؤں کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے دلآویز اور دلکش ہے دراصل انسانیت کا نغمہ نالہ و فریاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اہلِ نظر کے لیے غموں کا داغ سینے کے لیے چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی سینے اور دل کی روشنی اس داغ کی وجہ سے ہوتی ہے جبکہ انسانی روح کے آئینے کے لئے آہیں اور نالے زیب و آرائش کا موجب بنتے ہیں۔ غم کے حادثوں کی وجہ سے ہی انسان عروج و کمال کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اگر دل کو ایک آئینہ قرار دیا جائے تو غموں کا گرد و غبار دل کے آئینے کو دھندلانے کی بجائے آراستہ کرتا ہے۔ بے پناہ صلاحیتوں اور قوتوں کی حامل جوانی غموں ہی کی وجہ سے بیدار ہوتی ہے اور جوانی کا ساز اِسی مضراب یعنی غم

کے باعث نغمے پیدا کرتا ہے ۔ غم، دل کے پرندے کی پرواز میں بڑے پر کی حیثیت رکھتا ہے یعنی غم ہی کے باعث دل پرواز کر سکتا ہے ۔ اگر انسان کا دل ایک بھید ہے تو صرف غم ہی دل کے اس بھید کو کھولتا اور نمایاں کرتا ہے ۔ یعنی دل کی پوشیدہ صلاحیتیں صرف غم کی وجہ سے سامنے آ سکتی ہیں ۔ دراصل غم کو غم نہیں کہنا چاہئیے بلکہ یہ تو روح کا ایک خاموش گیت ہے جو زندگی کے ساز اور نغموں سے ہم آہنگ ہے یعنی فطرت کا بنیادی تقاضا ہے ۔

شام جس کی آشنائے نالہ "یا رب" نہیں ۔ ۔ ۔

وضاحت جو شخص شام کے وقت نالہ و فریاد نہیں کرتا اور جس کی راتوں میں آنسوؤں کے ستارے اپنا جلوہ نہیں دکھاتے یعنی جو غم کے باعث نالہ و فریاد نہیں کرتا اور آنسو نہیں بہاتا ۔ جس کے دل کا پیالہ غم کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا اور جو ہمیشہ عیش و مسرت کی شراب میں مست رہا ۔ جس پھول توڑنے والے کا ہاتھ کانٹوں سے بچا رہا اور جس کا جذبۂ عشق، ہجر کی تکلیف سے بے خبر و ناواقف رہا گو ایسے شخص کی زندگی غموں کی تکلیف سے دور ہے ۔ لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ ایسے شخص کی آنکھوں سے زندگی کا راز بھی پوشیدہ رہا یعنی عیش و عشرت میں سرشار رہنے والا آدمی زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رہتا ہے، وہ تجربات کی بھٹی سے نہیں گذرتا لہٰذا کندن بھی نہیں بن پاتا ۔ علامہ اقبال اپنے دوست میاں فضل حسین کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تو زمانے کے نظام اور اس کے تقاضوں کا شعور رکھتا ہے ۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ تیرے لیے غم و آلام کا مرحلہ آسان ہو جائے گا ۔ علامہ اقبال یہی نکتہ ایک اور جگہ بھی واضح کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں،

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق ۔ ۔ ۔

وضاحت ابد یعنی دوام کی پرانی کتاب کی ابتدا عشق سے ہوتی ہے یعنی عشق لافانی ہے ۔ عشق کے مقابلے میں عقل ایک فنا ہو جانے والی چیز ہے لیکن عشق ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والی قوت ہے ۔ عشق کے سورج سے موت کی شام بھی شرمندہ ہوتی ہے یعنی موت عشق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔ عشق زندگی کی جلن ہے اور یہ رہتی دنیا تک موجود رہنے والی شے ہے ۔ اگر محبوب کے مرنے کا مطلب واقعی موت ہوتا تو عشق کرنے والے کے دل سے محبت کا جوش و خروش بھی رخصت ہو جاتا ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محبوب کے مرنے سے عشق نہیں مرتا بلکہ یہ روح میں غم بن کر ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو جاتا ہے ۔ اس طرح دیکھا جائے تو جب تک عشق باقی ہے اُس وقت تک محبوب بھی باقی ہے اور یوں گویا محبوب

کی زندگی بھی موت سے ناواقف ہی رہتی ہے۔

ع آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی — — —

وضاحت ندی پہاڑ کی پیشانی یعنی اس کے سامنے کے بلند حصّے سے گاتی ہوئی آرہی ہے۔ اس کے نغمے اتنے خوبصورت ہیں کہ خوش الحان پرندے بھی اس سے گانا سیکھتے ہیں یعنی ندی کے نغمے انتہائی دلآویز ہیں۔ ندی کی بالائی سطح کا آئینے جیسا شفاف وصاف پانی حور کے عارض کی طرح روشن اور چمکدار ہے اور جب یہ ندی چٹانوں پر گرتی ہے تو یہ آئینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ندی کا پانی چٹان سے ٹکرانے اور ٹوٹنے کے باعث پیارے پیارے موتیوں میں تبدیل ہوجاتا ہے یعنی چٹان سے ٹکرانے کی مصیبت کے باعث پانی چھوٹے چھوٹے قطروں میں بٹ جاتا ہے۔ شاعر نے ان قطروں کو کبھی موتی قرار دیا ہے اور کبھی ستارے کہا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ پارے کی بہتی ہوئی ندی پھٹ گئی اور بے چین بوندوں کی ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آگئی لیکن ان قطروں کی ایک دوسرے سے علیحدگی دائمی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً یہ قربت اور پھر مل جانے کا پیغام ہے۔ اس لیے کہ فوراً بعد یہ قطرے مل کر پھر ندی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ندی ہی کی طرح انسانی زندگی بھی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ جب یہ عالم بالا کی بلندیوں سے نیچے اتری تو ندی کے قطروں کی طرح انسانوں کے ہجوم کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس دنیا میں ہم ایک دوسرے سے اس لیے جدا ہوتے ہیں تاکہ پھر مل سکیں لیکن ہم اپنی سادگی کی وجہ سے اس عارضی اور وقتی جدائی کو دائمی سمجھ کر روتے اور افسوس کرتے ہیں۔

ع مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — — —

وضاحت غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرنے والے موت سے دوچار ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتے اور حقیقتاً یہ ہم سے کبھی بھی الگ نہیں ہوتے۔ جب انسان کی عقل زمانے کی آفتوں اور مصیبتوں میں گھر جائے اور جوانی تاریک رات میں چھپ جائے یعنی انسان عملی دنیا میں بے بس ہوجائے، دل خیر و شر اور حق و باطل کا میدان جنگ بن گیا ہو اور انسان کے لیے راستے کی تاریکی کے باعث اپنی منزل کی طرف سفر کرنا بھی دشوار ہوجائے، انسان کی جرأت و ہمت آرزوؤں اور تمناؤں سے کنارہ کش ہوگئی ہو، جب انسانی عقل غور و فکر کے قابل نہ رہے اور ضمیر کی آواز بھی خاموش ہوجائے، زندگی میں انسان کو کوئی ہمسفر ساتھی بھی نظر نہ آئے اور راستے میں جگنو کا شرر یعنی روشنی کا ہلکا منبع بھی موجود نہ ہو۔ اس تاریکی میں مرجانے والے عزیزوں کی پیشانیاں روشن ہوجاتی

ہیں ۔ بالکل اسی طرح جس طرح اندھیری رات میں آسمان پر ستارے چمکتے اور چلنے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

(۱۵۸)

تعارف اِس نظم کے بارے میں نسیم امروہوی "فرہنگِ اقبال" میں لکھتے ہیں۔
" یہ بانگ درا میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان ہے جو ایک رومانی نظم ہے جستجو کے باوجود یہ پتا نہ چل سکا کہ اس محبوبہ کا حدود اربعہ کیا تھا جس نے تحفے کے طور پر پھول بخش کئے ...... بانگِ درا میں اِس نظم کے آٹھ شعر درج ہیں صاحبِ باقیات نے چار شعر اور لکھے ہیں"۔

اِسی طرح روزگارِ فقیر جلد دوم کے صفحہ ۳۳۳ پر لکھا ہے :

" آٹھ شعر کی یہ نظم بانگِ درا میں ہے "۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بانگِ درا میں اِس نظم کے آٹھ نہیں، صرف سات شعر درج ہیں۔

حلِ لغات زہے نصیب : تیری قسمت بہت ہی اچھی ہے ؛ رقیب : دشمن، مقابل ؛ افسردہ : اداس ؛ گلچیں : پھول توڑنے والا ؛

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے ـــ ـــ ـــ

وضاحت وہ اپنے ناز و ادا میں مست رہنے والی جب کبھی چمن میں جاتی ہے تو چمن کی ایک ایک کلی کی زبان پر یہ دعا آجاتی ہے کہ اللہ کرے یہ شخصیت تمام پھولوں کو چھوڑ کر مجھے چن لے اور اب تو میں صرف ایک کلی ہوں لیکن اگر یہ محبوب شخصیت مجھے توڑ لے تو میں سورج کے پھول کی حیثیت اختیار کر لوں یعنی سورج کے لیے باعث رشک بن جاؤں۔

شاعر کلی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اُس محبوب ہستی نے تجھے شاخ سے توڑا ہے اور یہ تیری انتہائی خوش نصیبی ہے ۔ تجھ پر اس مہربانی کی وجہ سے تیرے ساتھ کے سارے پھول رشک و حسد کے باعث تڑپتے رہ گئے۔ تُو نے شاخ سے جدائی کا دُکھ اٹھایا لیکن یہ دکھ اٹھا کر تجھے محبوب سے

قربت میسر آگئی اور یوں تیری زندگی کی خوبی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔
میرا کنول جس پر اہلِ نظر قربان ہو رہے ہیں اور جس پر میری جوانی کے گلشن یعنی جوانی کے ولولوں کو ناز ہے کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور کسی رنگین دامن تک نہیں پہنچ سکا۔ میرے دل کے اِس کنول کو بہار کبھی بھی نہیں کھلا سکے گی۔ یہ پھول ہمیشہ کسی توڑنے والے کے انتظار میں اداس رہتا ہے۔

ترانۂ ملی

(۱۵۹)

حلِ لغات

پاسباں : محافظ ۔ **ہلال** : پہلی رات کا چاند ۔ **سیل** : سیلاب ۔ **دینے والے** : ڈرنے والے ۔ **اندلس** : یورپ کا ملک جس کا موجودہ نام اسپین ہے ۔ **دجلہ** : عراق کا دریا ۔ **حرمت** : عزت ۔ **میرِ حجاز** : آنحضرتؐ مراد ہیں ۔ **بانگِ درا** : گھنٹی کی آواز ۔ **جادہ** : راستہ ۔

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا ـــ ـــ ـــ

وضاحت

چین، عرب اور ہندوستان سبھی ہمارے ملک ہیں۔ دراصل ہم مسلمان ہیں اور کسی خاص خطہء ارض سے وابستہ نہیں ہیں لہٰذا ساری دنیا ہمارا وطن ہے۔ ہمارے سینوں میں توحید کی امانت محفوظ ہے اور چونکہ اللہ اور اس کی وحدانیت دنیا سے ختم نہیں ہو سکتی لہٰذا اِس امانت کے حوالے سے ہم بھی دائمی ہوگئے۔ اس طرح دنیا سے ہمارے آثار و نشانات مٹانا آسان نہیں ہے۔ ساری دنیا میں کفر و الحاد کی تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ہر طرف بت خانے ہی بت خانے تھے۔ ایسے میں حضرت ابراہیمؑ نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر یعنی خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ ہم اس کے محافظ ہیں۔ یہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ یعنی خانہ کعبہ ملتِ اسلامیہ میں نظم و ضبط اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ مرکزیت نہ رہے تو ملت بھی پارہ پارہ ہو جائے۔
علامہ اقبال پہلی رات کے چاند کو خنجر سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہمارا قومی نشان

ہے یعنی یہ ہمارے جھنڈے پر موجود ہے۔ چونکہ ہلال کی شکل خنجر جیسی ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کے آغاز ہی سے خنجروں اور تلوار یعنے آلات جنگ سے مانوس ہوجاتے ہیں اور انہی کے سائے میں جوانی کے مرحلے تک پہنچتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا ہمیں کون ڈرا سکے گا؛

اگرچہ آنحضرتؐ عرب میں مبعوث ہوئے اور اسلام کا آغاز اسی خطے سے ہوا لیکن ہماری اذانیں عرب سے بہت دور۔ یورپ کی وادیوں میں بھی گونجتی رہیں اور یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سیلاب دنیا کے کسی ملک اور کسی بھی قوم سے نہیں رک سکا اور ہم نے بہت سے ممالک فتح کیے۔

اے آسمان! ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو باطل سے ڈر جاتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک دو بار نہیں بلکہ سینکڑوں بار تو ہمارا امتحان بھی لے چکا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ہم باطل سے کبھی نہیں ڈرے۔ اے اندلس کے باغ کیا تجھے وہ دن یاد نہیں جب ہم نے تیری شاخوں میں اپنے آشیانے بنا رکھے تھے یعنی جب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت تھی اور اے دریائے دجلہ کی موج تو بھی ہمیں اچھی طرح پہچانتی ہے اور اسی لیے تیرا دریاب تک ہمارے افسانے اور قصے سُنا رہا ہے۔

اے حجاز کی مقدس سرزمین! جب بھی وقت آیا ہم مسلمانوں نے تیری عزت وعظمت کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک تیری رگوں میں ہمارا خون دوڑ رہا ہے۔ مسلمانوں کے قافلے کے سربراہ اور سالار آنحضرتؐ ہیں اور یہی نام ہے جو ہماری مضطرب اور بے چین جانوں کیلئے آرام وسکون کا باعث ہے۔

اقبال کا یہ ترانہ مسلمانوں کے قافلے کے لیے گھنٹی کی آواز کی حیثیت رکھتا ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارا قافلہ اب پھر اپنی منزل کی طرف سفر کرنے کے لئے تیار ہے۔

وطنیت

(۱۶)

حل لغات جم: ایران کا مشہور بادشاہ جمشید مراد ہے، ساقی: شراب پلانے والا، روش: طرز، انداز، حرم: کعبہ، آزر: حضرت ابراہیمؑ کے والد یا

یا چچا جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بت تراش تھے۔ پیراہن : لباس ۔ تہذیب نو : نئی مغربی تہذیب ۔ کاشانہ : گھر ۔ دیرینہ : پرانا ۔ ماہی : مچھلی

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ۔ ۔ ۔

وضاحت اِس نئے زمانے میں شراب بھی نئی ہے ۔ شراب پینے کے برتن مثلاً پیالہ وغیرہ بھی نیا ہے اور شراب پینے والے لوگ بھی مختلف اور نئے ہیں ۔ شراب پلانے والے نے بھی مہربانیوں اور مظالم کے ایک مختلف اور نئے انداز کی بنیاد رکھی ہے ۔ ان سب لوگوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنے لئے نیا کعبہ تعمیر کر لیا ہے اور تہذیب کے بت تراش نے ان سے نئے نئے بت ترشوالئے ہیں یعنی مسلمانوں نے بھی اپنے لئے دوسرے لوگوں کی طرح تہذیب کے نام پر بہت سی چیزوں کو اپنا معبود مان لیا ۔

لیکن اس جدید دور میں تخلیق ہونے والے بہت سے خداؤں میں وطن سب سے بڑا خدا ہے اور یہ ایسا خدا ہے کہ اِس کا لباس مذہب کے کفن کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وطن کی پرستش کا لازمی نتیجہ مذہب کی موت کی صورت میں سامنے آتا ہے ۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ بت یعنی وطن نئی تہذیب مغرب کا تراشا ہوا بت ہے ۔ یہ ایسا بت ہے جو آنحضرت ؐ کے دین کے گھر کو تباہ و برباد کر دیتا ہے ۔ لیکن اے مسلمان تو خدا کو ایک ماننے کے عقیدے کی وجہ سے طاقت ور ہے ۔ تیرا وطن کوئی خطۂ ارض نہیں ہے بلکہ خود اسلام تیرا وطن ہے ۔ تیری نسبت کسی خاص خطے سے نہیں بلکہ آنحضرت ؐ سے ہے اور تو اِسی لئے مصطفوی کہلاتا ہے ۔ لہٰذا تجھے چاہیئے کہ زمانے کو ایک بار پھر پرانا نظارہ دکھا دے اور وطن کے بت کو تباہ و برباد کر دے ۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر مسلمان کسی ایک مقام اور خطۂ ارض کا اسیر ہو جائے تو اس کا نتیجہ مسلمان کی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے ۔ تجھے اس دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے جس طرح مچھلی سمندر میں وطن کی قید سے آزاد ہو کر رہتی ہے یعنی بیشک مچھلی سمندر ہی میں رہتی ہے لیکن سمندر کے کسی خاص حصے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ سارا سمندر اس کا وطن ہوتا ہے ۔ اعلیٰ اصولوں اور بلند نصب العین کے لیے وطن کو چھوڑ دینا خدا کے پیارے نبی آنحضرت ؐ کی سنت ہے ،

اور تجھے نبوت کی سچائی پر گواہی دینا چاہیئے یعنی اگر ضرورت پیش آئے تو اپنے نصب العین پر وطن کو قربان کردے ۔

بیشک آنحضرت ﷺ نے وطن کی محبت کو ایمان کا حصہ قرار دیا لیکن آنحضرت ﷺ کی حدیث میں وطن کی معنویت کچھ اور ہے جبکہ آج کی سیاست میں وطن سے بالکل مختلف مفہوم مراد لیا جاتا ہے یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق وطن صرف وہ ہے جہاں انسان پیدا ہوتا اور اپنی زندگی گذارتا ہے اور اس کی محبت ہر انسان کی فطرت میں موجود ہوتی ہے جبکہ آج کے تصورِ وطنیت پر انسان کی قومیت تشکیل پاتی اور دنیا میں شر و فساد کا موجب بنتی ہے ۔

؎ اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت یہی وجہ ہے کہ جدید تصورِ وطن کے باعث زمانے بھر کی قوموں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی پائی جاتی ہے ۔ وطن کے اسی تصور کے باعث تجارت کا واحد مقصد بھی دوسرے ممالک کو اپنا غلام بنانا قرار پایا ہے ۔ اس تصور کی وجہ سے امورِ مملکت چلانے کا سلسلہ صداقت اور سچائی سے خالی ہو گیا ہے ۔ اور اسی کے باعث طاقتور قومیں کمزور قوموں اور ممالک کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں ۔

وطن کے اسی جدید تصور کے باعث اللہ تعالیٰ کی مخلوق یعنے انسان مختلف قوموں میں تقسیم ہو گئے اور اسلام کے تصورِ ملت کو اس وطن پرستی کے نظریے سے نقصان پہنچا ہے ۔

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

(۱۶۱)

حلِ لغات بحرِ خشک : خشک سمندر یعنی صحرا ؛ دشنۂ رہزن : راستے میں لوٹنے والے کا خنجر ؛ بیدل : مایوس ، مغموم ؛ زہراب : زہریلا پانی ؛ ہلالِ عید : عید کا چاند یعنے خوشی و مسرت عطا کرنے والا ؛ یثرب : مدینہ منورہ کا پرانا نام ؛ مدفون : دفن کیا ہوا ؛ زیاں اندیش : نقصان کی بات سوچنے والا ۔

ے قافلہ لُٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور ـ ـ ـ

وضاحت یہ نظم ایک ایسے حاجی کی زبانی ہے جو حج کرنے کے بعد مکۃ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کرتا ہے لیکن راستے ہی میں قافلے کو ڈاکو لوٹ لیتے ہیں اور مزاحمت کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ حاجی جو زندہ بچ رہتا ہے، اس واقعہ کے بارے میں کہتا ہے کہ ابھی منزل یعنی مدینہ منورہ بہت دور ہے اور صحرا میں قافلہ لوٹ لیا گیا ہے۔ صحرا کا دوسرا کنارہ بھی دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا۔ میرے ساتھ سفر کرنے والے بہت سے لوگ ڈاکوؤں کے خنجروں کا شکار ہو گئے۔ جو زندہ بچ رہے وہ مایوس و مغموم ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے مکہ کی طرف لوٹ گئے۔ قافلے میں شامل ایک بخاری نوجوان نے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کتنی بے جگری اور بہادری سے لڑتے ہوئے بڑی خوشی کے ساتھ جان دی۔ یوں گویا اس نے موت کے زہریلے پانی کے ذریعے زندگی پائی۔ اس بخاری نوجوان کے لیے خنجر عید کے چاند کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وہ خنجر دیکھ کر خوفزدہ ہونے کی بجائے مسرت سے سرشار ہو گیا۔ اس کے دل میں زیارتِ مدینہ کا شوق تھا اور اس کے لبوں پر اللہ کی وحدانیت کا نعرہ تھا۔

ایسی حالت میں جان و مال کا خوف تو یہ کہتا ہے کہ مدینے کی طرف اکیلے نہ جانا چاہیئے لیکن عشق کا جذبہ کہتا ہے کہ تو مسلمان ہے اور مسلمان اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ لہٰذا تجھے بے خوف و خطر آگے بڑھنا چاہیئے۔ کیا میں روضۂ رسول کی زیارت کیے بغیر مکہ کی طرف لوٹ جاؤں؟ اگر ایسا کروں تو قیامت کے دن جان پر کھیل جانے والے عاشقوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ حجاز کے دشت کے مسافر کو جان کا خوف نہیں ہوتا۔ خود آنحضرت کی ہجرت میں یہی راز چھپا ہوا ہے حاجی سوچتا ہے کہ اگر یہ سفر کرتا ہے تو شامی کے محمل کے ساتھ چلنے میں زندگی کی سلامتی ہے لیکن عشق تو خطروں سے دوچار ہو کر لذت و لطف حاصل کرتا ہے۔ افسوس کہ انسانی عقل ہمیشہ خسارے اور گھاٹے کے انداز میں سوچتی ہے اور انسان کا جذبۂ عشق انتہائی بے خوف و نڈر ہوتا ہے۔

اِس نظم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم اس وقت لکھی جب عام مسلمان راستے کے خطرات کے باعث حج کرنے سے گریز کرنے تھے۔

قطعہ

(۱۶۲)

حلِ لغات شوریدہ : دیوانہ، عاشق ۔ بنائے ملت : ملت کی بنیاد ۔ زائرانِ حریم مغرب : مغرب کے حرم کی زیارت کرنے والے، مغربی تہذیب کے دلدادہ اور مقلد ۔ مرشدانِ خود بیں : اپنے فائدے کو پیشِ نظر رکھنے والے رہنما ۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت کل ایک دیوانہ آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس کے پاس کھڑا تھا اور رو رو کر نہایت دلسوزی سے کہہ رہا تھا کہ مصر اور ہندوستان کے مسلمان مسلم قومیت کے تصور کا خاتمہ کر رہے ہیں ۔ یہ مغربی تہذیب و تمدن اور نظریات و خیالات کے مقلد ہمارے رہنما بننے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں لیکن ہم آپ ﷺ کی تعلیمات سے ناواقف ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے ۔ خدا آپ کی قوم کو تمام خطرات سے محفوظ رکھے اس لیے کہ آج کل اپنا ذاتی فائدہ ملحوظِ خاطر رکھنے والے رہنما محض اپنی عزت بنانے کے لئے مسلمانوں میں بگاڑ اور زوال کے اسباب پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ۔

لیکن اے اقبال اب تمہاری باتوں پر کون توجہ دے گا؟ زمانہ بدل گیا ہے اور اس نئے زمانے میں تم ابھی تک لوگوں کو پرانے زمانے کی باتیں سُنا رہے ہو ۔

شکوہ

(۱۶۳)

تعارف نظم شکوہ مسدس فارم کے اکتیس بندوں پر مشتمل ہے ۔ نسیم امروہوی کے نزدیک یہ نظم ۱۹۰۹ء میں لکھی گئی تھی لیکن اس سلسلے میں ان کا خیال درست نہیں ۔ اس

نظم کا سالِ تصنیف ۱۹۱۱ء ہے جیسا کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب "اقبال کی طویل نظمیں" میں لکھتے ہیں :

"یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۲۶ویں سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی جو اپریل ۱۹۱۱ء میں ریواز ہوسٹل اسلامیہ کالج میں منعقد ہوا تھا"

نظرِ ثانی میں اس نظم میں زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے سرود رفتہ میں صرف ایک مصرع میں کی گئی ترمیم کا ذکر کیا ہے جبکہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ترمیم کئے گئے دو مصرعوں کی نشاندہی کی ہے۔ بانگ درا کی اشاعت سے قبل یہ نظم مخزن، تمدن اور پنجاب ریویو جیسے رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ بعد ازاں مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، عربی اور بنگالی وغیرہ میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔ ایک مصور ضرار احمد نے نظم شکوہ کو مصور بھی کیا تھا۔

حل لغات

زیاں کار : نقصان اٹھانے والا ۔ **سود فراموش** : فائدہ اور نفع بھول جانے والا ۔ **فردا** : آنے والا کل، مستقبل ۔ **دوش** : گزرا ہوا کل، ماضی ۔ **جرأت آموز** : جرأت سکھانے والی ۔ **تابِ سخن** : بات کہنے کی قوت، شاعری ۔ **خاکم بدہن** : میرے منہ میں خاک پڑے ۔ **شیوہ** : طریقہ، عادت ۔ **تسلیم** : قبول کرنا، مان لینا، اطاعت کرنا ۔ **معمور** : بھرا ہوا ۔ **اربابِ وفا** : وفا کرنے والے ۔ **خوگر** : عادی ۔ **قدیم** : منطق کی اصطلاح میں اللہ تعالٰی کو قدیم اور باقی تمام چیزوں کو حادث لکھا جاتا ہے۔ **پریشاں** : بکھرنا ۔ **الطاف** : مہربانی، عنایت ۔ **مسجود** : سجدہ کرنے کے لائق ۔ **معبود** : عبادت کرنے کے لائق ۔ **پیکرِ محسوس** : وہ جسم جسے حواس خمسہ محسوس کر سکیں، مادی وجود ۔ **سلجوق** : ترکوں اور تاتاریوں کا ایک خاندان جو بعد ازاں حلقہ بگوشِ اسلام ہوا اور اسلام کی بے حد خدمت کی ۔ **تورانی** : علاقہ ترکستان و توران کے رہنے والے یعنی ترک ۔ **ساسانی** : ایران کا ایک مشہور شاہی خاندان جن کے دورِ حکومت میں ایران حلقۂ اسلام میں داخل ہوا اور ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا ۔ **نصرانی** : عیسائی ۔ **معرکہ آرا** : میدانِ جنگ سجانے والے، لڑنے والے ۔ **جہاندار** : بادشاہ ۔ **سرکش** : باغی ۔ **خیبر** : یہودیوں کا ایک شہر جسے آنحضرت ﷺ نے فتح کیا۔ اس شہر کی فتح کا سہرا حضرت علی کے سر ہے ۔ **شہرِ قیصر** : قسطنطنیہ جو روم کا دار الحکومت تھا اور جسے ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے فتح کیا تھا ۔ **مخلوق خداوند** : وہ خدا جو مخلوقات میں

سے پیدا ہوئے یا کئے گئے مثلاً بت وغیرہ۔ آتشکدۂ ایران: اسلام سے پہلے ایران میں آگ کی پوجا کی جاتی تھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پیکار: جنگ۔ محمود: مشہور جرنیل اور بادشاہ محمود غزنوی جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور سومنات فتح کیا۔ ایاز: سلطان محمود غزنوی کا ایک امیر جو پنجاب کا گورنر بھی رہا۔ بعض روایات میں اسے سلطان محمود کا غلام اور بعض میں عاشق یا محبوب قرار دیا گیا ہے۔ محفلِ کون ومکاں: کائنات، دنیا۔ بحرِ ظلمات: اوقیانوس سمندر، یہ سمندر افریقہ یورپ اور امریکہ کے درمیان حائل ہے۔ صفحۂ دہر: دنیا، کائنات۔ مستِ مئے پندار: غرور کی شراب میں مست یعنی مغرور و متکبر انسان۔ کاشانہ: گھر۔ حدی خواں: اونٹوں کے قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے نغمے گانے والا۔ خندہ زن: ہنسنے والا، مذاق کرنے والا۔ پاس، ہمدردی، خیال۔ قصور: قصر کی جمع، محلات۔ مدارات: خاطر داری۔ سیلی: تھپڑ، طمانچہ۔ نجد: سعودی عرب کا ایک صوبہ، مراد اسلامی دنیا۔ آزردگی: ناراضی، خفگی۔ آشفتہ سری: دیوانگی۔ سلمانؓ: حضرت سلمانؓ فارسی مراد ہیں جن کے بارے میں ہے کہ وہ ایران میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں آتش پرست تھے پھر عیسائی ہوئے۔ حقیقت کی تلاش میں اپنے گھر سے نکلے۔ آخر کار ایک یہودی کے غلام کی حیثیت سے مدینہ منورہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ اسلام سے ان کا اخلاص مثالی تھا۔ اویس قرنی: ایک مقام قرن کے باشندے تھے اور آنحضرتؐ کے انتہائی عاشق۔ والدہ کی خدمت کے خیال سے زیارت کے لئے مدینہ نہ آسکے۔ روایت ہے کہ غزوۂ احد میں آنحضرتؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوگئے تو اویس قرنی نے اپنے سارے دانت توڑ لئے۔ یہ ان کے عشق کی انتہا تھی۔ جادہ: راستہ۔ ہرجائی: ہر جگہ موجود جس میں وفا نہ ہو۔ فاراں: عرب کا ایک پہاڑ۔ توریت کی ایک روایت کے مطابق خداوند کوہِ فاران پر ہی جلوہ گر ہوا۔ یہ اشارہ مذہب اسلام کی طرف ہے۔ آتش اندوز: آگ جمع کرنے والا۔ سوختہ ساماں: جن کا اسباب جل گیا ہو۔ ذوقِ خود افروزی: اپنے آپ کو جلانے کا شوق۔ عناں تاب: باگ موڑنے والی۔ مذاق: شوق۔ مضراب: ساز بجانے کا آلہ۔ مورِ بے مایہ: حقیر چیونٹی۔ سلیماں: حضرت سلیمانؑ جو نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ غماز: چغلی کھانے والا۔ زمزمہ: نغمہ، گیت۔ بانگِ درا: گھنٹی کی آواز۔

۵ کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں؟ ــــ ــــ

وضاحت | میں نقصان کیوں اٹھاؤں اور اپنے فائدے کو کس لئے بھول جاؤں؟ آخر میں کس بنا پر مستقبل کی فکر نہ کروں اور ہمیشہ ماضی کے غم میں کھو یا رہوں؟

آخر کب تک بلبل کے نالہ و فریاد سننے کے لئے سراپا گوش بنا رہوں ۔ اے میرے ساتھی کیا میں پھول ہوں کہ بلبل کی آہ و زاری سننے کے باوجود خاموشی اختیار کئے رکھوں ۔

مجھے خدا نے قوتِ گویائی دی جو مجھے گفتگو کرنے کی جرأت سکھاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ حقیر و ناچیز کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ اور شکایت ہے ۔ میرے منہ میں خاک پڑے یعنی مجھے اللہ تعالےٰ سے شکوہ نہیں کرنا چاہئیے تھا لیکن مجبور ہوں ۔

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ بات درست ہے کہ ہم یعنی مسلمان ہر بات مان لینے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی گذارنے کے معاملے میں شہرت رکھتے ہیں ۔ لیکن اب ہم بھی اپنے دکھ درد کا شکوہ کرنے اور قصہ سنانے پر مجبور ہیں ۔ اس وقت ہماری حالت اس ساز جیسی ہے جو اگرچہ خاموش ہوتا ہے لیکن نغموں سے بھرا ہوا ہوتا ہے ۔ ایسے ساز کو ذرا سا چھیڑ دیا جائے تو اس سے نغمے ابلنے لگتے ہیں ۔ ایسی صورت میں اگر ہمارے ہونٹوں پر فریاد آتی ہے تو اس کے لئے ہمارا عذر قبول کیا جانا چاہئیے اور ہمیں مجبور سمجھا جانا چاہیئے ۔

اے خدا ! ہمیشہ بے چون و چرا دعا کرنے والوں سے اب تھوڑی سی شکایت بھی سُن لے اور وہ لوگ جو ہمیشہ سے تیری تعریف و توصیف بیان کرنے کے عادی ہیں ، اب اُن سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے ۔

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم ۔ ۔ ۔

وضاحت اے خدا ساری دنیا سے قدیم ہونے کے باعث یوں تو تیری ذات ازل ہی سے موجود تھی ۔ لیکن تیری حیثیت ایسی ہی تھی جیسے گلستان میں پھول کھلے ہوئے ہوں لیکن ہوا نہ ہونے کے باعث اُن کی خوشبو پھیل نہ سکے ۔ یعنی تیرا پیغام دنیا میں عام نہیں ہوا تھا ، اے ہر شخص سے مہربانی اور رعنایت و مروّت سے پیش آنے والے تجھے ذرا انصاف سے دیکھنا چاہئیے کہ اگر نسیم نہ ہوتی تو دنیا میں پھول کی خوشبو کیسے پھیلتی ۔ یعنی اگر مسلمان نہ ہوتے تو تیری توحید کے پیغام کو کون عام کرتا ۔ جس طرح ہوا پھولوں کی خوشبو کو اپنے دوش پر اٹھاتی اور ہر طرف پھیلاتی ہے ۔ اس طرح مسلمانوں نے تیرا پیغام عام کیا ۔

اور اگر ہم تیرا پیغام لے کر ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے تو یہ پریشانی بھی ہمارے لئے وجہ تسلی و اطمینان تھی ۔ ورنہ تیرے محبوب یعنی آنحضرتؐ کی امت دیوانی نہیں تھی کہ اپنا گھر بار

اور ملک و وطن چھوڑ کر ساری دنیا میں ماری ماری پھرتی ۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر ۔ ۔ ۔

وضاحت ہم مسلمانوں سے پہلے تیری دنیا کی حالت بہت ہی عجیب و غریب تھی ۔ کہیں لوگ پتھر کے بتوں کو سجدہ کرتے تھے اور کہیں انھوں نے اپنا معبود درختوں کو قرار دے رکھا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آنکھ ایسے خداؤں کی عادی ہو چکی تھی جو حواس خمسہ کے ذریعے محسوس کئے جا سکیں ۔ بھلا ایسے میں کوئی شخص اُس خدا کو کیسے مانتا جس کو دیکھ نہ سکتا ہو ۔

مجھے تو اچھی طرح معلوم ہے کہ اِس وجہ سے دنیا میں کوئی ایک شخص بھی تیری عبادت کرنے والا نہیں تھا ۔ البتہ مسلمانوں کی طاقت اور فتوحات نے تیرا پیغام ساری دنیا میں عام کر دیا ۔ اور بیشمار لوگ تیری عبادت کرنے لگے ۔

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی ۔ ۔ ۔

وضاحت مسلمانوں سے پہلے اسی دنیا میں ترکوں کا قبیلہ سلجوق بھی تھا اور توران کے خطے میں تورانی بھی آباد تھے ۔ چین جیسے ملک میں چینی بھی رہ رہے تھے اور ایران کا ساسانی خاندان بھی برسرِ اقتدار تھا ۔ اِس دنیا میں یونانی بھی رہتے تھے اور یہودی و عیسائی بھی ۔ لیکن تو جانتا ہے کہ اپنے مفادات کو پسِ پشت ڈال کر صرف مسلمانوں نے تیرے نام کے لیے تلوار اٹھائی اور تیری بگڑی ہوئی بات کو سنوار دیا ۔ یعنی نئے سرے سے پوری دنیا میں توحید کو عام کیا ۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ۔ ۔ ۔

وضاحت ساری دنیا میں صرف مسلمان ہی تھے جو تیری وجہ سے میدانِ جنگ میں لڑا کرتے تھے ۔ ہم بوقت ضرورت خشکیوں یعنی زمین پر بھی لڑتے تھے اور دریاؤں اور سمندروں میں بھی جنگ آزما ہو جاتے تھے ۔ ہم نے اپنے وطن عرب سے بہت دور جا کر یورپ کے عیسائی عبادت خانوں میں بھی اذانیں دیں ۔ یعنی عیسائیوں کو مسلمان کیا اور افریقہ کے تپتے ہوئے اور شدید گرمی والے ریگستان بھی ہمارا راستہ نہ روک سکے اور ہم وہاں بھی پہنچے ۔

مسلمانوں کو بڑے بڑے بادشاہوں کی شان و شوکت بھی مرعوب نہ کر سکتی تھی اور ہم تلواروں کی چھاؤں یعنی انتہائی خطرات کے عالم میں بھی تیرا ہی نام لیا کرتے تھے ۔ آخری شعر میں اُس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی رُو سے حضرت عمرِ فاروق کا قاصد بلاخوف و خطر ایرانی دربار میں پہنچا تھا ۔

ے ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لئے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ اگر ہم دنیا میں جی رہے تھے تو صرف اس لئے کہ آئندہ کسی جنگ میں شریک ہوں اور اس کے مصائب برداشت کریں اور اگر ہمیں موت آتی تھی تو وہ بھی صرف اِس مقصد کے لئے کہ دنیا میں تیری عظمت اور بڑائی قائم رہے۔ ہماری لڑائیاں اور جنگیں اپنی حکومت و سلطنت کے قیام کے لئے نہیں ہوتی تھیں۔ تُو ہی بتا کیا ہم زمانے بھر میں ہتھیلی پر سر رکھے دولت کے لئے پھرا کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اگر ہماری قوم دنیا کے مال و دولت کی شیدائی ہوتی تو پھر وہ بت فروخت کرنے کی بجائے بُت کیوں توڑتی۔

آخری شعر میں صنعتِ تضاد بھی ہے اور صنعتِ تلمیح بھی۔ تلمیح کے ذریعے اس روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی رُو سے محمود غزنوی نے ہندوؤں کی خطیر پیش کش کے باوجود سومنات کے مندر میں رکھا ہوا بت فروخت کرنے کی بجائے توڑ دیا تھا۔

ے ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر کسی سے جنگ پیش آجاتی تھی تو ہم اِس سے کبھی مُنہ نہ موڑتے تھے۔ اور ہماری شجاعت کے مقابلے میں شیر جیسے بہادر لوگ بھی شکست کھا جاتے تھے۔ ہم اپنے فوائد کی بجائے صرف اس شخص سے ناراض ہوتے تھے جو تجھ سے باغی ہوتا تھا اور اِس معاملے میں ہم تلوار تو تلوار توپوں سے مقابلہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے یعنی اس سلسلے میں ہمیں کمزور اور طاقت ور کا کچھ خیال نہ ہوتا تھا۔

ہم نے ہر انسان کے دل پہ تیری توحید کا نقش قائم کیا۔ یعنی ہر شخص تجھے وحدہٗ لاشریک ماننے لگا۔ زمانۂ امن تو ایک طرف خطرات میں گھر کر بھی ہم یہی پیغام عام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ہمارے سروں پر خنجر تول لیتا تو بھی ہم تیری ہی توحید ہی کا پیغام سناتے تھے۔

ے تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے خدا تو ہی بتا دے کہ یہودیوں کی بستی خیبر کے مضبوط ترین قلعہ القموص کا دروازہ کس نے توڑا۔ قسطنطنیہ کو کس نے فتح کیا؟ کس قوم نے اُن خداؤں کے جسم کاٹ دیئے تھے جو مخلوق ہونے کے باوجود خدا بن بیٹھے تھے اور تیری ذات کا انکار کرنے والوں کی افواج کو کس قوم نے تہ تیغ کیا؟

ایران کے آتش کدے کو کس نے بجھایا اور کس نے نئے سرے سے اللہ کے ذکر کو زندہ کیا

اِس بند کے تقریباً ہر مصرعے میں استفہام اقراری موجود ہے ۔ اور پہلے، دوسرے اور پانچویں مصرع میں تلمیحات بھی ہیں ۔

؎ کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی ۔ ۔ ۔

وضاحت دنیا میں بے شمار قومیں آباد ہیں لیکن ان میں سے کونسی قوم ہے جس نے صرف تجھ سے محبت کی اور جس نے صرف تیری محبت کے لیے جنگ کی مشکلات کو برداشت کیا۔ کس قوم کی تلوار نے ساری دنیا فتح کی اور دنیا پر حکومت کی ۔ کس کے نعروں سے تیری بیدار کی ہوئی دنیا جاگی اور اس نے نیک و بد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت حاصل کی ۔

وہ کونسی قوم ہے جس کے خوف سے بُت بھی سہم جاتے تھے اور منہ کے بل گر کے اللہ کی وحدانیت کا اقرار و اعتراف کرتے تھے ۔ یعنی یہ کارنامہ صرف مسلمانوں نے انجام دیا ۔

؎ آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز ۔

وضاحت اگر عین جنگ کے دوران میں نماز کا وقت آگیا تو مسلمان قوم جان کے خوف سے بے پروا ہو کر خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے سجدہ ریز ہو گئی ۔ صرف یہی نہیں بلکہ خواہ محمود جیسا عظیم بادشاہ اور خواہ ایاز جیسا حقیر غلام سب لوگ حفظِ مراتب کو بھول کر ایک ہی قطار میں کھڑے ہو گئے اور نماز میں اعلیٰ و ادنیٰ اور آقا و غلام کا فرق ختم ہو گیا ۔

نماز پڑھتے ہوئے آقا و غلام اور فقیر و امیر سب برابر ہو گئے ۔ کم از کم تیرے سامنے آئے تو انھوں نے تمام امتیازات کو فراموش کر دیا ۔ اِس بند میں تصویر کاری بہت عمدہ ہے ۔

؎ محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے ۔ ۔ ۔

وضاحت مسلمان اِس دنیا میں ہمہ وقت تیرا پیغام لئے پھرتے رہے ۔ ان کی کیفیت پیالے جیسی تھی جو بلا امتیاز ساری محفل میں گردش کرتا ہے ۔ البتہ مسلمانوں کی شراب توحید کی شراب تھی جسے وہ بانٹتے پھرتے تھے ۔ تیرا پیغام لے کر پہاڑوں اور صحراؤں میں گئے اور اے خدا تو یہ بھی جانتا ہے کہ اِس کوشش میں مسلمان کبھی ناکام بھی نہیں ہوئے تھے ۔

صحرا تو صحرا ہم نے تو دریا تک نہیں چھوڑے ۔ بحرِ ظلمات میں بھی اپنے گھوڑے ڈال دیئے ۔ آخری مصرع میں عقبہ بن نافع کی طرف اشارہ ہے جس نے مراکش فتح کرنے کے بعد آگے بڑھنا چاہا تو آگے سمندر آگیا ۔ اس نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور کہا کہ اے خدا آگے تیری زمین ختم ہو گئی ورنہ میں آگے بھی تیرے دین کی روشنی پھیلاتا ۔

؎ صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے ۔ ۔ ۔

وضاحت ہم یعنی مسلمانوں نے اِس دنیا سے باطل کو مٹا دیا اور حق کا بول بالا کیا۔ انسان دوسرے انسانوں کا غلام ہو چکا تھا۔ ہم نے یہ سلسلہ ختم کیا۔ تیرے کعبے کو جہاں پر بت رکھ دیئے گئے تھے، ہم نے اپنی پیشانیوں سے آباد کیا۔ تیری الہامی کتاب قرآن کو ہم نے اپنے سینے سے لگایا یعنی اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز سمجھا اور اس کی حفاظت کی۔

اس کے باوجود تو ہم سے شکایت کرتا ہے کہ ہم مسلمان وفادار نہیں ہیں۔ اگر یہ درست ہے اور ہم وفادار نہیں تو اے خدا تو بھی تو دل دہی نہیں کرتا۔

؎ اُمتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہگار بھی ہیں ۔ ۔ ۔

وضاحت اس دنیا میں اور بہت سی قومیں بھی ہیں اور ان قوموں میں بے شمار گنہگار لوگ بھی ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو انتہائی مغرور اور متکبر ہیں۔ سست بھی ہیں اور غفلت کرنے والے بھی ہیں اور انتہائی چالاک لوگ بھی ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو تیرا نام تک لینا پسند نہیں کرتے اس کے باوجود ہمارے اِن دشمنوں پر تیری رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور بجلی صرف مسلمانوں کے گھروں پر گرتی اور انہیں جلا کر تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

؎ بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے

وضاحت بت خانوں میں بت کہہ رہے ہیں کہ دنیا سے مسلمان رخصت ہو گئے۔ انہیں اس بات کی خوشی ہے کہ کعبے کی حفاظت کرنے والے ختم ہو گئے۔ دنیا سے وہ لوگ چلے گئے جو اونٹوں کے قافلوں کے ساتھ نغمے گاتے ہوئے اپنا سفر طے کیا کرتے تھے۔ پھر صرف یہ لوگ ہی رخصت نہیں ہوئے بلکہ اپنے ساتھ قرآن بھی لے گئے۔ یعنی قرآنی تعلیمات جو بت پرستی کے خلاف ہیں، وہ بھی ختم ہو گئی ہیں۔

اے اللہ! آج کفر و الحاد ہماری تحقیر و تذلیل کر رہا ہے اور ہمارا مذاق اُڑا رہا ہے، کیا تجھے اِس کا احساس نہیں! خیر ہمیں تو چھوڑیئے کیا تجھے خود اپنی توحید کا بھی خیال نہیں رہا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان موحد اور ایک خُدا کو ماننے والے تھے وہ رخصت ہوئے تو یہ عقیدہ بھی ختم ہو جائے گا اور لوگ پھر ایک خدا کو چھوڑ کر ہزاروں بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے۔

ے بہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور ۔ ۔ ۔

وضاحت ہمیں یہ شکایت نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے پاس بے انتہا دولت ہے اور اُن کے خزانے مال و دولت سے بھرے ہوئے ہیں جنھیں محفل میں بات کرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ کافروں کو اِسی دنیا میں جنت کی حوریں اور محلات مل رہے ہیں جبکہ مسلمانوں کو صرف حوروں کے وعدوں پر ٹرخایا جا رہا ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب مسلمانوں پر پہلے جیسا لطف و کرم نہیں رہا۔ آخر کیا بات ہوگئی کہ مسلمانوں کی پہلے جیسی خاطرداری نہیں ہوتی؟

ے کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ آخر مسلمانوں میں دنیاوی مال و دولت نایید کیوں ہے۔ حالانکہ تیری قدرت اور کارسازی تو ایسی ہے جس کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ تو اتنا قادر ہے کہ اگر چاہے تو خشک اور بے آب و گیاہ صحرا میں بھی سمندر کی طرح بلبلے پیدا ہو جائیں یعنی صحرا سمندر بن جائے اور جو شخص صحرا میں سفر کر رہا ہے اُس کے سامنے سراب یعنی پانی کے دھوکے کی بجائے اس قدر پانی آ جائے کہ وہ سیلاب کے تھپیڑے کھانے لگے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ دشمن انھیں طعنے دے رہے ہیں۔ وہ ساری دنیا میں رسوا اور بدنام ہو چکے ہیں اور انھیں افلاس نے گھیر رکھا ہے۔ تو ہی بتا کیا تجھ سے عشق کرنے اور تیرے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے کا صلہ ذلت کی شکل میں ملنا چاہیئے۔

ے بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا ۔ ۔ ۔

وضاحت ایک زمانہ تھا جب روئے زمین کے بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن اب یہ دنیا دشمنوں کو پسند کرنے لگی ہے مسلمانوں کے لیے دنیا حقیقت کی بجائے محض ایک خیال اور وہم کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہم تو دنیا کی حکمرانی سے چلے گئے اور اب دنیا کو دوسرے لوگوں یعنی کفار نے سنبھال لیا۔ اس صورت حال میں ہم سے یہ شکایت نہ کرنا کہ دنیا توحید سے خالی ہوگئی۔ اور اب کوئی میری وحدانیت کا قائل نہیں رہا۔

ہم دنیا میں مال و دولت کے حصول کے لئے نہیں بلکہ صرف تیرا پیغام عام کرنے کے لئے زندہ ہیں۔ بھلا تو بھی سوچ کیا یہ ممکن ہے کہ شراب پلانے والا مر جائے اور شراب کا

کا پیالہ گردش کر رہا ہے۔ اقبال نے ساقی سے مسلمانوں کو اور پیغام توحید کو جام سے تشبیہہ دی ہے یعنی اگر مسلمان نہ رہے تو توحید کا پیغام کس طرح پھیلایا جا سکے گا۔

۵ تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ جو بزم تو نے آراستہ کی تھی، وہ ختم ہو گئی اور اس محفل میں جو تیرے چاہنے والے تھے وہ بھی رخصت ہو گئے یہ عشاق رات بھر تیرے لیے آہیں بھرتے رہتے تھے اور ہر صبح اُن کی زبان پر نالے ہوتے تھے، لیکن ان کے ختم ہونے کے بعد یہ سب کچھ بھی ختم ہو گیا۔ ان عشاق نے تجھے اپنا محبوب بنایا اور اس کا صلہ و انعام بھی پایا۔ ان کا زمانہ بہت ہی مختصر رہا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص کسی محفل میں آئے، بیٹھے اور فوراً بعد ہی اُٹھ کر چلا جائے۔

یہ عاشق تیرے جلووں کی تمنا لے کر آئے تھے لیکن تُو نے انھیں کل کے وعدے پر ٹرخا دیا ہیں کی بنا پر یہ انتہائی مایوس ہو کر چلے گئے۔ اب یہ نہیں آئیں گے خواہ انھیں کتنی ہی شدت سے کیوں نہ تلاش کیا جائے اور خواہ تیرا خوبصورت چہرہ چراغ کیوں نہ بن جائے۔

۵ دردِ لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ لیلےٰ یعنی محبوب کے دل میں درد کی وہی کیفیت ہے قیس یعنی عاشق کے سینے میں وہی پہلے جیسا گداز موجود ہے۔ عرب کے صحراؤں میں ہرن اُسی طرح مصروفِ خرام ہیں۔ عشق کا جذبہ بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے اور حُسن میں سحر و طلسم کی وہی پہلے جیسی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کی امت یعنی مسلمان بھی وہی ہیں اور اے خدا تُو بھی وہی ہے۔ یعنی حالات و کردار بالکل نہیں بدلے پھر مسلمانوں سے یہ بے وجہ ناراضی اور خفگی کس لیے ہے اور اپنے عاشقوں کے ساتھ یہ بیدردی کا سلوک کیوں روا رکھا جا رہا ہے۔

۵ تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا

وضاحت اے اللہ اِس خفگی کی کوئی تو وجہ ہونی چاہیئے۔ کیا ہم نے تجھے چھوڑ دیا یا آنحضرتؐ کی اتباع سے روگردانی کی۔ کیا ہم نے اپنے اسلاف کے برعکس بت توڑنے کی روایت ترک کر کے بت تراشنے کا کام شروع کر دیا۔ یا ہم نے تجھ سے اپنے عشق اور عشق کی دیوانگی کو ترک کر دیا؟ یا پھر حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت اویس قرنیؓ کی عاشقانہ

رسم کو ترک کر دیا !

ایسی بات یقیناً نہیں ہے۔ آج بھی تیری بڑائی کی آگ اپنے سینوں میں محفوظ کئے ہوئے ہیں اور آج بھی ہماری زندگی حضرت بلال رضؓ حبشی کی عاشقانہ روش کے مطابق گذر رہی ہے۔

ع عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی ۔ ۔ ۔

وضاحت یہ مانتے ہیں کہ ہمارے عشق میں وہ پہلے والا انداز موجود نہیں اور تیری فرمانبرداری کے راستے پر بھی ہم نہیں چل رہے۔ ہمارے دل قبلہ نما کی طرح بے چین و مضطرب بھی نہیں ہیں اور ہم نے تجھ سے وفا کو قائم رکھنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی پورا نہیں ہو رہا۔

لیکن تو اپنے طرزِ عمل پر بھی تو غور کر۔ تو بھی تو کبھی ہم پر توجہ کرتا ہے اور کبھی ہمارے دشمنوں یعنی کافروں پر مہربانی و عنایت کرتا ہے۔ اِس سے تو صاف ظاہر ہے کہ تو بھی ہرجائی اور بے وفا ہو گیا ہے۔

ع سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے ۔ ۔ ۔

وضاحت تو نے فاران کے پہاڑ پر دین کو مکمل کیا۔ تو اِس قدر قادر ہے کہ صرف ایک اشارے سے تو نے ہزاروں لوگوں کو اپنا عاشق اور گرویدہ بنا لیا۔ عشق کے حاصل کو آگ اور حرارت سے معمور کر دیا۔ اپنے جلوؤں سے ساری بزم کو جلا ڈالا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ آج ہمارے دل عشق کی اُس حرارت اور گرمی سے آباد نہیں ہیں۔ حالانکہ ہم تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے تیرے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیا تو ہم لوگوں کو بھول گیا ہے۔

ع وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا ۔ ۔ ۔

وضاحت عرب کے صحراؤں یعنی اسلامی دنیا میں زنجیروں کا وہ شور باقی نہیں رہا ہے عجیب بات یہ ہے کہ لیلیٰ کا عاشق اب لیلیٰ کے نظارے کا طلب گار نظر نہیں آتا۔ یقیناً اب ہم ہیں نہ وہ حوصلے ہیں، نہ وہ دل اور نہ ہم پہلے سے مسلمان باقی ہیں اور یہ ساری بربادی محض اس لئے ہوئی ہے کہ تو نے اس بزم کی رونق بڑھانا چھوڑ دی جس کی وجہ سے ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا۔

وہ دن کتنا اچھا اور مبارک ہو گا جب تو دوبارہ ہماری محفل میں سینکڑوں ناز و انداز کے ساتھ رونق افروز ہو گا اور بالکل بے پردہ ہماری محفل کی زینت بنے گا۔

؎ بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت غیر یعنی کافر گلستان میں نہر کے کنارے بیٹھے شراب پی رہے ہیں ۔ اُن کے ہاتھوں میں شراب کے پیالے ہیں اور وہ قمریوں کے گیت سُن رہے ہیں یعنی عیش و عشرت میں مست ہیں جبکہ مسلمان گلستان کے تمام ہنگاموں اور رونق سے الگ تھلگ ایک نعرۂ ہُو کے انتظار میں ہیں ۔

اے خدا ! اپنے عاشقوں کو پھر خود کو جلا ڈالنے کا شوق عطا فرما اور پرانی بجلی کو یہ حکم دے کہ وہ اِن عاشقوں کے جگر کو جلا ڈالے ۔

؎ قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت آوارہ و سرگرداں یعنی بھٹکی ہوئی قوم پھر اپنی باگ حجاز کی طرف موڑ رہی ہے یعنی پھر اسلامی اصولوں اور اِسلامی طرزِ حیات کی طرف لوٹ رہی ہے ۔ اگرچہ مسلمان موجودہ عہد میں اس بلبل کی مانند ہیں جس کے پر کاٹ دیئے گئے ہوں لیکن اڑنے کا شوق انھیں ان کی منزل کی طرف لے جا رہا ہے ۔

باغ کے ایک ایک غنچے اور ایک ایک پھول میں عاجزی و خاکساری کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے ۔ تو ذرا ساز کو چھیڑ کر تو دیکھ ۔ یہ ساز تو مضراب کا پیاسا ہے یعنی مضراب حرکت میں آئے گا تو ساز سے نغمے پیدا ہونے لگیں گے ۔

اس ساز کی تاروں سے نکلنے کے لئے نغمے بیتاب ہیں اور کوہ طور پھر اُسی آگ میں جلنے کے لئے بے چین ہے یعنی مسلمان پھر اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں ۔

؎ مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ ! امتِ مسلمہ کی مشکلیں آسان کر دے ۔ موجودہ دور میں مسلمان ایک حقیر و بے بضاعت چیونٹی کی طرح زندگی گذار رہے ہیں انھیں حضرت سلیمانؑ جیسا مرتبہ عطا کر دے ۔ محبت کی وہ دولت جو ان سے چھن چکی ہے اسے پھر سستا اور عام کر دے اور ہندوستان کے اُن مسلمانوں کو جو تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے ہندو مت کے قریب ہو گئے ہیں پھر سچا اور پکا مسلمان بنا دے ۔

ہمارے دل کی بہت پرانی اور پوری نہ ہو سکنے والی آرزو سے خون کی ندی بہہ نکلی ہے ۔ اور نشتروں سے بھرے سینے میں نالے بیتاب ہو رہے ہیں ۔

ے بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — — —

وضاحت افسوس ہے کہ خود پھول کی خوشبو باغ کے رازوں کو افشا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا قیامت ہے کہ خود پھول پھولوں کی چغلی کھانے لگے۔ بہار کا موسم گذر گیا اور باغ کا ساز لوٹ گیا۔ باغ کی شاخوں سے وہ پرندے اُڑ گئے جو ہمیشہ چمن میں نغمے گایا کرتے تھے۔

اِس کے باوجود ایک بلبل ہے جو ان بدترین حالات میں بھی نغمے گانے میں مگن ہے شاید اس کے سینے میں اب تک نغموں کا طوفان برپا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں پر بلبل سے مراد خود علامہ اقبال ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قوم کے متعدد افراد قوم کے خلاف کام کرنے لگے ہیں اور کچھ حضرات حالات کو ناخوشگوار سمجھ کر گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں فقط میں ہی ہوں جو قوم کو راہِ عمل پر گامزن کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔

ے قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں — — —

وضاحت قمریاں صنوبر کی شاخ سے اُڑ گئیں۔ پھول جن پتیوں سے خوشنما لگتا تھا، وہ پتیاں جھڑ گئیں۔ باغ کے پرانے آراستہ راستے ویران ہو گئے اور درختوں کی شاخوں سے پتوں کا لباس اتر گیا۔ یعنی گلستان میں خزاں چھا گئی۔ اس کے باوجود اس بلبل کا مزاج (یعنی اقبال کا مزاج) موسم کے تغیر سے اثر پذیر نہیں ہوا لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص اس بلبل کی آہ و زاری پر کان نہیں دھرتا۔ کاش کوئی اس کے پیغام کو سمجھ سکتا۔

ے لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں — — —

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اب نہ مرنے میں مزا ہے اور نہ جینے میں۔ جگر کا خون پینے کے علاوہ کوئی مشغلہ باقی نہیں۔ میرے آئینے میں کتنے جوہر بے چین و مضطرب ہیں اور میرے سینے میں کتنے جلوے تڑپ رہے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے ان جلوؤں اور جوہروں کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس باغ میں لالے کے وہ پھول ہی نہیں جن کے سینے داغوں سے مزین ہوں یعنی ملی درد رکھنے والے لوگ موجود نہیں۔

ے چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں — — —

وضاحت گو بلبل تنہا ہے یعنی شاعر کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں لیکن خدا کرے کہ سننے والوں کے دل اِسی بلبل کی آواز سے پھٹ جائیں اور لوگ

بانگِ درا یعنی میری شاعری کی وجہ سے خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ خدا کرے کہ وفا کے نئے دعوے کی وجہ سے مردہ دل پھر زندہ ہو جائیں اور مسلمانوں کے دل وہی پرانی شراب طلب کرنے لگیں

گو میرا تعلق عجم سے ہے یعنی میں عربی نہیں ہوں لیکن میری شراب یعنی شاعری کا انداز تو بالکل اسلامی ہے۔ گو میری شاعری ہندی اسلوب میں ہے (یعنی ہندوستان کی زبان میں ہے لیکن اس کی لے کا تعلق تو حجاز سے ہے یعنی یہ اسلامی ہے اور اسلامی روح بیدار کرنے کے کام آتی ہے۔

چاند

(۱۷)

حلِ لغات طوف: طواف کرنا، کسی کے گرد چکر کاٹنا؛ حریمِ خاکی: مراد ہے زمین، غوغا: شور، ہنگامہ؛ استادہ: کھڑا ہونا؛ آرسی: شیشے کا ایک زیور جو دلہن کے انگوٹھے میں پہنایا جاتا تھا اور جس سے آئینے کا کام لیا جاتا تھا۔ یہاں شبنم کے قطروں کو آرسی کہا گیا ہے؛ کہسار: پہاڑ؛

۱ اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے — — —

وضاحت علامہ اقبال چاند کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے چاند تیرا حسن مناظرِ فطرت کی عزت بڑھاتا اور وقار قائم کرتا ہے۔ جبکہ زمین کے گرد چکر کاٹنا تیری پرانی عادت ہے (ترے سینے میں جو داغ نظر آتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید تو کسی کے عشق میں مبتلا ہے اور یہ داغ آرزو اور عشق کا داغ ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو میں اور تو ایک ہی کیفیت کے حامل ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ میں زمین پر تڑپ رہا ہوں اور تو آسمان پر بے چین ہے۔ تجھے بھی کسی کی تلاش ہے اور میں بھی کسی کو پا لینا چاہتا ہوں۔

جس بزم میں انسان شمع کی حیثیت رکھتا ہے وہی تیری بھی بزم ہے اور شاید جس طرف میں جا رہا ہوں وہی تیری بھی منزل ہے یعنی ہم دونوں ایک ہی طرف رواں دواں ہیں۔

ے تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں ـــ ـــ ـــ

وضاحت اے چاند جس چیز کو تُو ستاروں کی خاموشی میں تلاش کر رہا ہے وہ چیز شاید زندگی کے شور اور ہنگامے میں چھُپی ہوئی ہے۔ کہیں یہ سرو کے درخت میں موجود ہے اور کہیں یہ حسُن سبزے میں محوِ خواب ہے۔ یہی حسن بلبل میں نغمے کی شکل میں جلوہ گر ہے اور کلی میں خاموش بن کر چھُپا ہوا ہے۔

آئیں تجھے اِس کا جلوہ دکھاؤں۔ یہ جلوہ ندیوں کے پانی میں بھی موجود ہے اور شبنم کے قطروں میں بھی، صرف یہی نہیں بلکہ صحراؤں اور پہاڑوں میں بھی جلوہ فگن ہے اور انسان کے دل اور تیرے چہرے میں بھی نظر آتا ہے۔

رات اور شاعر

(۱۸۲)

تعارف نظرِ ثانی میں اِس نظم کے دوسرے بند کا ایک شعر قلمزد کیا گیا جو روزگارِ فقیر میں دیا گیا ہے۔

حلِ لُغات رفعت: بلندی، گرداب: بھنور، ہنگامہ آفریں: ہنگامے پیدا کرنے والی، فسوں: جادو، عزلت: تنہائی، برقِ ایمن: مراد ہے کوہِ طور پر چمکنے والا نور جو حضرتِ موسیٰؑ کو نظر آیا تھا، لحد: قبر، راس: سازگار، تابندہ: روشن،

ے کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں ـــ ـــ ـــ

وضاحت یہ نظم رات اور شاعر میں ایک مکالمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلے بند میں رات شاعر کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ اے شاعر تُو میری چاندنی میں پریشان اور گھبرایا ہوا کیوں پھر رہا ہے؟ تیری حالت بالکل پھول اور پھول کی خوشبو جیسی ہے۔ یعنی تو پھول کی طرح خاموش ہے اور خوشبو کی طرح آوارہ و پریشان حال۔

رات ستاروں کو موتی قرار دیتے ہوئے کہتی ہے کہ شاید تو ان کو پرکھنے والا جوہری ہے ۔ یا تو میرے نور کے دریا میں تیرنے والی مچھلی کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یا پھر یہ ہے کہ تو میرے ماتھے پر چمکنے والے ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے جو آسمان کی بلندیوں سے نیچے گر گیا ہو اور جس نے بلندیوں کو چھوڑ کر زمین کی پستی میں اپنا ٹھکانہ بنالیا ہے ۔

میرے آنے کے بعد زندگی کا ایک ایک ساز خاموش ہو گیا ہے اور میرے آئینے میں سوتی ہوئی دنیا کی تصویر نظر آرہی ہے ۔ زندگی کے عام مظاہر کا تو کیا ذکر بھنور بھی کہیں دریا کی تہہ میں سو گیا ہے اور دریا کی بیتاب موجیں بھی جیسے ساحل کے آس پاس سو چکی ہیں ۔ یعنی دریا تک کا اضطراب ختم ہو گیا ہے ۔ عام حالات میں زمین کی زندگی میں کتنے ہنگامے پیدا ہوتے ہیں لیکن رات کے وقت یوں لگتا ہے جیسے زمین بھی بالکل بے آباد اور ویران ہو گئی ہے ۔ لیکن اس کیفیت میں بھی صرف تجھ شاعر کا دل ہے جسے سکون و آرام نہیں مل سکا ۔ میں حیران ہوں کہ تو میرے جادو سے کس طرح آزاد رہ گیا ۔

بیں تیرے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت

دوسرے بند میں شاعر رات کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے رات میں تیرے چاند کی کھیتی یعنی چاندنی میں اپنے آنسوؤں کے موتی کاشت کرتا ہوں اور صبح کی طرح لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر رویا کرتا ہوں ۔ جو آنسو دن کے ہنگامے میں بہتے ہوئے کچھ شرم محسوس کرتے ہیں وہ رات کی تنہائی میں بے محابا ٹپکنے لگتے ہیں ۔ میرے سینے میں جو آہیں چھپی ہوئی ہیں وہ کس کو دکھاؤں اور میرے دل میں عشق کی جو حرارت موجود ہے وہ کس پر ظاہر کروں یعنی یہاں پر کوئی میری حالت پر توجہ دینے والا نہیں ہے ۔

میری کیفیت یہ ہے کہ میرے سینے میں کوہ طور کی بجلی جس نے حضرت موسیٰؑ تک کی رہنمائی کی تھی ، بیکار پڑی سو رہی ہے ۔ اس بجلی کو دیکھنے اور اس سے متمتع ہونے والی آنکھ نجانے کہاں پڑی سو رہی ہے اور کیوں اس طرف توجہ نہیں کرتی ۔ میری محفل اُس شمع کی محفل کی طرح اجاڑ اور ویران ہے جو کسی مزار پر جل رہی ہو ۔ اس طرح دیکھا جائے تو میری منزل مجھ سے بہت دور ہے ۔ اس محفل یعنی میری قوم کے لئے موجودہ زمانے کے طور طریقے سازگار نہیں ہیں اور زیادہ مُصیبت خیز بات یہ ہے کہ اس کو اپنے نقصان کا احساس تک نہیں ۔

اے رات جب میں محبت کے پیغام کو ضبط کرتے کرتے گھبرانے لگتا ہوں تو وہ پیغام

تیرے روشن اور چمکدار ستاروں کو سنانے کے لئے آجاتا ہوں۔ گویا اس طرح میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

بزمِ انجم

(۱۷۳)

تعارف روزگارِ فقیر کے مطابق پہلے اس نظم کا عنوان "تاروں کا گیت" تھا۔ نظرِ ثانی میں عنوان بھی تبدیل کر دیا گیا اور پہلے اور دوسرے بند سے سات شعر بھی قلمزد کر دیئے گئے۔ یہ شعر روزگارِ فقیر اور باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔

حلِ لغات قبا: لباس ۔ **طشت**: پلیٹ ۔ **عروس**: دلہن ۔ **فلک فروزی**: آسمان کی سجاوٹ اور آرائش ۔ **ملک**: فرشتہ ۔ **پاسبان**: محافظ ۔ **تابندہ**: روشن ۔ **گردوں**: آسمان ۔ **سرود**: نغمہ ۔ **دلبری**: حسن، محبوبیت ۔ **آرسی**: ایک زیور جو دلہن کو پہنایا جاتا تھا اور جس سے آئینے کا کام بھی لیا جاتا تھا ۔ **آئین**: قاعدہ، دستور ۔ **طرزِ کہن**: پرانا اور قدیم انداز ۔ **کٹھن**: دشوار ۔ **تیز گام**: تیز چلنے والا ۔ **رواروی**: مسلسل تیز رفتاری کے ساتھ چلنے کی کیفیت، چلچلاؤ ۔ **جذبِ باہمی**: ایک دوسرے کی محبت اور کشش ۔

۱ سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو ـــ ـــ ـــ

وضاحت اِس بند میں ایک منظر بیان کیا گیا ہے۔ یہ منظر شام کے وقت کا ہے۔ سورج ڈوب رہا ہے اور ہر سمت تھوڑی تھوڑی تاریکی پھیل رہی ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سورج کی شعاعوں کے انعکاس کی وجہ سے سُرخی مائل نظر آ رہے تھے۔ علامہ اقبال اِس منظر کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سورج نے غروب ہوتے ہوئے افق کے طشت سے لالے کے پھول چنے اور وہ پھول سیاہ لباس پہننے والی شام کو مارے۔ دن کے وقت قدرت کی ہر چیز سفید نظر آتی تھی لیکن اب یوں لگتا ہے کہ

قدرت نے چاندی کا جو زیور پہن رکھا تھا، وہ اتار دیا ہے اور شفق نے ہر چیز کو سونے کے زیورات پہنا دیئے ہیں یعنی ہر چیز سنہری نظر آنے لگی ہے۔ تاریکی کی محبوبہ خاموشی کے کجاوے میں سوار ہو کر آئی اور رات کی دلہن کے تمام موتی چمکنے لگے۔ یہ موتی وہ ہیں جو دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور آسمان پر رہتے ہیں اور جنھیں انسان ستارے کہتا ہے۔

آسمان کی ساری محفل اپنی آرائش اور سجاوٹ میں مصروف تھی کہ ایسے میں عرش سے ایک فرشتے کی آواز سنائی دی۔

؎ اے شب کے پاسبانو! اے آسمان کے تارو ۔ ۔ ۔

وضاحت

فرشتے نے کہا کہ اے رات کے محافظ آسمان کے تارو! تمھاری ساری روشن اور چمکدار قوم آسمان کی بلندیوں پر رہنے والی ہے۔ تم کوئی ایسا نغمہ گاؤ جس کی آواز سے تمام سونے والے بیدار ہو جائیں۔ راستہ چلنے والے قافلوں کے لئے تمہارے ماتھے کی روشنی رہنما کا کام کرتی ہے۔ یہ لوگ تمھیں اپنی قسمتوں کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ یعنی تمھاری چال اور کیفیت سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے میں توقع کی جاسکتی ہے کہ شاید یہ لوگ تمھاری آواز اور نصیحت پر توجہ کریں۔ فرشتے کی یہ آواز سن کر ستاروں کی فضا سے خاموشی ختم ہوگئی اور آسمان کی وسعت اس آواز سے بھر گئی (جو اگلے بند میں موجود ہے) یعنی ستاروں نے اپنا نغمہ شروع کر دیا۔ نغمے کا موضوع و مضمون ذیل کے بند میں پیش کیا گیا ہے۔

؎ حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں ۔ ۔ ۔

وضاحت

ستارے کہتے ہیں کہ ہماری خوبصورتی سے حسنِ ازل ظاہر ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی شبنم کے صاف و شفاف قطروں میں پھولوں کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں وہ مقام بہت سخت اور دشوار ہوتا ہے جب انھیں نئی چیزیں اور نئے قاعدے قبول کرنا پڑیں اور پرانے رسم و رواج کو چھوڑنا پڑے۔ دراصل نئے دستور سے خوف کھانا اور پرانی روایات پر جمے رہنا انسانی فطرت ہے جبکہ زندگی کا قافلہ اس قدر تیز رفتار ہے کہ اس کے چلبلاؤ میں بے شمار قومیں کچلی گئیں اور فنا ہو کر اپنے انجام کو پہنچیں۔

آسمان کی عمیق وسعتوں میں بیشمار ستارے ہماری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان سب ستاروں کو اپنی قوم کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ ہمیں زندگی گزارنے کے لئے تھوڑا سا وقت ملا یعنی صرف ایک رات یا اس سے بھی کم۔ لیکن اس بہت اہم اصولِ زندگی کو

ہم اِس تھوڑی سی عمر میں سمجھ گئے جبکہ انسان ایک طویل عمر گذارنے کے باوجود اِس حقیقت تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ اصول اور حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ زندگی کے سارے نظام صرف ایک دوسرے کی محبت اور کشش کی وجہ سے قائم ہیں اور یہ اہم بات ستاروں کی زندگی سے عیاں ہوتی ہے۔ یعنی تمام ستارے صرف اس وقت تک قائم ہیں جب تک کشش ثقل کے اصول کی بناء پر وہ ایکدوسرے کو کھینچ رہے ہیں۔ اگر ذرا دیر کے لیے ستارے اِس کشش سے آزاد ہو جائیں تو پوری کائنات آنِ واحد میں ختم ہو جائے۔ یہی اصول انسان کو بھی اپنانا چاہیئے۔

سیرِ فلک

(۱۷۵)

تعارف

اِس نظم کے بارے میں نسیم امروہوی فرہنگ اقبال میں لکھتے ہیں۔

" یہ ایک ایلی گوریکل نظم ہے جس میں علامہ اقبال نے سورۃ توبہ کی چونتیسویں آیت کی اپنے لفظوں میں تفسیر کی ہے۔ اِس آیت میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے سونا چاندی جمع کیا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کی، قیامت کے دن ان کی پیشانی، پہلو اور پشت کو اُسی (گرم کئے ہوئے) سونے چاندی سے داغا جائے گا ...... اقبال نے اِس بات کو اِس طرح کہا ہے کہ دوزخ بجائے خود گرم نہیں بلکہ جب گنہگار اپنی بداعمالیوں کے ساتھ وہاں پہنچتے ہیں تو وہ بداعمالیاں ہی شعلہ اور انگارہ بنکر انہیں جلاتی ہیں۔"

اِس نظم کے دوسرے بند کے دو شعر نظرثانی میں قلمزد کر دیئے گئے جو روزگارِ فقیر میں درج ہیں۔

حلِ لغات

چرخ: آسمان۔ **رازِ سربستہ**: چھپا ہوا راز۔ **ساقیانِ جمیل**: شراب پلانے والے خوبصورت لوگ یعنی حور و غلمان۔ **شورِ نوشانوش**: پینے پلانے کا ہنگامہ۔ **طالع**۔ قسمت، نصیب۔ **کرۂ زمہریر**: زمین کے گرد وہ حصّہ جو بہت زیادہ سرد ہوتا ہے۔ **سروش**: فرشتہ۔ **مستعار**: ادھار مانگی ہوئی چیز۔

ے تھا تخیل جو ہم سفر میرا ۔۔۔۔۔۔

وضاحت میں اپنے تخیل کی ہمراہی میں آسمان کی سیر کر رہا تھا اور میں آسمان کی وسعتوں میں اڑتا پھر رہا تھا لیکن وہاں پر کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو مجھے جانتا ہو میرا سفر اِس حد تک راز کی حیثیت رکھتا تھا کہ ستارے بھی مجھے انتہائی حیرت کے عالم میں دیکھ رہے تھے ۔ میں اِس سفر میں زمان و مکان اور صبح و شام کے دائرے سے نکل گیا اور کائنات کے اِس پرانے نظام کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ۔

ے کیا سناؤں تمھیں ارم کیا ہے ۔۔۔۔

وضاحت اِس سفر میں مَیں نے جنت دیکھی ۔ تمھیں کیا بتاؤں کہ جنت کیا ہے بس یہ سمجھ لیں کہ اس کو دیکھنے سے کانوں اور آنکھوں کی تمام تمنائیں پوری ہو جاتی ہیں ۔ یعنی جنت میں تمام خواہشوں کے پورے ہونے کا سامان موجود ہے ۔ طوبیٰ کی شاخ پر بیٹھے ہوئے پرندے نغمے گا رہے ہیں ۔ حوریں کسی پردے کے بغیر اپنے جلوے دکھا رہی ہیں ۔ بہت ہی خوبصورت لوگ شراب پلانے میں مصروف ہیں اور جو پینے والے ہیں اُن میں پینے پلانے کا شور و ہنگامہ ہو رہا ہے ۔

میں نے جنت سے دور ایک جگہ دیکھی جو بہت زیادہ تاریک بھی تھی اور سرد و خاموش بھی ۔ اِس کی تاریکی مجنوں کی قسمت اور لیلیٰ کی زلفوں کے برابر تھی ۔ یہ مقام اس قدر سرد تھا کہ اِس کے سامنے زمین کے گرد موجود انتہائی سرد حلقہ بھی ماند تھا ۔ میں نے اس مقام کے بارے میں ایک فرشتے سے پوچھا تو اس کا جواب انتہائی حیران کن تھا ۔ اُس نے کہا کہ یہ جہنم ہے اور یہ ہر طرح کی گرمی اور روشنی سے خالی ہے ۔ اِس کے وہ شعلے جن سے عبرت حاصل کرنے والے لوگ خوفزدہ ہیں ، دراصل مانگے ہوئے ہوتے ہیں ۔ جہنم میں پہلے سے کوئی گرمی نہیں ہے البتہ جو گنہگار یہاں لائے جاتے ہیں وہ اپنے حقے کی آگ اور شعلے بھی اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں ۔

نصیحت

(۱۷۶)

تعارف علامہ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ اپریل ۱۹۱۱ء میں نظم شکوہ سے پہلے پڑھی تھی۔ بعد ازاں مخزن مئی ۱۹۱۱ء میں شیخ عبدالقادر کے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ نظر ثانی میں نہ صرف اس کا عنوان بدل دیا گیا بلکہ اس کے ایک مصرع میں بھی ترمیم کی گئی اور تین شعر بھی قلمزد کر دیئے گئے۔ یہ شعر باقیاتِ اقبال اور سرودِ رفتہ میں دیئے گئے ہیں۔ بانگِ درا میں شمولیت کے وقت علامہ اقبال نے ترتیب کے اعتبار سے بھی نظم "نصیحت" کو نظم "شکوہ" سے بعد لکھا جبکہ سرودِ رفتہ میں اس کے متروک اشعار "شکوہ" نظم سے پہلے دیئے گئے ہیں۔

حل لغات شیوہ: طریقہ۔ ریا: منافقت، ظاہرداری۔ تملق: خوشامد۔ اعجاز: معجزہ۔ مدحت: تعریف و توصیف۔ آئین نیاز: عجز و انکساری کا دستور۔ ہوس جاہ: اقتدار کا لالچ

میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا

وضاحت ایک دن میں نے بطور نصیحت اقبال سے کہا کہ نہ تم روزہ رکھتے ہو اور نہ ہی نماز کے پابند ہو۔ تم ریاکاری اور منافقت کی طرز میں انتہائی پختہ ہو، یعنی ریاکاری اور منافقت کر سکتے ہو۔ منافقوں کی طرح تم ذکر تو عرب اور مکہ معظمہ کا کرتے رہتے ہو لیکن تمہارے دل میں یہ خواہش چھپی رہتی ہے کہ لندن جایا جائے۔ تم جھوٹ بولتے ہو تو اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ یعنی اپنے فائدے کے لئے جھوٹ بھی بول لیتے ہو اور تمہاری خوشامد کا انداز بھی معجزے دکھاتا اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ تم گفتگو کرتے ہو تو حکومتِ وقت کی تعریف و توصیف میں لگے رہتے ہو اور تمہارے تازہ اور روشن خیالات عاجزی اور انکساری کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ تمہارے لیے حکومت کرنے والے کا دروازہ مقامِ محمود کی حیثیت رکھتا ہے اور تم ایاز کی زلف جیسی پالیسی بنانے میں

بھی کمال رکھتے ہو۔ مقام محمود میں ایاز کی رعایت بھی پیشِ نظر ہے اور اس سے وہ پسندیدہ مقام بھی مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں کو ان کی پسند کے مطابق عطا کرے گا۔

اے اقبال دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح شان و شوکت اور عزت و توقیر حاصل کرنے کے بھید اور خواہش کو تُو بھی دین کی خدمت کرنے کے پردے میں چھپا سکتا ہے۔ تُو کبھی کبھار عید کے دن مسجد میں بھی چلا جاتا ہے اور واعظ کی تقریر سے تیرا دل پگھلنے لگتا ہے۔ ملک کے اخبارات بھی تیرے اپنے ہاتھ کے پالے ہوتے ہیں یعنی تیرے ممنونِ احسان ہیں۔ لہٰذا انھوں نے تیرے تشہیر کے لیے اپنے صفحات میں وقتاً فوقتاً تیرا ذکر اپنا فرض سمجھ رکھا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تُو شاعر بھی ہے اور تیری شاعری کی صراحی میں شیراز کی شراب موجود ہے۔

غرض ہندوستان کے بڑے لیڈروں کی جو صفات ہونا چاہئیں وہ ساری کی ساری تم میں موجود ہیں۔ اس لیے تجھے چاہیئے کہ اپنی لیڈری چمکانے کے لئے کوشش اور جدوجہد کرے ایک تو تجھے کسی شکاری کا خوف نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اڑنے اور بچ نکلنے کے وسائل بھی تیری قدرت میں ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تو لیڈر بننے کی کوشش نہیں کرتا۔

اِس نظم کا آخری شعر خواجہ حافظ شیرازی کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخرکار سب کو مرنا ہے اور مر کر خاموش یعنی مردہ لوگوں کی وادی میں پہنچنا ہے۔ لہٰذا اِس آسمان کے گنبد کے نیچے کچھ تو ہنگامہ کرنا چاہیئے۔

درحقیقت یہ نظم ملک کے لیڈروں پر طنز کی حیثیت رکھتی ہے اور اِس میں سیاسی لیڈروں کے تمام ہتھکنڈے بتائے گئے ہیں۔

رام

(۱۷۷)

حلِ لغات

رام: ہندوؤں کا ایک دیوتا اور دیومالائی کردار۔ یہ ہندوستان کے موجودہ صوبجات متحدہ کی ایک ہندو ریاست کا ولی عہد تھا۔ اِس

کی سوتیلی ماں نے راجہ دسرتھ سے چودہ سال کے لئے رام کو گھر سے نکال دینے اور جنگلوں میں رکھنے کا وعدہ لیا جس کی وجہ سے رام اپنی بیوی سیتا اور اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ گھر سے نکل گیا چودہ سال تک اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد اجودھیا کی ریاست میں واپس آیا تو راجہ دسرتھ کا انتقال ہو چکا تھا۔ لوگوں نے رام کے آنے کی بہت خوشی منائی اور اسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ ہندو اسی موقع کی مناسبت سے دسہرہ مناتے ہیں۔ رام کے حالات ہندوؤں کی مقدس کتاب راماٸن میں درج ہیں۔ **فلک رس**: آسمان تک پہنچنے والا۔ **رفعت**: بلندی۔ **بام**: چھت۔ **ملک**: فرشتہ۔ **اعجاز**: معجزہ۔ **دھنی**: شوقین، ماہر۔ **فرد**: یکتا، بے مثال۔

ہے لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند ۔ ۔ ۔

وضاحت ہندوستان کا پیالہ حقیقت کی شراب سے بھرا ہوا ہے۔ مغرب کے سب فلسفی ہندوستان کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ہندوستانیوں کے آسمان تک پرواز کرنے والے تخیل کا کمال ہے کہ ہندوستان کی چھت بلندی کے اعتبار سے آسمان سے بھی اونچی ہے۔ اِس ملک میں ایک دو نہیں ہزاروں لوگ فرشتوں جیسی خصلت لے کر پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ہندوستان کا نام پوری دنیا میں مشہور ہوا۔ رام پر سارے ہندوستان کو فخر ہے۔ دیکھنے والے لوگ رام کو ہندوستان کا امام قرار دیتے ہیں۔ ہدایت دینے والے اِسی چراغ کی وجہ سے ہندوستان کی شام بھی صبح سے زیادہ روشن ہے۔

رام تلوار چلانے کا ماہر اور بہادری میں یکتا و بے مثال تھا۔ پاک بازی اور محبت کرنے میں بھی کوئی اُس جیسا نہیں ہوا۔

موٹر

(۱۲۸)

تعارف علامہ اقبال کے ایک دوست نواب ذوالفقار علی خاں نے ایک TALBOT

کار خریدی ۔ یہ کار دوسری گاڑیوں کی نسبت بہت کم شور کرتی تھی ۔ علامہ اقبال نے کار کی اس خوبی کی تعریف کی اور اس پر یہ نظم کہی ۔ یہ گاڑی ۱۹۱۱ء میں خریدی گئی ۔

حلِ لغات ہنگامہ آفریں : ہنگامے پیدا کرنے والا ۔ جادہ : راستہ ۔ تیز پا : تیز چلنے والا ۔ پا شکستہ : جس کے پاؤں ٹوٹ چکے ہوں ۔ جرس : گھنٹی ۔ شورش قلقل : صراحی یا اس جیسے کسی دوسرے برتن سے پانی انڈیلتے ہوئے جو آواز آتی ہے اُس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت کل جگندر نے کتنی کام کی بات کہی کہ ذوالفقار علی خان کی کار کتنی خاموش ہے، اس کی چال بہت سے ہنگامے پیدا کرنے والی ہے ۔ یہ کار بجلی اور ہوا کی طرح خاموش ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ جگندر کی زبان سے کار کی یہ تعریف سُن کر میں نے کہا کہ یہ صرف اِس موٹر کار پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ زندگی کے راستے میں تیزی سے سفر کرنے والی ہر چیز خاموش ہے ۔ فریاد کی عادت نے گھنٹی کے پاؤں توڑ دیئے ہیں یعنی وہ چونکہ شور مچاتی ہے اس لیے نہیں چل سکتی جبکہ خوشبو کا قافلہ صبا کی طرح بالکل خاموشی سے اپنا سفر طے کرتا ہے ۔ صراحی ہمیشہ شراب انڈیلے جانے کے شور کی قیدی اور پابند ہے اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتی جبکہ پیالہ جو ساری محفل میں گھومتا ہے، خاموش ہے ۔

شاعر کے تخیل کی اڑان کو بھی خاموشی پر پرواز مہیا کرتی ہے اور خاموشی ہی کی وجہ سے شاعر کے کلام میں تاثیر اور جوش پیدا ہوتا ہے ۔

انسان

(۱۷۹)

حلِ لغات زیبا : مناسب، موزوں، حسین ۔ تسلیم : ماننا، قبول کرنا، اطاعت ۔ خوگر : عادی ۔ ہیئت : شکل و صورت

۵ منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا ۔۔۔

وضاحت علامہ اقبال دیگر مظاہرِ فطرت کا انسان سے تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواہ گلستان کے منظر مناسب و موزوں اور حسین و خوبصورت ہوں یا نہ ہوں، باغ میں خواہ بہار آئی ہو یا خزاں چھائی ہو، نرگس اپنی بے عملی کی وجہ سے ان مناظر کو دیکھنے اور برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ ان مناظر میں اپنی خواہش کے مطابق کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتی۔ اسی طرح صنوبر جیسے بلند قامت درخت کی فطرت چونکہ آرزوؤں اور خواہشوں سے محروم ہے لہٰذا یہ درخت اپنی جگہ پر ساکت و صامت کھڑا رہتا ہے۔ دراصل آرزو اور تمنا نہ ہونے کی بنا پر اسے چلنے اور متحرک رہنے کے لطف کا احساس نہیں ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی ہر چیز اطاعت کرنے اور دوسروں کا حکم ماننے کی عادی ہے۔ البتہ انسان ہمہ وقت جدوجہد اور کوشش و کاوش میں لگا رہتا ہے۔ اگر انسان کو ایک ذرہ قرار دیا جائے تو یہ ایک ایسا ذرہ ہے جو ہمہ وقت وسیع سے وسیع تر ہونے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید یہ ذرہ نہیں ہے بلکہ کوئی صحرا ہے جو سمٹ گیا تھا اور اب پھیلنا اور وسعت اختیار کرنا چاہتا ہے۔

انسان اِس قدر قوی اور طاقت ور ہے کہ اگر چاہے تو پورے گلستان کی شکل و صورت بدل ڈالے اور اِسے اپنی پسند و ناپسند کے مطابق ڈھال لے۔ ایسا اِس لئے ہے کہ انسان عقل و شعور بھی رکھتا ہے اور اچھے بُرے میں تمیز بھی کرسکتا ہے۔ اِس کے علاوہ اس کے پاس اپنے ماحول میں اپنی پسند و ناپسند کے مطابق تبدیلی لانے اور انقلاب پیدا کرنے کی قوت اور صلاحیت بھی ہے۔

خطاب بہ جوانانِ اسلام

(۱۸۰)

حلِ لغات تدبیر: غور و فکر کرنا، سوچنا؛ گردوں: آسمان؛

آغوش: گود ۔ **دارا:** ایران کا ایک مشہور بادشاہ ۔ **تمدن:** طرزِ معاشرت و رہن سہن ۔ **خلاق:** خالق کی جمع یعنی پیدا کرنے والے ۔ **گہوارا:** جھولا ۔ **الفقرُ فخری:** آنحضرتؐ سے منسوب ایک حدیث جس کے معنی ہیں کہ میرا فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے ۔ یہ حدیث ذرا مختلف الفاظ میں بھی ملتی ہے لیکن مفہوم یہی ہے ۔ **امارت:** دولت مندی، حکومت، **غیور:** غیرت مند ۔ **منعم:** دولت مند ۔ **گدا:** فقیر ۔ **یارا:** ہمت ۔ **ثابت:** آسمان کے وہ تمام ستارے جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے مثلاً قطب ستارہ وغیرہ ۔ **سیارا:** آسمان کے وہ تمام روشن اجسام جو گردش کرتے ہیں مثلاً چاند، مریخ، مشتری وغیرہ ۔ **اسلاف:** بزرگ ۔ **ثریا:** چھ چھوٹے چھوٹے ستاروں کا جھرمٹ جو آسمان پر بہت بلند نظر آتا ہے ۔ **آئین مسلم:** تسلیم شدہ قانون اور دستور ۔ **سیپارا:** ٹکڑے ٹکڑے ۔ (سی : تیس پارہ : ٹکڑا)

؎ کبھی اے نوجواں مُسلم تدبر بھی کیا تُو نے ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال مسلمان نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ کیا کبھی تو نے غور کیا ہے کہ وہ کیسا عظیم الشان آسمان تھا تُو جس کے ایک ٹُوٹے ہوئے ستارے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یعنی کیا تجھے معلوم ہے کہ تُو کتنی عظیم قوم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اگر تجھے یاد نہیں تو میں بتا دیتا ہوں کہ تجھے اُس قوم نے اپنی محبت کی گود میں پالا ہے ۔ جس نے ایران کے مشہور ساسانی خاندان کے بادشاہ دارا کا تاج اپنے پاؤں سے کچل ڈالا تھا ۔ یعنی اتنی بڑی سلطنت ختم کر دی تھی اے مسلمان نوجوان تُو جس قوم کا فرد ہے وہ صحرائے عرب سے تعلق رکھتی ہے ۔ وہ صحرائے عرب جیسے اونٹ پالنے والوں کی پرورش کرتا ہے ۔ اس قوم نے دنیا کو نئی تہذیب اور رہن سہن کا نیا انداز عطا کیا اور حکمرانی کے قاعدے اور دستور سکھائے ۔ اس کے باوجود وہاں کے لوگوں نے امیری، بادشاہت اور روپے پیسے کی فراوانی کے دنوں میں بھی فقیری کو اپنا طرۂ امتیاز بنائے رکھا ۔ اور ایسا اس لئے تھا کہ ان کے نزدیک دلکش اور خوبصورت چہرے کی آرائش اور سجاوٹ کے لیے ظاہری سروسامان غیر ضروری تھا (اِس شعر کا دوسرا مصرع خواجہ حافظ شیرازی کا ہے) اقبال کہتے ہیں کہ اس قوم کے افراد اپنی فقیری کے دوران میں بھی اِس قدر غیرت مند تھے کہ امیر آدمیوں کو یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان فقرا کو خیرات کے طور پر کچھ دینے کی جرأت کر سکیں ۔ یعنی یہ لوگ کچھ قبول نہیں کرتے تھے ۔

الغرض میں اِس قوم کے صحرانشیں اور سادہ لوگوں کی کیا کیا خوبیاں بیان کروں ۔ بس یہ

سمجھ لیں کہ وہ ساری دنیا کے فاتح تھے۔ ساری دنیا کے حکمران تھے، ساری دنیا کے محافظ تھے اور ساری دنیا کو سجانے والے تھے۔ اگر میں چاہوں تو ان لوگوں کی زندگی کا نقشہ اپنے الفاظ اور شاعری کے ذریعے پیش کر دوں لیکن مشکل یہ ہے کہ تو اُن حالات اور ان لوگوں کا تصور تک کرنے سے قاصر ہے۔ اگر تمہارے آباء واجداد اور تمہارا تقابل کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے تم میں اور اُن میں کوئی تعلق اور مشترک خصوصیت ہی موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ تو محض باتیں بناتا ہے جبکہ ان کی ساری توجہ عمل اور کردار پر تھی۔ تو ایک جگہ مقیم ہے یعنی بے عمل اور محض مقلد ہے لیکن وہ اجتہادِ فکر کے عادی لوگ انتہائی باعمل اور ہمیشہ متحرک رہنے والے تھے۔

اگر آج ہم اپنے زوال کے اسباب پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ آخر گردشِ فلک نے ہمیں آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر زمین کی پستیوں میں کیوں پھینک دیا ہے تو اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں جو ورثہ دیا تھا ہم نے وہ کھو دیا۔ حکومت کے چلے جانے کا تو کوئی افسوس نہیں اس لئے کہ یہ ہمیشہ عارضی اور وقتی ہوتی ہے اور دنیا کا تسلیم شدہ قاعدہ یہ ہے کہ حکومت کبھی کسی ایک قوم کے پاس نہیں رہتی اور دنیا کے اِس دستور کا کوئی علاج نہیں ہے لیکن ہم نے اپنے بزرگوں کی کتابیں بھی ضائع کر دیں جس کی وجہ سے علم کی روایت بھی ہم سے چھن گئی۔ اپنے بزرگوں کی ان کتابوں کو جب یورپ کے کتب خانوں میں دیکھتے ہیں تو غم و افسوس سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

آخری شعر مشہور فارسی گو شاعر غنی کاشمیری کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے غنی، پیرِ کنعاں یعنی حضرت یعقوبؑ کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ اُن کی آنکھوں کے نور یعنی حضرتِ یوسفؑ نے زلیخا کی آنکھیں روشن کر رکھی تھیں۔ یعنی حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے بہت ہی پیارے بیٹے تھے لیکن وہ زلیخا کو مل گئے اور حضرت یعقوبؑ اُن سے محروم ہو گئے۔ گویا یہ کتابیں مسلمانوں کی تھیں اور انھیں کے پاس ہونا چاہئیں تھیں لیکن ان سے اہلِ یورپ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

غرۂ شوال یا ہلال عید

(۱۸۱)

تعارف یہ نظم اکتوبر ۱۹۱۱ء میں روزنامہ "زمیندار" لاہور کے عید ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی۔ نظر ثانی میں اس نظم کے ایک شعر میں ترمیم کی گئی جبکہ تین شعر حذف کر دیئے گئے۔ یہ اشعار سرودِ رفتہ اور باقیات اقبال میں درج ہیں۔

حل لغات **غرۂ شوال**: ہلال عید، عید کا چاند، خوشی، مسرت، شادمانی۔ **تمہید**: آغاز، ابتداء۔ **ملتِ بیضا**: ملت اسلامیہ مراد ہے۔ اسے ملتِ بیضا اس لیے کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن باقی تمام لوگوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے اعضاء مثلاً ہاتھ اور چہرہ وغیرہ پانچ وقت وضو کرنے کے باعث سفید اور روشن نظر آئیں گے۔ **دیرینہ**: پرانی۔ **علم**: جھنڈا۔ **قبا**: لباس۔ **رایت**: علم، جھنڈا۔ **آشنا پرور**: واقف کاروں کو پالنے والی۔ **پیراہنِ سیمیں**: چاندی جیسا لباس۔ **اوج**: بلندی۔ **گردوں**: آسمان۔ **رہروِ درماندہ**: تھکا ہارا اور پیچھے رہ جانے والا مسافر۔ **رشتہ**: دھاگا۔ **زنار**: ایک دھاگا جو ہندو اپنے گلے میں ڈالتے ہیں۔ **مسلم آزاری**: مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی روش۔ **تملق پیشگی**: خوشامد کرنے کا انداز۔ **حریف**: دشمن۔ **امروز**: زمانہ حال۔ **دوش**: گذری ہوئی کل، ماضی۔

۱ غرۂ شوال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار — — —

وضاحت علامہ اقبال عید کے چاند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے چاند! اے روزہ رکھنے والوں کی آنکھ کے نور تو آ جا کہ مسلمان تیرے لیے سراپا انتظار بنے ہوئے تھے یعنی بہت شدت سے تیرا انتظار کر رہے تھے۔ تیرے ماتھے پر ان کے لئے مسرت و شادمانی کا پیغام لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ تو شام کے وقت طلوع ہوا ہے لیکن یہ شام نہیں ہے بلکہ عیش و مسرت کی صبح کے آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اے عید کے چاند! تو ملتِ اسلامیہ کی سرگذشت اور عروج و زوال کی داستان کے آئینے کی حیثیت

دکھتا ہے اور اے نئے چاند ہمیں تیرے ساتھ بہت پرانی محبت ہے۔ ہم مسلمان جس جھنڈے کے زیر سایہ جنگ لڑتے تھے اور دشمنوں کے خون سے اپنے لباسوں کو رنگین کر لیا کرتے تھے۔ تو اسی جھنڈے سے ہم آغوش ہے۔ (یعنی مسلمانوں کے جھنڈے پر چاند کی تصویر بنی ہوتی تھی) اور یہی سبب ہے کہ تیرے مسلسل بڑھتے ہوئے حسن سے مسلمانوں کی عظمت وعزت وابستہ ہے۔ ہماری قوم اپنے واقف کاروں اور شناساؤں کی پرورش کرتی ہے۔ یعنی انہیں بھولتی نہیں۔ اِس طرح تو بھی وفا کے دستور کو نبھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیرا چاندی سے بنا ہوا لباس دلوں میں محبت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

اے چاند! تو آسمان کی بلندیوں سے ذرا دنیا کی آبادی کا نظارہ کرے اور اپنی بلندی سے مسلمانوں کی پست حالی کا مشاہدہ کر۔

قافلے دیکھ، اور اُن کی برق رفتاری بھی دیکھ ---

وضاحت اے چاند تو اپنی بلندیوں سے مختلف اقوام کے قافلے دیکھ اور یہ بھی دیکھ کہ کس تیز رفتاری کے ساتھ اپنی اپنی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کے کے مقابلے میں ایک تھکے ہوئے اور پیچھے رہ جانے والے مسافر (یعنی مسلمان قوم) کی منزل سے بیزاری اور اکتاہٹ بھی دیکھ۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب تو طلوع ہوتا تھا تو مسلمان تجھے دیکھ کر موتی لٹایا کرتے تھے۔ لیکن اے خالی پیالے سے مشابہ چاند! آج تو ہماری غربت، ناداری اور مفلسی کا تماشا بھی دیکھ۔ شاعر نے نئے چاند کو خالی پیالے سے تشبیہہ دی ہے جو بہت خوبصورت ہے ناداری کے ساتھ اِس تشبیہ نے لطف کو مزید بڑھا دیا ہے۔

آج کل مسلمان حصول مقصد کی طرف توجہ کرنے کی بجائے فرقہ داریت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اے چاند تو آسمان کی وسعتوں میں اپنی آزادی اور اِس کے بالمقابل مسلمانوں کی گرفتاری اور اسیری کی کیفیت بھی ملاحظہ کر کہ وہ کس طرح فرقہ بندی میں اسیر ہو چکے ہیں۔ مسجد میں دیکھ کہ شیخ نے کس طرح تسبیح کے دھاگے کو توڑ ڈالا ہے یعنی دین اسلام کے علمبرداروں نے اسلام سے قطع تعلق کر لیا ہے جبکہ دوسری طرف بت خانے میں برہمن کو بھی دیکھ کہ وہ کس طرح اب تک کامل پختگی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہے۔ یہ بھی دیکھ کہ کس طرح کافروں نے مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کر لیے ہیں اور مسلمان کس طرح خود اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں مسلمانوں پر چاروں طرف سے حادثات کی جو بارش ہو رہی ہے اے چاند تو وہ بھی

دیکھ اور اس کا تماشا بھی کر کہ مسلمان ان حوادث کا مقابلہ کرنے کی بجائے مصائب کے مقابلے میں شیشے کی دیوار یعنی انتہائی نازک اور کمزور ثابت ہو رہے ہیں۔ مسلمان جو ایک زمانے میں صاحب عزت و وقار تھے آج خوشامد پر اتر آئے ہیں۔ ذرا خوشامد کے اس انداز کو بھی دیکھ۔ یہ بھی دیکھ کہ وہ لوگ جو انتہائی حقیر و ذلیل تھے اب وہ صاحب عزت بن کر غیرت و خودداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

کچھ قومیں ایسی بھی تھیں جنھیں بات تک کرنی نہیں آتی تھی، ہم نے انھیں بولنا سکھایا آج وہی قومیں دشمن بن کر ہمارے سامنے اکڑی ہوئی ہیں اور بڑے جوش و خروش سے گفتگو کرنے لگی ہیں۔ تو ذرا اِس امر کا بھی مشاہدہ کر۔ اے چاند مغربی ملکوں میں عیش و عشرت کا جو بازار گرم ہے تو ذرا اسے بھی دیکھ اور ایران میں بربادی کے مناظر پر جو ماتم ہو رہا ہے ذرا اسے بھی پیشِ نظر رکھ۔ ناداں ترکوں نے خلافت کا لباس خود ہی پھاڑ ڈالا یعنی نظام خلافت جو مسلمانوں کی وحدت کی علامت تھی، ترکوں نے ختم کر دیا۔ اس امر سے مسلمانوں کی سادہ دلی اور دشمنوں کی عیاری و مکاری کا اندازہ کر لے۔

جس طرح آئینہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے اسی طرح تو بھی ان حالات کو خاموشی سے دیکھتا رہ اور دورِ حاضر میں جو ہنگامے جاری ہیں ان کا مشاہدہ کرنے کی بجائے ماضی کے نغموں میں کھو جا۔

شمع اور شاعر

(۱۸۳)

تعارف

"شمع اور شاعر" فروری ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی اور اِسی سال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ ریواز ہوسٹل اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھی گئی۔ یہ نظم مولانا ظفر علی خاں نے اس جلسے کے لیے دس ہزار کی تعداد میں چھپوا کر آٹھ آنے فی کاپی کے حساب سے فروخت کی۔

شمع و شاعر ترکیب بند ہیئت کے کل گیارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند کے تمام شعر فارسی میں ہیں۔ پوری نظم شمع اور شاعر کے درمیان مکالمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلے بند میں شاعر شمع سے کچھ سوال کرتا ہے۔ باقی دس بندوں میں شمع شاعر کے سوالات کا جواب دیتی ہے۔

نظرِ ثانی میں اس نظم کا صرف ایک شعر قلمزد کیا گیا جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں درج ہے۔

حلِ لغات نفس: سانس ۔ اجل: موت ۔ نوا پیرا: نغمے گانے والا ۔ مضمر: پوشیدہ، چھپا ہوا ۔ امروز: آج، زمانہ حال ۔ فردا: آنے والا کل، مستقبل ۔ صہبا: شراب ۔ زشت روئی: بدصورتی، بدعملی ۔ سودائی: مجنوں، عاشق ۔ شوریدہ سر: دیوانہ ۔ دُرتابندہ: چمکدار موتی ۔ شعلہ آشام: شعلے پینے والے یعنی بہت تندوتیز شراب پینے والے ۔ جمعیت: اجتماع، مجتمع ہونے کی کیفیت ۔ پریشاں: بکھرنا ۔ بسمل: زخمی ۔ فکر فلک پیما: آسمان کو ناپنے والا خیال، بہت بلند خیال ۔ میکش: شراب پینے والے ۔ دشت جنوں پرور: جنون اور دیوانگی کی پرورش کرنے والا صحرا ۔ متاع: اثاثہ، دولت ۔ زیاں: نقصان ۔ سطوت: آن بان، شان وشوکت ۔ شیون: آہ و زاری ۔ نورِ ایمن: وہ روشنی جو کوہِ طور پر حضرت موسیٰؑ کو نظر آتی تھی ۔ گردوں: آسمان ۔ خرمن: کھلیان ۔ دیدۂ خونبار: خون برسانے والی آنکھ ۔ مژدہ: خوشخبری کے موقع پر بولا جاتا ہے ۔ صدائے نانو ونوش: پینے پلانے کی آواز ۔ ماہ سیما: چاند جیسی پیشانی والا یعنی محبوب ۔ غوغا: شور وہنگامہ ۔ شرابِ خانہ ساز: گھر میں بنی ہوئی شراب ۔ ہنگام: وقت ۔ سروش: خوشخبری دینے والا فرشتہ ۔ رہزن: راستے میں لوٹنے والا ۔ مستور: چھپی ہوئی ۔ کاشانہ: گھر ۔ عصا: چھڑی، ڈنڈا، یہاں پر پردے کا تمام راد ہے ۔ افتاد: مصیبت ۔ تلمیذ: شاگرد ۔ ناخدا: کشتی کھیلنے والا ، ملاح ۔ بحرِ بے پایاں: گہرا سمندر ۔ کشور: سلطنت ۔ شاہد: گواہ ۔ کسوت: لباس، پوشاک ۔ سیماب: پارا ۔ ترنم آفریں: نغمے پیدا کرنے والی ۔ مآل: انجام ۔

> دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش ۔ ۔ ۔

وضاحت کل میں نے اپنے ویران گھر میں جلنے والی شمع سے کہا کہ تیری زلفوں کیلئے پروانوں کے پر کنگھی کا کام دیتے ہیں (یعنی پروانے تجھ پر عاشق اور فریفتہ ہیں اور وہ ہمہ وقت تیرا طواف کرتے رہتے ہیں) جبکہ میں اس دنیا میں اس گلِ لالہ کی مانند ہوں جو صحرا میں کھلا ہوا ور جس کے نصیب میں نہ تو کوئی محفل ہو اور نہ کوئی گھر ۔ میں ایک مدت تک تیری طرح جلتا رہا لیکن اب تک کسی پروانے نے میرا طواف نہیں کیا ۔ یعنی کوئی میرا شیدائی نہیں ہوا ۔ آرزوؤں اور خواہشوں میں صرف ہونے والی میری جان سینکڑوں جلوے پیدا کر رہی ہے ۔ اس کے باوجود کوئی شخص میرا دیوانہ نہیں ۔ اے شمع آخر تو نے ساری دنیا کو روشن کرنے والی یہ روشنی

کہاں سے حاصل کی جس کی وجہ سے ایک بے حیثیت اور انتہائی حقیر پروانے نے حضرت موسیٰ جیسا سوز و ساز اور جذبہ عشق سیکھ لیا۔

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت (شمع شاعر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ بیشک تمہاری اور میری کیفیت ایک جیسی ہے لیکن نتائج میں اس لئے فرق ہے کہ تمہارے عمل اور مقصد میں تضاد ہے ۔ مثلاً تم ریاکار ہو اور محض نمائش کے لئے زندگی گزار رہے ہو۔)

شمع کہتی ہے کہ سانس کی جو پھونک مجھے بجھا دیتی ہے اور میرے لیے موت کا سامان بن جاتی ہے تم اسی سانس کی وجہ سے نغمے پیدا کرتے ہو ۔ میں صرف اس لیے جلتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جلنے کو میری فطرت کا لازمی جزو بنا دیا ہے اور سوز و ساز میری فطرت میں پوشیدہ رکھا ہے جبکہ تُو صرف اس لئے روشن ہے کہ پروانوں میں یعنی لوگوں میں تیرا عشق اور جنون پیدا ہو ۔ میں اس لیے روتی اور آنسو بہاتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا طوفان موجزن ہے جبکہ تو اس لیے روتا ہے کہ پھولوں کی محفل یعنی مسلمانوں میں تجھے شہرت مل سکے ۔ میری ہر صبح کا دامن میری راتوں کے خون سے رنگین اور سجا ہوا ہے یعنی میں ہر آنے والی صبح کے لئے بے انتہا قربانیاں دیتی ہوں جبکہ تمہاری آنے والی کل تمہارے حال سے بالکل ناواقف ہے ۔ یعنی تم اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کوئی محنت نہیں کرتے اور نہ کوئی تکلیف اٹھاتے ہو ۔ بیشک تم بھی میری طرح روشن ہو لیکن تمہارے دل میں وہ حقیقی اور پُرخلوص جلن موجود نہیں ہے جو میری فطرت میں مضمر ہے ۔ اس لیے تمہیں صحرا میں کھلے ہوئے لالے کا چراغ سمجھنا چاہیئے جو داغ تو رکھتا ہے لیکن حرارت اور روشنی سے تہی دامن ہوتا ہے ۔ تُو خود کو ساقی کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے لیکن ذرا سوچ کر کیا تیرے لیے یہ لقب مناسب اور موزوں بھی ہے ۔ اِس لیے کہ تیرے ساقی کہلوانے کے باوجود تیری محفل پیاسی ہے اور تیرے پیالے میں بھی شراب نہیں ۔ تیری بدصورتی اور بدعملی نے تیرے آئینے کو رسوا اور بدنام کر دیا ہے یعنی بے عمل تو ہے لیکن تیری وجہ سے پوری ملتِ اسلامیہ بدنام ہوتی ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ ملت نے اپنے لیے جو قاعدہ اور دستور بنا رکھا ہے ۔ تیرا طرزِ عمل اُس سے بالکل مختلف ہے ۔ تُو اپنے پہلو میں کعبہ رکھتا ہے یعنی تو مسلمان ہے ۔ اِس کے باوجود کافرانہ طریق زندگی کا شیدائی ہے ۔ اِسی سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ ملت سے تجھے کوئی لگاؤ اور محبت نہیں ہے ۔ ملتِ اسلامیہ میں اب قیس جیسے عشاق اور مخلص لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان نہیں۔

اس لئے کہ تیرا صحرا وسیع نہیں ہے اور تیرے کجاوے میں کوئی محبوب بھی نہیں بیٹھا جو لوگوں کو اپنے عشق میں مبتلا کر سکے ۔ یعنی ملت اسلامیہ اپنے حقیقی جوہر سے عاری اور تہی دامن ہو چکی ہے ۔ اے چمک دار اور روشن موتی تو اس لیے روشن و چمکدار ہے کہ تیری پرورش خطرات و حوادث کی موجوں کے درمیان ہوئی ہے لیکن اب تیرا دریا طوفانوں اور مشکلات سے ناواقف ہو گیا ہے ۔ گویا اب تجھ میں مشکلات سے عہدہ برآ ہونے اور ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی یعنی مسلمان قوم ماضی میں مشکلات برداشت کرنے کی وجہ سے توانا تھی لیکن اب بے عملی کی وجہ سے کمزور ہو گئی ہے ۔

اب تو کس لیے شاعری کرتا ہے ۔ اب تو تیرا گلستان تباہ و برباد ہو چکا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تیرے نغمے بے موقع اور بے موسم ہیں اور اسی لیے بے نتیجہ اور لا حاصل ہیں ۔ اب ان سے ملت کی بیداری کا کام نہیں لیا جا سکتا ۔

علامہ اقبال نے اس بند میں مختلف علامات سے کام لیکر رہنمایانِ قوم کے عدمِ خلوص، ریاکاری، خود غرضی اور کردار و گفتار میں تضاد کا موثر نقشہ کھینچا ہے ۔

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے ــ ــ ــ

وضاحت ملت اسلامیہ کے جو افراد ملت کے مسائل کا شعور رکھتے تھے وہ تو انتظارِ بسیار کے بعد مایوس ہو کر چلے گئے ۔ اُن کے جانے کے بعد تو دیدار کا وعدہ لے کر آیا تو اس کا کیا فائدہ ۔ تمہاری محفل سے بہت زیادہ تیز شراب پینے والے لوگ چلے گئے ۔ اے ساقی اُن کے جانے کے بعد اب تو اپنے پیالے میں شراب لے کر آیا ہے تو اس کا کیا فائدہ ۔ گلستان میں پھولوں کے لیے بہار کی تر و تازہ کر دینے والی ہوا کا پیغام زندگی آیا لیکن اُس وقت گلشن اجڑ گیا، اس کا شیرازہ بکھر گیا اور گلشن کی ایک ایک چیز خزاں کی زد میں آگئی ۔ اب اس ہوا سے کیا کام لیا جا سکتا ہے ۔ محبوب کے عشق اور فرقت میں زخم کھانے والے لوگ رات بھر تڑپتے رہے ۔ رات کے آخری حصے میں اُن کی بے چینی اور اضطراب دیکھنے کے لائق تھا لیکن محبوب انھیں جلوہ دکھانے پر آمادہ نہ ہوا ۔ لیکن جب یہ تڑپ ختم ہو گئی ۔ عاشق اور بسمل دیدار سے مایوس ہو گئے تو انھیں اپنا جلوہ دکھانے پر آمادہ ہوا اور چھت کے اوپر پہنچا بھی تو کیا حاصل ۔ وہ شعلہ جسے اُس کی روشنی اور حرارت کی وجہ سے تمام پروانے پسند کرتے تھے، بجھ گیا ۔ جب تک وہ روشن اور گرم رہا کسی نے اس سے فیض حاصل نہ کیا ۔ جب وہ بجھ گیا

تواب کوئی سوز اور جلن حاصل کرنے کے لئے آیا بھی تو کیا فائدہ۔

اب شاعری کرو یا نہ کرو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ پھول جو شاعری سے متاثر ہو سکتے تھے، اپنے اچھے برے سے بے پروا ہو چکے ہیں۔ اب خواہ گھنٹی کی آواز آتے یا نہ آتے اس سے کچھ حاصل نہیں۔ چونکہ قافلے پر بے حسی طاری ہے۔ لہٰذا وہ گھنٹی کی آواز پر کان نہیں دھرے گا اور نہ اپنی منزل کی طرف سفر کرنے پر آمادہ ہوگا۔

اس بند میں علامہ اقبال نے شمع کی زبانی قوم کی بے حسی اور رہنماؤں کی طرف سے بے وقت کی راگنی کا منظر پیش کیا ہے۔

۵ شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا ---

وضاحت شمع شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ تجھے اپنی محفل میں شمع کی حیثیت حاصل تھی اور شمع کا تمام تر سرمایہ جلن اور سوز ہوتا ہے لیکن تو سوز سے بالکل تہی دامن تھا۔ اس سے اندازہ کر لینا چاہیئے کہ جب تو شمع ہونے کے باوجود سوز سے خالی تھا تو تیرے پروانوں میں وہ سوز اور جاں نثاری کا جذبہ کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ یعنی اگر رہنما اپنے مقصد سے مخلص نہ ہو تو وہ قوم بھی اس کی آواز پر لبیک کہنے پر مخلص نہیں ہو سکتی۔ جب تو اس قدر صلاحیت رکھتا تھا کہ قوم کے تمام افراد کو بلا تفریق رنگ و نسل تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی دھاگے میں پرو کر انھیں متحد کر سکتا تھا تو پھر آخر یہ لوگ کیوں متحد نہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے تیری خود غرضی اور عدم خلوص نمایاں ہوتا ہے۔ ماضی میں مشکلات کو خاطر میں نہ لانے والا عشق اور انتہائی بلند خیالی مسلمانوں کی متاع تھی۔ لیکن آج مسلمان ان دونوں چیزوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان میں نہ تو عاشق اور دیوانے پیدا ہوتے ہیں اور نہ عاقل اور دانشور اور ماضی کے عروج کے مقابلے میں موجودہ زمانے کے زوال کی یہی وجہ ہے۔

اب مسلمانوں میں نہ تو جگر کو جلانے یعنی مشکلات و شدائد برداشت کرنے کا جذبہ ہے اور نہ وہ عشق کی جلا دینے والی شراب پینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یعنی نہ ان میں جدوجہد کرنے کی قوت باقی ہے اور نہ اپنے مقاصد کے حصول سے انھیں کوئی رغبت ہے۔ ایسے میں اگر شمع یعنی قوم کے رہنما کے گرد کچھ پروانے موجود بھی ہوں تو کچھ حاصل نہیں۔ چلئے یہ تسلیم کر تو ساقی ہے اور لوگوں کو شراب پلاتا ہے لیکن یہ تو سوچ کہ اب تو ساقی ہو کر کیا کرے گا اور کیسے شراب پلائے گا۔ اس لیے کہ اب نہ تو پرانے شراب خانے باقی ہیں اور نہ پرانے شراب پینے والے یعنی زمانہ اور اس کے تقاضے سب

کچھ بدل گئے۔ ایسے میں ماضی کی عظمت کو بحال کرنا سخت مشکل ہے۔

شمع اس صورتِ حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتی ہے کہ جس ساقی کے پیمانے اور شراب کے پیالے کل تک پوری بزم میں گردش کرتے اور لوگوں کو شراب پلاتے رہے آج اس ساقی کی یادگار کے طور پر صرف ایک ٹوٹی ہوئی صراحی باقی ہے اور اپنے ساقی کا ماتم کر رہی ہے۔ یعنی عروج کے تمام آثار ختم ہو گئے۔ البتہ اس کی چند یادیں باقی ہیں۔ آج وہ تمام صحرا بالکل خاموش ہیں جو ایک زمانے میں عشق و جنوں کی پرورش کیا کرتے تھے اور جن میں لیلیٰ اور اس کے عاشق محو رقص و سرود رہتے تھے یعنی ملتِ اسلامیہ جن جن خطوں میں برسرِ اقتدار اور حکمران رہی آج وہ تمام خطے اُس کی حکمرانی سے نکل گئے اور وہاں پر مسلمانوں کی تہذیب نے دم توڑ دیا۔

یہ ہماری ناکامی اور زوال کی انتہا ہے کہ ملت اسلامیہ کے قافلے کی تمام دولت لٹ گئی لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل سے اپنے لٹنے، برباد ہونے اور اپنے نقصان و خسارے کا احساس بھی جاتا رہا۔ یعنی انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ انھوں نے کیا کچھ کھو دیا۔

اس بند میں من حیث المجموعی ملت اسلامیہ کی بے حسی کا رونا رویا گیا ہے

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے بھی ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال ماضی میں مسلمانوں کے عروج اور موجودہ عہد میں اُن کے زوال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں مسلمانوں کے ہنگاموں سے ویران مقامات بھی آباد اور پُر رونق ہو گئے تھے جبکہ آج یہ حالت ہے کہ خود مسلمانوں کے اپنے شہر برباد اور ویران ہو گئے اور ان کی آبادیاں جنگلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جن نمازوں کے باعث ہندوستان جیسے بت پرست علاقے میں اللہ کو ایک ماننے والوں کی حکومت قائم ہوئی اب وہ نمازیں ہندوستان کے برہمنوں کی نذر ہو چکی ہیں یعنی توحید پرستوں نے اب ہندو رہنماؤں کو اپنا آقا اور لیڈر مان لیا ہے جس کی وجہ سے ان کی اپنی حیثیت و اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ دراصل مسلمانوں نے زندگی اور زمانے کے عام تقاضے سے روگردانی کی۔ زندگی کا عام قاعدہ اور دستور یہ ہے کہ یہاں پر ہمیشہ رہنے والی عیش و مسرت پابندیوں کو قبول کر کے حاصل کی جا سکتی ہے اور اگر ان پابندیوں کی خلاف ورزی کی جائے تو عیش و مسرت غم واندوہ میں بدل جاتی ہیں۔ مثلاً جب تک پانی کی موج دریا میں رہتی ہے اور اس کی پابندی کو قبول کرتی ہے تو وہ تلاطم خیز بنی رہتی ہے لیکن جب یہی موج سمندر یا دریا کے کناروں سے ٹکرا کر پابندی توڑنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے اپنے آزاد ہونے کی خواہش کے نتیجے میں آہ و زاری اور نالہ و فریاد سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا نور جو حضرتِ موسیٰؑ کو کوہِ طور پر نظر آیا تھا' اپنے دیکھنے جلنے کے لئے جن نگاہوں کا متمنی تھا اب وہ نگاہیں اس نور سے ناامید ہو چکی ہیں اور یہ پستی اور زوال کی انتہا ہے ۔ ایک زمانہ تھا کہ باغ میں ہزاروں بلبلیں نغمے گاتی ہوئی ادھر سے ادھر اڑتی پھرتی تھیں ۔ خدا جانے ان کے دل میں کیا آئی اور انھوں نے کیا سوچا کہ وہ تمام بلبلیں اپنے اپنے آشیانوں میں اسیر ہو گئیں اور یوں گلستان کی زیب و زینت ختم ہو کر رہ گئی ۔

وہ بجلیاں جن کی تڑپ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں دیکھنے والوں کو جلا دیتی تھیں اب کھلیان کے دامن میں آرام کر رہی ہیں اور ان کی حدت و حرارت ختم ہو چکی ہے یعنی ملت اسلامیہ کا ہر فرد اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے ۔ ایسے میں خون برسانے والی آنکھیں پھولوں کے لیے باغ کا احسان کیوں لیں ۔ انہوں نے تو اپنے مسلسل بہنے والے آنسوؤں سے دامن ہی کو گلزار بنا دیا ہے ۔ لیکن ہمارے غموں کی یہ شام مستقل اور دائمی نہیں ہے بلکہ یہ شام غم تو مسرت و شادمانی کی صبح کی خوشخبری دے رہی ہے ۔ یوں دیکھا جائے تو رات کی تاریکی میں امید کی کرن نظر آتی ہے یعنی ملتِ اسلامیہ کا انتہائی زوال آخرِ کار ختم ہو گا اور پھر اس کے عروج کا دور شروع ہو گا ۔ جس طرح ہر شام کے بعد صبح اور ہر رات کے بعد دِن آتا ہے ۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز ۔ ۔ ۔

وضاحت

اے حجاز کے شراب خانے سے شراب پلانے والے یعنی اے مسلمانوں کے رہنما آپ کے لیے یہ خوشخبری کی بات ہے کہ ایک طویل عرصے تک مدہوش اور اپنے نفع و نقصان سے بے پروا رہنے والوں کو آخرِ کار پھر ہوش آ رہا ہے یعنی ملت اسلامیہ پھر بیدار ہو رہی ہے آج تک اِس ملت نے اپنی غیرت و خودداری کو دشمنوں کی شراب کے عوض فروخت کر رکھا تھا یعنی یہ اپنا مذہب اور تہذیب چھوڑ کر فرنگی و عجمی تہذیب کے دلدادہ ہو رہے تھے ۔ لیکن اب پھر تیری دکان میں پینے پلانے کا شور برپا ہے یعنی مسلمان پھر اپنے مذہب اور تہذیب کی طرف لوٹ رہے ہیں ۔ ہندوستان کے چاند جیسی پیشانی رکھنے والے محبوبوں کا جادو ختم ہونے والا ہے اور ایک بار پھر سلیمیٰ کی نظریں لوگوں کو سرگرم تگ و تاز کر رہی ہیں ۔ واضح ہو کہ یہاں پر ماہ سیمایانِ ہند کا اشارہ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں اور ہندو رہنماؤں دونوں کے لیے ہو سکتا ہے ۔ اس لیے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا تشخص ختم کر کے انہی کے رنگ میں رنگے جانے کی کوشش میں مبتلا تھے ۔ اسی طرح سلیمیٰ عربی شاعری کی ایک خیالی محبوبہ کا نام ہے ۔ اقبال نے یہ نام یہاں پر اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے استعمال کیا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اب پھر یہ شور بلند ہے کہ اے ساقی مغرب کی شراب یعنی تہذیب و

تمدن نے دل کے ہنگامے خاموش کر دیئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایک بار پھر گھر کی بنی ہوئی شراب عطا کر۔

اقبال ملتِ اسلامیہ کی اس نشاۃ الثانیہ پر خوش ہو کر کہتے ہیں کہ اے شاعر تجھے نغمے گانے چاہئیں کہ یہ خاموش رہنے کا وقت اور موقع نہیں ہے۔ اب صبح کا وقت ہے اور آسمان نے اپنے کاندھے پر سورج کی صراحی اٹھا رکھی ہے۔ میں تمہیں ایک بہت عمدہ بات بتا رہا ہوں۔ اگر تم میں طاقت اور قوت ہو تو یہ بات سنو کہ تم دوسروں کے غم میں جلو اور دوسروں کو اپنے ساتھ جلاؤ یعنی سب لوگ متحد و متفق ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے لگیں۔ بڑے لوگ یہ بات کہہ گئے ہیں کہ اچھی شاعری پیغمبری کا جزو ہوتی ہے۔ یعنی اس میں انسانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لہٰذا اے اقبال تو بھی ایک پیغمبر کی طرح اپنی ملت کی بزم میں خوشخبری سنانے والے فرشتے کا پیغام سنا دے۔

اہلِ ملت کی محوِ خواب آنکھوں کو دیدار کے وعدے سے بیدار کر دے اور لوگوں کے مردہ دلوں کو اپنی شاعری کی جلن اور تڑپ سے زندہ کر دے۔

ع رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا ۔۔۔

وضاحت اقبال کے بعض شارحین کا خیال ہے کہ سابقہ بند کے آخری دو اشعار کی رعایت سے باقی تمام بند اور شعروں میں ملتِ اسلامیہ کو اقبال کے ذریعے پیغام سرکش پہنچایا گیا ہے۔ یعنی یہاں پر شمع کی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اسے شمع کی گفتگو بھی تصور کر لیا جائے تو بھی نظم کے تسلسل اور مفاہیم میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ بہر حال آئندہ کے بندوں میں خطاب صرف شاعر سے نہیں بلکہ پوری ملت سے ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مشکلات سے بچنے اور آرام طلبی کی عادت نے تیری ہمت کو لوٹ لیا۔ صحرا میں یعنی مشکلات میں تو نے سمندر کی مانند زندگی گذاری یعنی ملتِ اسلامیہ مشکلات کو خاطر میں نہیں نہیں لاتی لیکن جب یہ مشکلات ختم ہو گئیں اور آرام و آسائش کا دور آیا تو مسلمانوں نے سمندر کی بجائے ایک معمولی سی ندی کی حیثیت اختیار کر لی۔ ملتِ اسلامیہ جب تک اپنی اصلیت پر قائم و استوار تھی اور تیری صلاحیتیں باقی تھیں تو اس وقت تک تم میں اتحاد و اتفاق بھی تھا لیکن جب یہ کیفیت ختم ہو گئی تو وہ اتحاد و اتفاق بھی جاتا رہا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پھولوں کی پنکھڑیاں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو پھول کی خوشبو کا قافلہ بھی اپنے مرکز سے الگ ہو کر بکھر جاتا ہے۔

قطرے کی زندگی تمہیں زندگی کے رازوں سے آشنا کرتی ہے۔ مثلاً پانی کا ایک قطرہ کبھی تو منجمد

ہو کر موتی بن جاتا ہے، کبھی آسمان کی بلندیوں سے شبنم کی حیثیت میں زمین پر واپس آتا ہے اور کبھی آنسو جیسی قیمتی چیز بن کر انسانی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔ یعنی زندگی کا ذوق ہو تو انسان بھی ان تمام مراحل سے گذر سکتا ہے۔ تمہارا پہلو دل سے لاتعلق ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں چاروں طرف سے مشکلات نے گھیر لیا ہے اور تم ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ آگے بڑھنے اور موجودہ دردناک صورت حال سے نجات پانے کے لیے پھر سے دل کی دولت حاصل کرو۔ تمہاری ملت کی تمام تر شان وشوکت اور عزت وحشمت اتحاد واتفاق کی وجہ سے تھی یہ اتحاد واتفاق ختم ہوا تو عزت بھی جاتی رہی اور تم دنیا بھر میں بدنام ہو گئے۔ اگر پھر سے نیک نام ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو اپنی صفوں میں وہی اتحاد قائم کرو۔

یہ بات ایک اصول کی حیثیت رکھتی ہے کہ کسی فرد کا وجود محض اُس وقت تک ہے جب تک وہ اپنی ملت سے مربوط ہے۔ اگر یہ نہیں ہوگا اور ہر شخص تنہا ہو کر زندگی گذارنا چاہے گا تو درحقیقت یہ اس کے دردناک انجام کی ابتداء ہو گی۔ بالکل اس طرح جس طرح کوئی لہر اور موج سمندر یا دریا میں رہ سکتی ہے۔ اگر یہ موج دریا سے الگ ہونے کی کوشش کرے تو اپنا وجود ختم کرلے گی۔

۵ پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ ـ ـ ـ

وضاحت ابھی اپنی محبت کو اپنے دل کے پردے میں چھپائے رکھو۔ جس طرح صراحی اپنی شراب کو چھپا کر نہیں رکھ سکتی اور اسے ظاہر ورسوا کر دیتی ہے تم یہ روش اختیار نہ کرو۔ تم ایک مدت سے اپنے حقیقی میدان اور اپنی کارگاہ سے الگ ہو چکے ہو لیکن اگر دنیا میں عزت پانا چاہتے ہو تو دوبارہ اپنے میدان کی طرف توجہ کرو۔ تحقیق کے شعلے اور روشنی کو اپنے گھر میں صرف کرو اور حضرت موسیٰؑ کی طرح کوہِ طور کی وادی میں ڈیرے ڈال دو۔ یعنی تمہاری ترقی کا راز اسی امر میں پوشیدہ ہے کہ تم دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی ملی روایات و مذہبی ومعاشرتی اقدار پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ بیشک شمع رات بھر جلتی رہی اور اس کی آگ میں بے شمار پروانے جل کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن شمع سے انتقام لینے اور اس کے ظلم وستم کو منطقی انجام تک پہنچانے کا حقیقی راستہ یہ ہے کہ جو پروانے جل گئے ہیں ان کی خاک سے ایک نئی صبح وجود میں لائی جائے یعنی جب صبح ہو گی تو شمع خود بخود غیر ضروری سمجھ کر گل کر دی جائے گی اور یوں وہ بھی اپنے انجام کو پہنچے گی۔ اگر تم خوددار اور غیرت مند ہو تو شراب پلانے والے کا احسان مت لو اور اس طرح زندگی گذارو جس

طرح پانی کا بلبلہ دریا میں رہنے کے باوجود اپنے پیالے کو الٹا رکھتا ہے اور دریا سے کسی خیرات کی امید نہیں رکھتا۔ اقبال نے یہی مضمون ایک اور جگہ یوں نظم کیا ہے۔

> یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
> تجھے بھی چاہیئے مثلِ حباب آبجو رہنا

پرانے پہاڑوں اور صحراؤں میں کیف و سرور باقی نہیں رہا۔ تیرا جنون بھی نیا ہے لہٰذا تجھے اپنے جنون کی مطابقت سے نئے ویرانے تلاش کر کے ان میں قسمت آزما ہونا چاہیئے۔ یعنی زندگی کے پرانے طور طریقے ختم ہو گئے۔ لہٰذا اب نئی زندگی کے آغاز کے لیے نئے طور طریقوں سے کام لینا چاہیئے۔ اگر تو اپنی تقدیر کی وجہ سے تنزل کا شکار ہو گیا ہے اور تیری اہمیت وحیثیت ختم کر کے تیری قسمت نے تجھے مٹی میں ملا دیا ہے تو پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ ان بدترین حالات میں بھی زندگی کا ثبوت دے اور عروج کی طرف قدم بڑھا۔ جیسے کسان دانے کو کھیت میں ڈال دیتا ہے لیکن یہ دانہ مٹی میں مل جانے کے باوجود نیا پیدا کر کے پھر قائم و استوار ہو جاتا ہے۔ وہ پرانی شاخ جو تو نے چھوڑ دی تھی پھر اس پر اپنا گھونسلا بنا لے اور اس شاخ پر بیٹھ کر تمام اہل گلشن یعنی ملتِ اسلامیہ کے افراد اور دیگر اقوام کو اپنے مستانہ گیتوں کا شیدائی بنا لے۔ اس دنیا میں جینے کے دو ہی طریقے ہیں کہ یا تو بلبل کی پیروی میں زندگی گزاری جائے اور ہر مشکل میں سراپا نالہ و فریاد بن جائے یا پھر انسان پھول کا تنا گر د بن جائے اور جو کیفیت بھی گزرے اسے نہایت سکون و اطمینان اور صبر و تحمل سے برداشت کرے۔

اے مسلمان آخر تو اِس دنیا میں شبنم کی طرح بے آواز اور خاموش کیوں ہے؟ تجھے چاہیئے کہ تُو اپنے لب کھولے اور نغمے پیدا کرے۔ اس لیے کہ تُو اس دنیا کے ساز کے نغمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

> آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا ...

وضاحت

اے کسان! تُو اپنی حیثیت و اہمیت سے کچھ تو واقفیت حاصل کر۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تو ہی دانہ اور بیج بھی ہے اور کھیتی بھی۔ بارش بھی تُو ہے اور کھیت سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ بھی تُو ہی ہے یعنی ان سب چیزوں کی رونق اور افادیت تیرے دم سے ہے۔ اگر تُو نہ ہو تو یہ سب چیزیں بیکار ہو جائیں۔ آخر تجھے کس کی تلاش ہے اور تو کس کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو تُو کسی کا محتاج نہیں ہے اِس لیے کہ تو خود راستہ اور راستہ چلنے والے کی حیثیت رکھتا ہے۔ راستہ بتانے والا بھی تُو ہے اور منزل کی حیثیت

بھی تجھے ہی حاصل ہے۔ تیرا دل طوفان کے خوف سے کانپ رہا ہے حالانکہ تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اِس لئے کہ ملاح تو خود ہے، سمندر کی جیثیت بھی تجھے ہی حاصل ہے کشتی بھی تو خود ہے اور ساحل بھی تو خود ہی ہے۔ اے مسلمان کبھی تو عشق میں پھٹے ہوئے اور تار تار گریبان کو دیکھ، تجھے معلوم ہو گا کہ مجنوں اور لیلیٰ بھی تو ہی ہے اور صحرا جس میں مجنوں مارا مارا پھرتا تھا وہ بھی تیری ہی ذات میں سمٹا ہوا ہے اور وہ کجاوہ جس میں لیلیٰ بیٹھی تھی وہ بھی تُو ہی ہے۔ تو کتنا سادہ ہے کہ تو نے خود کو شراب پلانے والے کا محتاج بنا لیا ہے حالانکہ شراب بھی تو خود ہے، صراحی، ساقی اور میکشوں کی محفل کی جیثیت بھی خود تجھے ہی حاصل ہے۔ اللہ کے سوا اِس دنیا میں جو کچھ ہے تو اُسے آگ بن کر جلا دے اور اس سلسلے میں تجھے باطل اور غیر حق کا کوئی خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ اِس لئے کہ باطل کو تباہ و برباد کرنے والا بھی تو خود ہے یعنی اِس طرح باطل کو خود تجھ سے خوف کھانا چاہیئے۔

اے اپنی حقیقت اور مقام سے بے خبر! تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تو زمانے کے آئینے کے جوہر کی جیثیت رکھتا ہے مسلمان کی جیثیت سے تو اِس دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو اپنا آخری نبی بنا کر بھیجا اسی طرح اسلام انسانوں کے لیے اللہ کے آخری پیغام کی جیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان اِس پیغام کو زمانے بھر میں پھیلانے اور عام کرنے کے ذمہ دار ہیں اور چونکہ اسلام آخری پیغام کی جیثیت سے لافانی اور لازوال ہے اس طرح ملتِ اسلامیہ بھی لافانی اور لازوال قرار پائیگی۔

ے اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اپنے حال اور اپنے نیک و بد سے غفلت برتنے والے! تجھے اپنی اصلیت و حقیقت سے واقف ہونا چاہیئے۔ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ تُو ایک قطرے کی طرح حقیر و کم مایہ ہے لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ قطرہ ہونے کے باوجود تیری ذات میں ایک بے تھاہ اور بے کنار سمندر کی صلاحیتیں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ تو کم مائیگی کے جادو میں کیوں گرفتار ہو گیا ہے۔ حالانکہ اگر تُو غور کرے تو تجھے معلوم ہو گا کہ تیری ذات میں ایسے طوفانوں کی شان و شوکت چھپی ہوئی ہے جو دنیا کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ اے مسلمان! تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تیرا دل اور سینہ ایک ایسی ہستی کے پیغام کا امانت دار ہے جو دنیا کے نظام میں ظاہر و باہر بھی ہے اور کسی کو نظر بھی نہیں آتی۔ اِس شعر میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کا پیغام یعنی اسلام پھیلانے کا فرض سونپا گیا ہے اور چونکہ اللہ لافانی ہے لہٰذا اس کا پیغام اور پیغام پھیلانے والے بھی لافانی ہوں گے۔ اگرچہ تو اپنی کم مائیگی کے احساس میں مبتلا ہے لیکن تجھے پتا ہونا چاہیئے کہ تیرے پاس وہ ساز و سامان بھی موجود

ہے۔جس کے باعث بیشمار سلطنتیں تیر و تلوار کے بغیر فتح کی جا سکتی ہیں اور یہ حقیقت حضرت عمر فاروق رضؓ اور دیگر خلفاء کے عہد میں ثابت ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کے نہایت معمولی لشکر اپنی بے سروسامانی کے باوجود ایران و روم کے عظیم الشان افواج کو شکستِ فاش سے دوچار کر دیتے تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ لیکن مشکل یہ ہے کہ تو نے وہ حقیقی وعدہ فراموش کر دیا ہے جو تو نے اللہ تعالیٰ اور آنحضرتؐ سے کیا تھا اور جس پر کوہِ فاران کی خاموشی اب تک گواہی دے رہی ہے یعنی مسلمانوں نے اسلام کے ازلی و ابدی پیغام کو فراموش کر دیا ہے۔اس لیے پستی اور ذلت ان کا مقدر ہو گئی ہے۔ تُو نے انتہائی نادانی اور سادگی کا ثبوت دیا کہ گلشن میں اپنے دامن کی تنگی کے باعث محض چند کلیاں توڑنے پر قناعت کر لی حالانکہ اگر تو مزید کلیاں اور پھول توڑنے کی خواہش کرتا تو تیرے دامن کی تنگی بھی دور ہو سکتی تھی لیکن تیری کم ہمتی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ میری شاعری کے پردے میں میرے دل کی کیفیت نمایاں ہو رہی ہے۔آپ صراحی کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ صراحی میں موجود شراب اس کے اندر چھپی ہوئی بھی ہے اور صاف طور پر نظر بھی آ رہی ہے۔ میری آگ سے بھری ہوئی شاعری نے مجھے جلا کر رکھ دیا ہے لیکن اس کے باوجود میں اس سے تنگ نہیں ہوا۔اس لئے کہ یہی آگ اور یہی حرارت میری زندگی کا سامان ہے۔یعنی اگر یہ آگ نہ ہو گی تو میرا عدم وجود بھی برابر ہو جائے گا۔ آگ پر مشتمل اس شاعری کا راز میرے سینے اور دل میں دیکھ۔ اس آگ نے میرے دل کو ایسا شیشہ بنا دیا ہے جس میں حال کے علاوہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات بھی صاف طور پر نظر آ رہے ہیں۔ تقدیر کے زیرِ اثر جو کچھ پیش آنے والا ہے میرے سینے اور میرے دل کے ذریعے تُو اس کا نظارہ کر سکتا ہے۔

۵ آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش — — —

وضاحت

آج کل ملتِ اسلامیہ چاروں طرف سے اندھیروں میں گھری ہوئی ہے۔لیکن آخر کار صبح کے نور کی وجہ سے آسمان آئینے کا لباس پہن لے گا یعنی روشن اور منور ہو جائے گا اور رات کی تاریکی پارے کی طرح غائب ہو جائے گی اور ہر طرف اجالا پھیل جائے گا۔ بہار کی ٹھنڈی اور حیات بخش ہوا اس قدر نغمے پیدا کرے گی کہ کلیوں اور غنچوں میں سوئی ہوئی خوشبو بھی نغمہ بن جائے گی۔ تمام زخم اٹھانے والے، ظلم و ستم سہنے والے اور عشق و جنون میں مبتلا ایک دوسرے سے آملیں گے۔یعنی مربوط انداز میں ایک دوسرے کے مقاصد میں شریک ہو جائیں گے۔یہاں تک کہ صبا بھی پھولوں کی ساتھی ہو جائے گی۔ میری گریہ و زاری اور رونا دھونا لوگوں کے دلوں میں جوش و ولولہ اور تڑپ پیدا کرے گا۔یہاں تک کہ اس چمن کی ایک ایک کلی یعنی ملتِ

اسلامیہ کا ایک ایک فرد میرا دکھ درد سمجھنے لگے گا اور میرے مقاصد میں شریک ہو جائے گا۔ آج کل مسلمان تہذیب مغرب اور یورپی قوتوں سے سہمے ہوئے ہیں اور ان قوتوں کے بلاخیز دریا نے ملتِ اسلامیہ کی عزت وعظمت کے سفینے کو بظاہر غرق کر دیا ہے لیکن تم بہت جلد اس دریا کی پرشکوہ رفتار کا انجام دیکھ لوگے۔ خود اس کی مضطرب اور بیتاب موجیں اس کے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوں گی اور یہ تہذیب تنزل کا شکار ہو جائے گی۔ علامہ اقبال نے تہذیب مغرب کے بارے میں ایسا ہی خیال ایک اور نظم میں بھی ظاہر کیا ہے۔ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

صرف تہذیب مغرب اپنے انجام کو نہیں پہنچے گی بلکہ مسلمان جو اپنے طور طریقے بھول چکے ہیں انھیں پھر سجدوں کا پیغام یاد آجائے گا اور ان کی پیشانیاں ایک بار پھر خانہ کعبہ کی مٹی سے تعلق پیدا کر لیں گی۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان نئے سرے سے اسلامی اقدار کو اپنا لیں گے۔ شکار کرنے والے نے آج تو ظلم وستم ڈھا رکھا ہے لیکن بہت جلد خود صیاد اور ظلم وستم کرنے والا نالہ وفریاد پر مجبور ہوگا جس کے نتیجے میں پرندے نغمے گانے پر مائل ہوں گے اور اب تو پھول توڑنے والا کلیوں اور پھولوں پر ظلم کرتا ہے لیکن ایک وقت آئے گا جب خود پھول توڑنے والے کا خون کلی کے لباس کو رنگین کر دے گا، یعنی آج کل جو ظالم ہیں ان کا ظلم اپنے انجام کو پہنچے گا اور آج کل کے مظلوم ترقی کے راستے پر گامزن ہوں گے۔

اس کے سوا بھی اور بہت کچھ ہے جو میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اُس سب کچھ کو الفاظ کا جامہ پہنا کر زبان پر لانا مشکل ہے۔ البتہ میں مستقبل میں پیش آنے والے مناظر اور واقعات کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ گو میں ان واقعات کو بیان نہیں کر سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے نتیجے میں سورج طلوع ہوگا۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی رات رخصت ہو جائے گی اور یہ دنیا ایک بار پھر توحید کے نغموں سے بھر جائے گی۔ یعنی نئے سرے سے ملتِ اسلامیہ کی کامیابیوں وکامرانیوں کا دور آئے گا۔

واضح رہے کہ اقبال نے نظم شمع اور شاعر کے آخری بند میں اسلامی نشاۃ الثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا اور اس بارے میں جو پیشگوئیاں کی تھیں وہ بڑی حد تک پوری ہو چکی ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی بیداری جو آجکل نظر آتی ہے سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں اس کا تصور بھی ناممکن تھا۔

مُسلم

(۱۹۵)

تعارف جیساکہ بانگِ درا میں وضاحت کردی گئی ہے، یہ نظم جون ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی تھی. مثنوی فارم کے دو بندوں پر مشتمل اس نظم میں مکالمے کا انداز اختیار کیا گیا ہے

حلِ لغات نفس : سانس ۔ مستور : چھپا ہوا، پوشیدہ ۔ سینۂ سوزاں : جلا ہوا سینہ ۔ معمور : بھرا ہوا ۔ بربط : موسیقی کا ایک ساز ۔ سرودِ رفتہ : گذرا ہوا نغمہ ، مسلمانوں کا شاندار ماضی مراد ہے ۔ جویا : متلاشی، ڈھونڈنے والا ۔ کاروانِ خفتہ پا : وہ قافلہ جس کے پاؤں سو رہے ہوں، یعنی اپنی منزل کی طرف سفر نہ کرنے والے لوگوں کا قافلہ ۔ شبِ دوشینہ : گذری ہوئی رات ۔ شاہد : گواہ ۔ ناموس : عزت ، ننگ و نام ۔ کوکبِ تابندہ : روشن ستارہ ۔ تابانی : روشنی ، چمک دمک ۔ دوش : گذری ہوئی کل ، ماضی ۔ فردا : آنے والی کل ، مستقبل ۔

شعر

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اقبال تیرا ہر سانس آہوں میں چھپا ہوا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے تیرا عشق کی وجہ سے جلا ہوا سینہ آہ و فریاد سے بھرا ہوا ہے ۔ تیرے دل کا ساز یعنی تیری شاعری میں مایوسی اور نا امیدی کا کوئی نغمہ نہیں ہے جب کہ ہماری رائے یہ ہے کہ تو جس محمل کے عشق میں مبتلا ہے وہ محبوب سے خالی ہے ۔ یعنی اب اسلام کے عروج و اقبال کا دور ختم ہو گیا اور وہ دور اب واپس نہیں آئے گا ۔ اے اقبال تیرے کان گزرے ہوئے نغمے کے متلاشی ہیں یعنی تو اسلام کے دورِ عروج کو واپس لانا چاہتا ہے اور اسی وجہ سے تیرا دل موجودہ زمانے اور اس کے ہنگاموں کی طرف متوجہ نہیں ہے ۔ لیکن کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ اب چمن میں ہمارے ہم آواز پھول کی کہانی نہیں سننا چاہتے اور محفل میں رہنے والے لوگ تیرے پرانے پیغام کی طرف کوئی توجہ نہیں دینا چاہتے ۔ یعنی مسلمان اب اسلام سے متعلق ماضی کی باتیں نہیں سننا چاہتے لہٰذا اے سفر نہ کرنے والے قافلے کی گھنٹی اب تو خاموش ہو گا ۔ اس لیے کہ تیری آواز دلوں کو بہت ہی زیادہ مایوس کر رہی ہے

اور مایوسی پیدا کرنے سے خاموش رہنا بہتر ہے لہٰذا تجھے خاموش ہو جانا چاہیئے۔

۵ ہم نشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں ۔ ۔ ۔

وضاحت

حضرت علامہ اقبال اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اے میرے ساتھی میں مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کے پیغامِ توحید کا بوجھ اٹھانے والا ہوں۔ توحید کی سچائی اور صداقت پر میں ازل سے ایک سچے گواہ کی حیثیت سے رکھتا ہوں۔ یہ تصورِ توحید ہی ہے جس کی وجہ سے اِس کائنات کی ایک ایک چیز میں گرمی اور حرارت موجود ہے اور مسلمانوں کے خیالات میں بھی تصورِ توحید ہی کی بدولت جرأت و ہمت پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا محض اس صداقت یعنی توحید کے لیے پیدا کی اور مسلمانوں کو اِس صداقت کی حفاظت کے لئے پیدا کیا۔ یعنی اگر مسلمان تصورِ توحید کے محافظ کی حیثیت سے زندگی نہیں گذارتا تو اس کا مسلمان ہونا مشکوک ہے اور اس کا عدم و وجود برابر ہے۔ یہ صرف مسلمان تھے جنھوں نے دنیا میں باطل کی پرستش کا خاتمہ کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو سچی بات یہ ہے کہ میں زندگی کی عزت اور نام و ننگ کی حفاظت کرنے والا قرار پاتا ہوں۔ میرا وجود اس پوری کائنات کی عریانی اور ننگے پن کے لیے لباس کا کام کرتا ہے یعنی میں دنیا کے عیوب چھپاتا اور اس کی تزئین و آرائش کرتا ہوں۔ اس طرح دیکھا جائے تو دنیا سے مسلمانوں کا خاتمہ دراصل پوری نسلِ انسانی کی رسوائی اور بدنامی کا سبب بنے گا۔ اِس لحاظ سے میری رائے یہ ہے کہ مسلمان پوری دنیا کی قسمت کے روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس تارے کی چمک دمک کا یہ عالم ہے کہ صبح کا جادو بھی اِس کے سامنے شرمندہ و نادم ہے۔ میری آنکھوں پر زندگی کے تمام راز ظاہر ہیں۔ لہٰذا میں اُن لوگوں میں شامل نہیں ہوں جو زندگی کی جنگ سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مسلمان زوال کا شکار ہو گئے ہیں تو یہ منظر مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ مجھے اپنی قوم کی تقدیر پر پورا بھروسہ ہے۔ میری دنیا مایوسی کے عناصر سے بالکل پاک ہے۔ جنگ کا جوش و خروش اور ولولہ مکمل فتح کی نوید دے رہا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ میں گذشتہ زمانے کے تصور میں کھویا ہوا ہوں اور مسلمانوں کو پرانے زمانے کی کہانیاں سناتا رہتا ہوں۔ دراصل گذرے ہوئے زمانے کی یاد میری خاک کے لیے اکسیر کا اثر رکھتی ہے۔ میرا ماضی میرے مستقبل کی تصویر دکھا رہا ہے یعنی حال بیشک مایوس کن ہے لیکن مستقبل میں ہمیں پھر ماضی جیسا عروج حاصل ہو گا۔ میں ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کے خوشی و مسرت بڑھانے والے ماضی کو رکھتا ہوں اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کی جھلکیاں دیکھتا رہتا ہوں۔

حضورِ رسالت مآبؐ میں

(۱۹۷)

تعارف

علامہ اقبال نے یہ نظم ترکوں کے لیے مالی امداد حاصل کرنے کے لئے منعقد کئے گئے ، ایک جلسے میں پڑھی تھی - یہ جلسہ ۹ ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو شاہی مسجد لاہور میں منعقد ہوا تھا یہ نظم پہلی مرتبہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کے روزنامہ زمیندار لاہور میں شائع ہوئی - پھر اکتوبر ۱۹۱۱ء کے ماہنامہ مخزن میں شائع ہوئی - اور تیسری دفعہ اس کی اشاعت نومبر ۱۹۱۱ء کے کشمیری میگزین میں عمل میں آئی -

نظر ثانی میں اِس نظم کا صرف ایک شعر قلمزد کیا گیا جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں درج ہے -

حلِ لُغات

گراں : بھاری ، ناقابلِ برداشت ، تکلیف دہ ؛ رخت : لباس ، ساز و سامان ؛ نظامِ کہنہ عالم : دنیا کا پرانا نظام ؛ گرمیٔ نوا : آواز کی حرارت ، شاعری ؛ گداز : پگھلی ہوئی ؛ جامِ ولا : محبت کا پیالہ ؛ فتادگی : عاجزی ، انکساری ، خاکساری ، گر پڑنے کی کیفیت ؛ ملائک : ملک کی جمع ، فرشتے ؛ آسودگی : آرام ، چین ؛ ریاض : باغ ؛

ع گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا - - -

وضاحت

جب دنیا کے ہنگامے اور رونقیں میرے لئے ناقابلِ برداشت اور تکلیف دہ ہوگئیں تو تُو اپنا ضروری ساز و سامان باندھ کر سفر پر روانہ ہو گیا - یہ سچ ہے کہ میں نے اس دنیا میں جہاں زندگی صبح و شام کی قید سے عبارت ہے ، ایک مدت تک قیام ضرور کیا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس دنیا کے پرانے نظام سے مانوس اور واقف نہ ہوسکا -

میں سفر پر روانہ ہوا تو فرشتوں نے میری رہنمائی کی اور مجھے آنحضرتؐ کی محفل میں لے گئے اور مجھے سرورِ کائنات کی بارگاہ میں پیش کر دیا -

ے کہہ حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز

وضاحت

آنحضرتؐ نے مجھے دیکھا تو فرمانے لگے کہ اے حجاز کے باغ کے بلبل تیری شاعری سے اس باغ کی ایک ایک کلی یعنی ملتِ اسلامیہ کے ایک ایک فرد کا دل پگھل گیا ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو تو نے انجام دیا۔ تیرا دل اس بیلے کی مانند ہے جو محبت کی شراب کے نشے میں مست ہے۔ تیری خاکساری اور انکساری سجدوں کے لئے باعثِ رشک ہے۔ جب تو دنیا سے تنگ آکر وہاں کی پستی سے آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑنے کے لئے تیار ہوا تو فرشتوں نے تجھے بلند پروازی سکھائی۔ جس کی وجہ سے تو دنیا کے باغ سے خوشبو کی طرح اڑکر یہاں تک پہنچا۔ لیکن ذرا یہ تو بتا کہ اپنی دنیا سے آتے ہوئے تو ہمارے لئے کیا تحفہ لے کر آیا ہے ؟

ے حضورؐ ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی ۔ ۔ ۔

وضاحت

تحفہ کے متعلق سوال پر اقبال آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں آرام وسکون نصیب نہیں ہوتا ۔ انسان کو جس زندگی کی تلاش ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی ۔ بیشک زندگی کے باغ میں ہزاروں طرح کے پھول موجود ہیں لیکن وفا کا سلیقہ رکھنے والی ایک بھی کلی نہیں ۔ اس کے باوجود میں آپؐ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک پیالہ لایا ہوں اور اس میں جو چیز موجود ہے وہ ایسی نایاب ہے کہ جنت میں بھی نہیں ملتی ۔

اِس برتن کو دیکھئے اس میں طرابلس کے شہیدوں کا خون ہے اور اس اعتبار سے یہ تیری امت یعنی مسلمانوں کی عزت و آبرو اور توقیر کی جھلک پیش کرتا ہے ۔

واضح رہے کہ طرابلس یعنی موجودہ لیبیا ایک زمانے میں ترکی کا حصہ تھا۔ اس پر اٹلی نے حملہ کر دیا۔ بدقسمتی سے ترکوں کی بحری قوت محدود تھی جس کے باعث وہ لیبیا تک نہیں جا سکتے تھے ۔ مصر کے راستے جا سکتے تھے لیکن مصر پر انگریزوں کے اثر و رسوخ نے ترکوں کا یہ راستہ بھی بند کر دیا۔ ایسے میں انور پاشا اور اُن جیسے ہزاروں جیالے ترک مصائب اٹھا کر مختلف راستوں سے لیبیا پہنچے اور اس خطے کو اطالوی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی ۔ یہ نظم انہی شہیدوں کے لیے خراجِ عقیدت کے طور پر لکھی گئی تھی ۔

شفاخانۂ حجاز

(۱۹۸)

تعارف

ایک دفعہ سعودی عرب میں انگریزوں کی طرف سے ایک ہسپتال قائم کرنے کی تجویز پیش ہوئی جس کے لئے امدادی رقوم درکار تھیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی مجوزہ ہسپتال کے لئے چندہ کیا گیا۔ لیکن بعض اکابر جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ انگریزوں کے زیر اثر اس طرح کے کسی بھی کام کے خلاف تھے۔ لہٰذا اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور یہ تجویز پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ مطالب بانگِ درا میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ تجویز کے التواء میں اس نظم نے بھی موثر اور اہم کردار ادا کیا تھا۔ نظم کے اِس پس منظر اور خود اس تجویز کے بارے میں علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت نظم کے بعض مصرعوں سے بھی ہو جاتی ہے۔

حل لغات

پیشوا: رہنما، لیڈر ؛ جدہ: سعودی عرب کا شہر اور بڑی مشہور بندرگاہ ؛ شفاخانہ: ہسپتال ؛ حوالی: نزدیک، گردوپیش ؛ بطحیٰ: مراد ہے مکہ معظمہ ؛ تلخیٔ اجل: موت کا زہر ؛ مسیحا: علاج کرنے والا، حضرت عیسٰی ؛

اِک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا ۔ ۔ ۔

وضاحت

قوم کے ایک رہنما نے اقبال کو کہا کہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں ایک ہسپتال کھلنے والا ہے۔ جب تو کسی شخص سے سرزمین حجاز کا ذکر سنتا ہے تو اس سرزمین سے اپنے عشق شدید کے باعث تیرے جسم کا ایک ایک ذرہ بے قرار ہونے لگتا ہے۔ اب میں اسی سرزمین کا ذکر کر رہا ہوں تو تجھے چاہیئے کہ اپنے جنون اور دیوانگی کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا یعنی اس ہسپتال کے لئے تو بھی چندہ دے اور تجھے تو یہ چندہ اِس لیے بھی دینا چاہیئے کہ تو دنیا میں حجاز کے شیدائی اور عاشق کی حیثیت سے مشہور ہے اور یہ کام حجاز کی بھلائی اور بہتری کے لیے ہو رہا ہے۔ تمہیں خود اس بات کا اندازہ ہوگا کہ مکہ معظمہ کے گرد و نواح میں ایک ہسپتال بہت ضروری ہے تاکہ یہاں کے تمام مریضوں تک ڈاکٹروں کا ہاتھ پہنچ سکے۔

اِس بند کا آخری مصرع بہت بلیغ ہے۔ پنجۂ عیسٰی سے مراد ڈاکٹر، معالج اور حکیم بھی ہے

لیکن اِس سے مراد عیسائیوں کا اثر و رسوخ اور ان کی چیرہ دستیاں بھی ہیں ۔ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے عیسائیوں کی کوششوں سے کھُلنے والے شفاخانے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے یعنی یہاں کے مسلمان عیسائیوں کے ممنونِ احسان ہوں گے جس کے باعث عیسائیوں کا اثر و رسوخ بڑھے گا ۔ وہ یہاں کی معاشرت و سیاست میں دخیل ہوں گے اور رفتہ رفتہ حجاز کے مسلمان اُن کی چالوں میں آکر اپنی عزت و آزادی کھو دیں گے ۔

۵ مَیں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات ـ ـ ـ ـ

وضاحت قوم کے اس رہنما کی بات سُن کر کہا کہ جس چیز کو موت کہا جاتا ہے دراصل وہ بھی زندگی ہی ہے ۔ بالکل اِسی طرح جس طرح حجاز میں حقیقت چھپی ہوتی ہے ۔ ایک عاشق کو موت کے زہر سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ چیز حضرتِ خضر کو اپنی بہت طویل عمر میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ آپ زندگی کا یہ پیغام میری بجائے دوسرے لوگوں کو دیں ۔ ہم جیسے سرزمین عرب کے عاشق تو اِس سرزمین میں موت کی خواہش کرتے ہیں ۔

آپ میرے پاس شفا کا یہ کیسا پیغام لے کر آئے ہیں ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دل میں درد رکھنے والے لوگ معالجوں سے سروکار نہیں رکھا کرتے ۔ انھیں تو درد اور تکلیف ہی سے لطف حاصل ہوتا ہے ۔

اِس بند کا آخری مصرع پہلے بند کے آخری مصرع جیسا تو نہیں لیکن لفظ "مسیحا" سے یہاں پر بھی عیسائیوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ۔

جوابِ شکوہ

(۱۹۹)

تعارف نظم 'جوابِ شکوہ' دراصل نظم 'شکوہ' کے جواب کی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ نظم مسدس ہیئت کے چھتیس بندوں پر مشتمل ہے ۔ نسیم امروہوی فرہنگ اقبال میں لکھتے ہیں کہ اقبال نے اسے جنگ بلقان کے دوران (۱۹۱۲ء میں) موچی دروازہ باغ

کے ایک جلسہ عام میں پڑھا۔ لیکن اِس جلسے اور نظم پڑھے جانے کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر اور رفیع الدین ہاشمی ۱۹۱۳ء کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر مطالبِ بانگِ درا میں لکھتے ہیں۔

"یہ نظم ۱۹۱۳ء کے ایک جلسہ عام میں پڑھی گئی جو موچی دروازہ کے باہر بعد نمازِ مغرب منعقد ہوا تھا"

اِسی طرح ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی "اقبال کی طویل نظمیں" میں نظم کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ ۱۹۱۳ء کے ایک جلسہ عام میں پڑھی گئی جو نمازِ مغرب کے بعد بیرون موچی دروازہ منعقد ہوا تھا"

نظرِ ثانی میں اِس نظم کے کچھ بندوں کی ترتیب بدل دی گئی جبکہ چار بند حذف کر دیئے گئے جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں دیئے گئے ہیں۔

حلِ لغات

قدسی الاصل: اپنی حقیقت کے اعتبار سے پاکیزہ ؛ **پیرِ گردوں**: بوڑھا آسمان ؛ **رضواں**: روایات کے مطابق جنت کے دروازے پر پہرہ دینے والا داروغہ ؛ **تگ و تاز**: رسائی، کوشش ؛ **سکانِ زمیں**: زمین پر رہنے والے۔ **برہم**: ناراض ؛ **مسجودِ ملائک**: وہ ہستی جسے فرشتوں نے سجدہ کیا یعنی انسان ؛ **عالمِ کیف**: اشیاء کے خواص اور کیفیتیں جاننے والا ؛ **دانائے رموزِ کم**: کمیت و مقدار کے رازوں سے واقف ؛ **عجز**: انکساری ؛ **نامحرم**: ناواقف ؛ **آسماں گیر**: آسمان تک پہنچنے والا ؛ **گِل**: مٹی ؛ **شانِ کئی**: ایران کے قدیم بادشاہوں کے ایک خاندان جیسی شان و شوکت۔ ان بادشاہوں کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے نام سے پہلے لفظ "کے" آتا تھا جیسے کیخسرو اور کیقباد ؛ **الحاد**: کفر ؛ **خوگر**: عادی ؛ **آزر**: بعض روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے والد اور بعض روایات کے مطابق حضرت ابراہیم کے چچا تھے۔ یہ اپنی قوم کے بت گر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ؛ **بادہ آشام**: شراب پینے والے ؛ **مایۂ رعنائی**: باعثِ فخر ؛ **نازش**: باعثِ رشک و قابلِ فخر ؛ **ہرجائی**: بے وفا، ہر جگہ موجود رہنے والا ؛ **یکجائی**: کسی ایک جگہ موجود رہنے والا ؛ **اسلاف**: بزرگ ؛ **مدفن**: مزار، قبر ؛ **نکونام**: نیک نام ؛ **فردا**: آنے والی کل، مستقبل ؛ **فاطر**: پیدا کرنے والا ؛ **منفعت**: فائدہ، نفع ؛ **تارک**: ترک کرنے والا، چھوڑ دینے والا ؛ **طرزِ سلف**: بزرگوں کی روش اور طریقہ ؛ **ملتِ بیضا**: مراد مسلمان ؛ جنہیں ملت بیضا اِس لئے کہا جاتا ہے کہ ایک روایت کے

مطابق قیامت کے دن تمام نمازی مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ روشن ہوں گے، شعلہ مقامی: گرمادینے والی گفتگو، نابود: ختم، وضع: ظاہری اطوار، نصاریٰ: عیسائی، ہنود: ہندو کی جمع، لوث: لالچ، خطابیں: دوسرے کے گناہوں سے متعلق تجسس میں مبتلا رہنے والے، اوج: بلندی، ثریا: چھ چھوٹے چھوٹے ستاروں کا جھرمٹ جو آسمان پر بہت بلندی پر واقع ہے، فغفور: چین کے بادشاہوں کا لقب، سریر: تخت، کے: ایران کے ایک شاہی خاندان کا لقب، حمیت: غیرت، شیوہ: طریقہ، غیور: غیرت مند، مہجور: جدا، بادیہ پیما: جنگل جنگل گھومنے والا، جور: ظلم، بیداد: ظلم دستم، امین: محفوظ، شعلہ بہ پیراہن: جس کے لباس میں آگ لگی ہو یعنی جلنے اور تباہ ہونے کے لیے تیار، کوکب: ستارہ، گل برانداز: پھول برسانے والی، ثمر چیدہ: پھول چننے والا، انعام پانے والا، کامیاب، کامران، کاہیدہ: کمزور اور سوکھے ہوئے، بالیدہ: پلے بڑھے ہوئے، تر و تازہ، برومندی: پھلنا پھولنا، کنعان: وہ علاقہ جہاں حضرت یعقوب رہتے تھے اور جہاں حضرت یوسفؑ پیدا ہوئے، بانگ درا: گھنٹی کی آواز، یورشِ تاتار: تاتاری لشکروں کے حملے، یورش بلغاری: بلغاریہ کا حملہ، صہیل فرسِ اعدا: دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ، امکاں: اس دنیا کو عالم امکاں کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں پر کسی بھی ملے کچھ بھی وقوع پذیر ہونا ممکن ہے، رخت: لباس، سازو سامانِ سفر، تنک مایہ: معمولی، استادہ: کھڑا ہوا، تپش آمادہ: حرارت رکھنے والی، متحرک، رفعنا لک ذکرک: ہم نے تیرا ذکر بہت بلند کیا، سورۃ الم نشرح کی طرف اشارہ ہے جس میں آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خوشخبری دی گئی، مردمِ چشم زمیں: زمین کی آنکھ کی پتلی یعنی افریقہ، پروردہ: پالی ہوئی، تپش اندوز: حرارت جمع کرنے والی، سپر: ڈھال، ماسوا اللہ: دنیا میں اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے یعنی باطل، لوح: تختی

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — — — —

وضاحت

نظم جواب شکوہ کے پہلے بند میں علامہ اقبال اپنی نظم شکوہ، کی اثر انگیزی کا ذکر کرتے ہیں۔ اولین بند میں وہ ایک اصولی بات کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلے اور خلوص سے کہی جاتے وہ اپنی تاثیر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ گو اس بات کے پر نہیں ہوتے کہ وہ پرواز کرکے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچ سکے اس کے باوجود اس میں اڑنے اور پرواز کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ دلوں سے نکلنے والی بات

جس کی اصل اور بنیاد پاک ہو ہمیشہ بلندی کی طرف نگاہ رکھتی ہے اور خاک یعنی انتہائی پستی سے اٹھنے کے باوجود آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔

چونکہ میرا جذبۂ عشق بھی مخلص، فتنے پیدا کرنے والا اور باغی و تند و تیز تھا۔ لہذا اس عشق کی وجہ سے میرے لبوں تک آنے والا نالہ آسمان چیر کر اللہ تعالیٰ تک پہنچ گیا۔

پیرِ گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی ـــ ـــ ـــ ـــ

وضاحت میرا شکوہ عرش تک پہنچنے کے لئے آسمان کے قریب سے گذرا تو اسے آسمان اور چاند ستاروں نے بھی سنا۔ بوڑھے آسمان نے یہ نالہ سُنا تو کہا کہ کہیں قریب ہی کوئی شخص موجود ہے اور فریاد کر رہا ہے۔ سیارے بولے کہ یہ فریاد کرنے والا یقیناً عرش کا باشندہ ہے۔ چاند نے یہ نالہ سنا تو کہا کہ نہیں مجھے لگتا ہے کہ نالہ و زاری زمین پہ رہنے والا انسان کر رہا ہے۔ کہکشاں کہہ رہی تھی کہ یہ فریاد کرنے والا ہمارے ارد گرد ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ گویا یہ تمام چیزیں فریاد کرنے والے کا صحیح سراغ نہیں لگا سکیں۔ البتہ میرے شکوے کو اگر کسی نے سمجھا تو وہ رضواں داروغہ جنت تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ شکوہ شکایت کرنے والا شخص وہی انسان ہے جو پہلے جنت میں رہتا تھا اور جہاں سے نکال دیا گیا تھا۔

اِس بند میں لطف یہ ہے کہ انسان کا سراغ لگانے والوں میں چاند اور رضواں شامل ہے چاند پوری کائنات کے مقابلے میں زمین سے قریب ترین سیارہ ہے اور انسان کا پڑوسی ہے۔ جب کہ رضوان نے اسلامی مذہبی روایات کے مطابق ایک طویل مدت انسان کے ساتھ گذاری ہے اور وہ بھی اس کی صلاحیتوں سے واقف ہے۔

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا ـــ ـــ ـــ ـــ

وضاحت میرا نالہ سن کر فرشتے بھی حیران تھے کہ آخر یہ کیسی آواز ہے؟ آخر یہ کیسا راز ہے جو عرش کے رہنے والوں پر بھی نہیں کھل رہا۔ فرشتے حیران تھے کہ کیا انسان کی رسائی عرش تک بھی ممکن ہے اور خاک کی چٹکی یعنی انسان بھی اتنی بلند پرواز کا اہل ہو گیا ہے کہ اس کی آواز اور نالے عرش تک پہنچ سکیں۔

کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ یہ زمین پر سکونت اختیار کرنے والے انسان آداب سے کس قدر ناواقف ہیں اور زمین کی بستی میں رہنے والے یہ لوگ کتنے شوخ اور گستاخ ہیں۔

؎ اِس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے — — —

وضاحت فرشتے انسان کی شوخی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اتنے شوخ کہ اللہ تعالیٰ سے بھی اپنی خفگی اور ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ گیا یہ نالہ و فریاد اور شکوہ و شکایت کرنے والا وہی انسان ہے جسے فرشتوں جیسی اطاعت گزار اور فرمابردار مخلوق نے سجدہ کیا تھا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اشیاء کی کیفیت اور اُن کے خواص جانتا ہے اس طرح وہ مختلف چیزوں کی مقدار اور ہیئت کے رازوں سے بھی واقف ہے لیکن اپنی اس ساری علمیت اور دانائی کے باوجود یہ عاجزی، انکساری اور خاکساری کے رازوں سے بالکل واقف نہیں۔

انسان کو اپنی طاقت اور بات کرنے کی صلاحیت پر اِتراتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ناسمجھ لوگ تو گفتگو کرنے کے سلیقے اور آداب سے بھی واقف نہیں۔

اس بند کے تیسرے مصرع میں ایک تلمیح ہے جب فرشتوں نے انسان کی عظمت کا سبب جاننا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے کچھ چیزیں رکھیں اور ان چیزوں کے نام اور خواص کے بارے میں فرشتوں سے سوال کیا۔ فرشتے کوئی جواب نہ دے سکے۔ لیکن جب یہی سوال انسان سے کیا گیا تو انسان نے ان تمام چیزوں کے نام بھی بتائے اور خواص بھی اور یوں فرشتوں پر انسان کی برتری ثابت ہوگئی۔ مصرعے میں اِس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

؎ آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ تیرا — — —

وضاحت فرشتوں کی گفتگو جاری تھی کہ ایک آواز آئی جو یقیناً خدا کی آواز تھی۔ اللہ تعالےٰ نے اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تیری کہانی غم بڑھانے والی ہے اور تیرا پیمانہ بے چین آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ تیرا مست نالہ آسمان تک آ پہنچا۔ ہمیں حیرت ہے کہ تیرا دیوانہ دل کس قدر شوخ ہے۔

تو نے اپنے کلام کی خوبی سے شکایت کو بھی شکر بنا دیا اور تو نے اپنے کلام کے ذریعے انسانوں کی خدا سے گفتگو کرا دی۔

؎ ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں — — —

وضاحت تو نے اپنے شکوے میں اِس بات کا رونا رویا ہے کہ اب میں مسلمانوں پر مہربان نہیں رہا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں تو اسی طرح کرم اور مہربانی کرنے پر آمادہ ہوں لیکن کوئی اِس مہربانی کے لئے سوال کرنے والا نہیں۔ راہ اسی کو دکھائی جاتی ہے جو راستہ چل رہا ہو۔

لیکن یہاں تو کوئی راستہ چلنے والا ہی نہیں ہے ایسے میں راستہ کسے دکھایا جائے۔ لوگوں کی تربیت کرنے کے تمام وسائل اب بھی موجود ہیں لیکن کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اس تربیت سے فائدہ اٹھا سکے سو اصل اب وہ مٹی ہی نا پید ہو چکی ہے جس کو صحیح معنوں میں آدم کی تعمیر و تخلیق کرنے کے کام میں لایا جا سکے۔ یعنی اب مسلمان اپنے حقیقی جوہر سے محروم ہو چکے ہیں۔

اگر کوئی ذرا بھی قابلیت کا مظاہرہ کرے تو ہم آج بھی اُسے مشہور ایرانی بادشاہوں جیسی شان و شوکت عطا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کوئی اپنے گھر سے سچی طلب لے کر کچھ لے کر ڈھونڈنے نکلے تو ہم اُسے آج بھی مراد دکھا سکتے ہیں (آخری مصرع میں غالباً کولمبس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انگلستان سے ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے نکلا تھا۔ اُسے ہندوستان تو نہ مل سکا البتہ وہ اپنی سچی طلب کے باعث امریکہ جا پہنچا جو برطانیہ کے لیے بہت مفید نو آبادی ثابت ہوا۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں ۔۔۔۔

وضاحت آج کل مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں عمل کرنے اور اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کی قوت ہی نہیں رہی اور ان کے دل کفر و الحاد کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان مسلمانوں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تو اپنے رسولؐ کے لیے بھی رسوائی اور بدنامی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جو بت توڑا کرتے تھے اور دنیا میں اللہ کی وحدانیت کا پیغام عام کرنے کا فرض ادا کرتے تھے، اب اس دنیا میں نہیں رہے البتہ جو ہیں وہ اپنے عمل کے حوالے سے بت شکنی کی بجائے بت تراش بن چکے ہیں۔ بیشک ان کے آباء و اجداد نے حضرت ابراہیم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوتے بت شکنی کی لیکن ان بزرگوں کی اولاد آزر کا طریقہ اپنائے ہوئے ہے اور بت تراشی کر رہی ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید اب دنیا میں پرانے شراب نوش باقی نہیں رہے بلکہ شراب پینے والے بھی نئے ہیں اور آلات مے نوشی بھی نئے آگئے ہیں مسلمانوں نے اللہ کے کعبے کو فراموش کر دیا اور اپنے لئے نیا کعبہ بنا لیا۔ اس کعبے میں نت نئے بت سجا لیئے۔ اس کے علاوہ تم مسلمان بھی وہ نہیں رہے جو ماضی میں تھے۔ علامات کے ذریعے علامہ اقبال نے موجودہ عہد کے مسلمانوں کی بدلی ہوئی حالت کا نقشہ بہترین الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا ۔۔۔۔

وضاحت ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ مسلمان میری ہی ذات کو باعث فخر تصور کرتے

تھے ۔ بہار کے موسم میں کھلنے والے دیگر تمام پھولوں کے مقابلے میں صحرا میں اُگنے والا لالہ ہی ہر مسلمان کے لیے باعثِ فخر تھا ۔ دنیا میں جو بھی مسلمان تھا وہ کائنات کی ہر چیز کے مقابلے میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا دیوانہ تھا ۔ آج تم اللہ کو بے وفا اور ہرجائی کہہ رہے ہو ایک زمانہ تھا کہ یہی ہرجائی تمہارا محبوب تھا ۔

لیکن اب تم اللہ تعالیٰ کی اِس صفت سے بدظنی کا اظہار کرتے ہو ۔ چلو یونہی سہی اب ہر جگہ پائے جانے والے خدا کو چھوڑ کر کسی ایک جگہ موجود رہنے والے خدا سے غلامی کا عہد باندھ لو اور یوں آنحضرتؐ کی نبوت کو بھی پوری کائنات اور پوری انسانیت کے لئے ماننے کی بجائے کسی ایک مقام سے وابستہ کر لو ۔

نظم شکوہ میں علامہ اقبال نے اللہ تعالیٰ کو ہرجائی کہہ کر گویا طنز کیا تھا ۔ یہاں پر ہرجائی کے لغوی معنی واضح کر کے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے اور اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آنحضرتؐ کی نبوت تمام مقامات اور تمام زمانوں کے لئے ہے ۔ اسے کسی خاص مقام اور زمانے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا ۔

ے کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت تم نے میری شکایت تو کی لیکن ذرا خود بھی غور کرو کہ آج کل مسلمانوں کیلئے صبح کی نمازِ فجر کی ادائیگی اور اس کے لئے بیدار ہونا کس قدر ناگوار اور تکلیف دہ ہے ۔ اِس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ہم سے نہیں بلکہ اپنی نیند سے پیار ہے ۔ ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد طبیعت پر روزہ رکھنے کی بندش کتنی گراں ہے یعنی اب لوگ روزے بھی نہیں رکھتے اس سے اندازہ کر لو اور سچ سچ بتاؤ کہ کیا وفاداری کا طریقہ یہی ہے ۔

مسلمان یہ بات بھول گئے ہیں کہ قوم محض مذہبی رشتے سے وجود میں آتی ہے ۔ اگر مذہب کی طاقت کو ختم کر دیا جائے تو پھر مسلمان بھی باقی نہیں رہ سکیں گے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ مذہب کا رشتہ تمہیں ایک دوسرے سے محبت کرنا سکھاتا ہے ۔ اگر مذہبی حوالے سے یہ محبت باقی نہ رہے تو بحیثیت مسلمان تمہارا وجود بھی باقی نہیں رہے گا ۔ بالکل اِسی طرح جیسے ستاروں کی محفل محض کشش ثقل کی وجہ سے قائم ہے اگر یہ کشش نہ ہو تو ستاروں کی یہ محفل ایک لمحہ میں اجڑ جائے ۔

ے جنکو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو ۔ ۔ ۔

وضاحت تم اپنی حالت پر غور کرو ، دیگر قوموں کے مقابلے میں مسلمان واحد قوم ہیں

جنھیں کوئی فن اور ہنر نہیں آتا۔ دنیا کی تمام قومیں اپنے اچھے بُرے کی فکر کرتی ہیں لیکن یہ مسلمان ہیں جن کو اپنے گھر کے اجڑنے اور اس کے تباہ و برباد ہونے کی چنداں فکر نہیں ہے۔ تمھاری مثال ایسے کھلیان کی ہے جس میں بجلیاں آرام کر رہی ہوں اور کسی بھی وقت کھلیان کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہوں تم اُن لوگوں میں سے ہو جو اپنے بزرگوں کی قبروں تک کو بیچ کر کھا جاتے ہیں۔

ذرا غور کرو جب تم اپنے آباؤ اجداد کی قبریں بیچ کر نیک نامی اور شہرت حاصل کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تو ایسی صورت میں اگر تمھیں پتھر کے بت مل جائیں تو تم انھیں فروخت کرنے سے ہچکچاؤ گے ؟

؎ صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے ۔ ۔ ۔

وضاحت نظم شکوہ میں اقبال نے کہا تھا کہ مسلمانوں نے دنیا سے باطل کا نام و نشان مٹا دیا۔ انسانوں کو غلامی سے نجات دلوائی۔ کعبے کو اپنے سجدوں سے آباد کیا، اللہ کے قرآن کو سینے سے لگایا لیکن اس کا صلہ ہمیں ذلت و خواری کی صورت میں مل رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ جواب دیتے ہیں کہ یہ سب کام کس نے کئے؟ یہ کارنامے تمھارے بزرگوں نے انجام دیئے تھے اور انھوں نے اس کا صلہ بھی پایا۔ اُن کے مقابلے میں تم اپنی حالت پر غور کرو۔ تم اُن سے بہت مختلف ہو، مثلاً یہی دیکھ لو کہ وہ سراپا عمل تھے لیکن تم بڑے مزے سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے مستقبل کے منتظر ہو اور آپ اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔

؎ کیا کہا ؛ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور ۔ ۔ ۔

وضاحت تم کہتے ہو کہ کافروں کو دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہیں جب کہ مسلمانوں کو اللہ تعالےٰ نے صرف جنت اور حوروں کے وعدے پر ٹرخا رکھا ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر غلط شکایت بھی کی جائے تو اُس کے لیے عقل و شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ کائنات کو پیدا کرنے والی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور تو عدل و انصاف ہے اور عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کافر مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کر لیں تو حور و قصور انھیں دے دی جائے۔

مَیں تو سمجھتا ہوں کہ تم میں کوئی حوروں کا خواہاں ہی نہیں ہے اور تم محض شکایتیں کرتے ہو جبکہ شکایت کی حقیقت اِس سے واضح ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوہِ طور پر اپنی تجلیات دکھانے کا اہتمام تو آج بھی موجود ہے لیکن کوئی موسیٰؑ موجود نہیں جو کوہِ طور پر پہنچے اور ان تجلیات کا طالب ہو۔

ے منفعت ایک ہے اِس قوم کی نقصان بھی ایک ۔ ۔ ۔

وضاحت مسلمان قوم کا نفع بھی ایک ہے اور نقصان بھی ایک ہی ہے ۔یعنی اگر مسلمان قوم ترقی کرے گی تو تمام افراد اِس سے مستفید ہوں گے اور اگر بحیثیت ملت انھیں کوئی نقصان ہوگا تو اس خسارے میں بھی ہر فرد شریک ہوگا۔ سب کا نبی بھی ایک ہی ہے اور دین و ایمان بھی ایک ہی ہے ۔ سب لوگ کعبے ہی کی طرف سجدہ کرتے ہیں ۔ سب ایک اللہ کو مانتے ہیں ۔ ایک ہی قرآن پر یقین رکھتے ہیں ۔ اِس کے باوجود مسلمان گروہ در گروہ بٹے ہوئے ہیں ۔ حالانکہ ان کا اتحاد و اتفاق کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ۔

مسلمانوں کو دیکھئے کہ کہیں یہ فرقوں کی وجہ سے اور کہیں ذات برادری کے غیر اسلامی طریقِ کار کی وجہ سے تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں ۔ غور کرو کیا دنیا میں پنپنے اور پروان چڑھنے کا یہی طریقہ ہے اور کیا ترقی اسی طرح ہو سکتی ہے ؟

ے کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار ۔ ۔ ۔

وضاحت وہ کون ہے جس نے کائنات پر ہر طرح کا اختیار رکھنے والے رسولؐ کے دیئے ہوئے دستور کو ترک کر دیا ہے ۔ کون ہے جو اچھائی برائی کی بجائے محض وقتی فائدے اور نقصان یا مصلحت کی بنیاد پر عمل کرتا ہے ۔ کون ہے جس نے اپنی تہذیب و تمدن کو خیر باد کہہ کر غیروں کی روش کو اختیار کر لیا ہے ؟ کس کی نگاہیں ہیں جو اپنے بزرگوں کے طریقے سے بیزار اور متنفر ہو چکی ہیں ؟ ظاہر ہے کہ یہ تمام خامیاں مسلمانوں میں موجود ہیں ۔

آج مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ نہ اُن کے دلوں میں تڑپ ہے اور نہ ان کی روحوں میں نیک و بد کا احساس باقی رہا ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے انھیں آنحضرتؐ کے پیغام یعنی اسلام کی عزت و عظمت اور حرمت کا سرے سے کوئی خیال ہی نہ ہو ۔

ے جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب ۔ ۔ ۔

وضاحت مسجدوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر صرف غریب نماز ادا کرنے کے لیے آتے ہیں ۔ روزے کی تکلیف بھی صرف غریب اٹھاتے ہیں ۔ اگر کوئی خدا کو یاد کرتا ہے تو بھی صرف غریب ۔ اور اگر کسی نے اپنے عمل سے پوری ملتِ اسلام کا بھرم رکھا ہے تو صرف غریبوں نے ۔

امیر لوگ تو دولت کے نشے میں میری ذات اور میرے احکام سے غفلت برتنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس صورت میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ صرف اور صرف غریبوں کی وجہ سے زندہ ہے۔

ے واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی ۔ ۔ ۔

وضاحت قوم میں وعظ و تلقین کرنے والوں کے خیالات میں پختگی نہیں رہی۔ ان کی طبیعتوں میں بجلی کی سی تڑپ موجود نہیں۔ گفتگو میں تاثیر اور جلا دینے کی صلاحیت نہیں۔ یہ لوگ بیشک اب بھی اذان دیتے ہیں لیکن اذان بس ایک رسم کی حیثیت سے باقی رہ گئی ہے ورنہ اس میں حضرت بلالؓ جیسی روح موجود نہیں یعنی اذان دینے کے عمل میں خلوص باقی نہیں ہے۔ آج کل فلسفہ تو موجود ہے لیکن حضرت امام غزالی کی طرح دین کو فلسفے اور فلسفے کو دین کی روشنی میں دیکھ کر حق و صداقت کا پرچار کرنے والے نہیں ہیں۔

مسجدوں کی حالت دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے نمازیوں کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بیشک مسلمان تو باقی ہیں جنھوں نے یہ مسجدیں تعمیر کر دیں لیکن ان مساجد کو آباد کرنے والے ماضی جیسے مسلمان باقی نہیں رہے۔

ے شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود ۔ ۔ ۔

وضاحت آجکل یہ شور و غلغلہ ہو رہا ہے کہ مسلمان دنیا سے ختم ہو گئے۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کیا دنیا میں کہیں مسلمان موجود بھی تھے۔ موجود ہوں تو فنا ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ جو لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں، ان کو دیکھئے تو وہ اپنی ظاہری شکل و صورت اور لباس کے معاملے میں عیسائیوں کے پیروکار نظر آئیں گے۔ جب کہ اپنے رسم و رواج اور طرزِ معاشرت میں ہندوؤں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو مسلمان کہنا چاہیئے جن کے اعمال سے دنیا کے سب سے برے لوگ یہودی بھی شرمندہ نظر آتے ہیں۔

یہ بات تسلیم کہ تم میں سید بھی ہیں، مرزا بھی ہیں اور افغان بھی ہیں اور تم اپنی ان ذات برادریوں اور علاقائی نسبتوں پر فخر بھی کرتے ہو لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا تم مسلمان بھی ہو۔ یعنی تم میں مسلمانوں کی صفات نظر نہیں آتیں۔

ے دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک ۔ ۔ ۔

وضاحت مسلمان تو وہ تھے جو ہمیشہ بے خوف و خطر سچ بولتے تھے۔ عدل و انصاف کرنے

ہوئے ہر طرح کی رعایات سے پاک رہتے تھے۔ یعنی اپنے اور بیگانے سب کے ساتھ بے لاگ انصاف کرتے تھے۔ مسلمان فطری اور طبعی اعتبار سے اُس درخت کی مثال تھے جس کے لئے حیا نم کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح کوئی درخت نم کے بغیر پھل پھول نہیں سکتا یہی تعلق مسلمانوں اور شرم و حیا میں تھا جبکہ مسلمان اتنا بہادر تھا کہ عقل و شعور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خود کو دوسروں کے غم میں گھلا دینا اس کی شراب کا کیف تھا اور وہ مینا کی طرح ذاتی اغراض سے پاک رہتا تھا۔

واضح رہے کہ اِس بند کے آخری شعر میں قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی عام صفت کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ باہم ایثار سے کام لیتے تھے۔ دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے اور اپنے عمل کو ذاتی مفاد سے آلودہ نہیں کرتے تھے۔ جب کہ پہلے چار مصرعوں میں چاروں خلفائے راشدین کا ذکر آیا ہے یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ جن کی صداقت کی گواہی خود قرآن شریف نے دی۔ حضرت عمر فاروقؓ جن کا عدل و انصاف مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ جن کی حیا اور شرمیلے پن کا ذکر آنحضرتؐ نے فرمایا اور حضرت علیؓ جن کی بہادری اور شجاعت کا منہ بولتا ثبوت غزوۂ خندق اور غزوۂ خیبر کے نتائج ہیں۔ پرلطف بات یہ ہے کہ چاروں مصرعوں کی ترتیب بھی وہی ہے جو خلفائے راشدین کی خلافت کی زمانی ترتیب ہے۔

؎ ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا ۔ ۔ ۔

وضاحت ایک زمانہ تھا کہ ہر مسلمان باطل کے لئے نشتر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر مسلمانوں کی زندگی کو آئینہ قرار دیا جاتے تو اِس آئینے کا حقیقی جوہر صرف اور صرف عمل تھا۔ اسے صرف اپنے بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ تھا یعنی وہ صرف انہی چیزوں کی تمنا کرتا تھا جنھیں اپنی قوت سے حاصل کر سکے۔ تم موت سے ڈرتے ہو لیکن قرنِ اوّل کے مسلمان کو صرف اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔

اِس سے اندازہ لگا لینا چاہیئے کہ آج کا مسلمان اپنے آباء واجداد سے کتنا مختلف ہے جبکہ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جس بیٹے کو اپنے باپ کا علم نہ آتا ہو اور وہ اپنے باپ جیسی صلاحیتیں نہ رکھتا ہو اسے اپنے باپ کے ترکے اور میراث کا حق دار بھی نہیں کہا جا سکتا۔

؎ ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت آجکل ہر مسلمان آرام و سکون کی زندگی چاہتا ہے۔ اور آرام طلبی کی شراب

کے نشے میں مست ہے۔ بھلا غور کرو کیا تم مسلمان کہلانے کے مستحق ہو اور کیا تمھارے انداز و اطوار مسلمانوں جیسے ہیں۔ تم میں نہ تو حضرت علیؓ جیسی فقیری اور درویشی ہے کہ مسلسل فاقوں کے باوجود درِ خیبر اکھاڑنے کی قوت رکھتے تھے اور نہ حضرت عثمانؓ جیسی امیرانہ شان ہے کہ قحط کے زمانے میں بھی اپنے غلے کو منہ مانگے داموں فروخت کرنے کی بجائے مفت تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ کر لینا چاہیئے کہ روحانی اعتبار سے اپنے بزرگوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

انھوں نے دنیا بھر میں صرف اس لئے عزت پائی تھی کہ انھوں نے قرآن شریف کو اپنا رہنما بنایا تھا جب کہ تم قرآن شریف سے روگردانی کے باعث ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے ہو۔

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم ۔ ۔ ۔

وضاحت تم ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے مرنے پر آمادہ رہتے ہو جبکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رحم اور مہربانی کا سلوک روا رکھتے تھے۔ تم خود بھی گناہ کرتے ہو اور دوسروں کی غلطیوں کے بارے میں بھی متجسس رہتے ہو جبکہ وہ دوسروں کی عیب پوشی کرتے تھے۔ یہ خواہش تو ہر شخص کر سکتا ہے کہ اُسے عام زندگی میں ثریا جیسا بلند مقام حاصل ہو۔ لیکن مقام حاصل کرنے کے لئے پہلے اپنے بزرگوں جیسا راست باز دل تو پیدا کر لو۔

یہ سچ ہے کہ چین کے عظیم بادشاہوں کا تخت بھی مسلمانوں کو مل گیا اور ایران کے قدیم بادشاہوں کی حکومت کے وارث بھی مسلمان ہی قرار پائے۔ لیکن تم تو صرف باتیں بنانے ہو۔ لگتا ہے کہ تم میں اپنے بزرگوں جیسی غیرت و حمیت سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ جس کے باعث انھوں نے ساری دنیا کو تسخیر کر لیا تھا۔

خودکشی شیوہ تمھارا وہ غیور و خود دار ۔ ۔ ۔

وضاحت تمھارا طریقہ اور انداز ایسا ہے۔ جسے سراسر خودکشی قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ وہ غیرت مند اور خود دار تھے۔ تم آپس میں بھائی چارے سے گریز کرتے ہو اور وہ بھائی چارے پر جان دیتے تھے۔ تم اوّل تا آخر گفتار ہی گفتار ہو یعنی صرف باتیں بنانا جانتے ہو جبکہ وہ عمل سے اپنے کردار کی تعمیر و تشکیل کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تم ایک ایک کلی اور زندگی کی ایک ایک خوشی کو ترستے ہو جبکہ اُن کی آغوش میں باغ موجود تھے۔

اُن کو اِس دنیا سے گئے ایک مدت گذر گئی لیکن اب تک دنیا کی مختلف قوموں کو اُن کی داستاں یاد ہے اور زندگی کے صفحے پر اُن کی صداقت اور سچائی کے نقوش ثبت ہیں۔

؎ مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت موجودہ عہد کے مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ یہ ستارے کی طرح قوم کے افق پر نمودار ہوئے یعنی کچھ عرصہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ پھر قومی نظریہ وطنیت وغیرہ سے متاثر ہو کر ہندوستان کی محبت میں برہمن بن بیٹھے اور اپنے ملی و مذہبی، تعلقوں کو فراموش کر دیا۔ اُڑنے کے شوق میں اپنے گھر اور گھونسلے سے جدا ہو گئے۔ یعنی اپنی اصل اور حقیقت سے رشتہ منقطع کر لیا۔ پہلے تو نوجوان صرف بے عمل تھے پھر اپنی اصل سے الگ ہو جانے کے باعث دین اور مذہب سے بیزار بھی ہو گئے۔

موجودہ زمانے کی تہذیب نے ان کو ہر پابندی سے آزاد کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کو کعبے سے اٹھایا اور بت خانے کی زینت بنا دیا۔ یعنی یہ لوگ اسلام کے زریں اصول چھوڑ کر غیر اسلامی عقائد و نظریات سے متاثر ہو گئے۔

؎ قیس زحمت کشِ تنہائی صحرا نہ رہے ۔ ۔ ۔

وضاحت آج کل کے نوجوان قیس اور مجنوں ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اب قیس کی طرح صحراؤں کی وسعتوں کی تنہائی میں مشکلات برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے عشق کے ان دعویداروں نے جنگل میں مارے مارے پھرنے کا سلسلہ ختم کر کے اپنے لئے شہروں کی پُر آسائش زندگی کو پسند کر لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہنے لگے کہ دیوانگی کی وجہ سے قیس کو یہ آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ شہر یا صحرا میں سے جہاں اس کا جی چاہے وہیں رہے البتہ لیلیٰ یعنی محبوب کا دیدار کرنے کے سلسلے میں قیس کو جو صعوبت اٹھانا پڑتی ہے، اس کا خاتمہ ضروری ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ لیلیٰ کو بے حجاب کر دیا جائے۔

گویا یہ نوجوان عشق کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور ایسی زندگی بھی چاہتے ہیں جس میں انھیں نہ ظلم کی شکایت کرنا پڑے نہ محبوب کے ستم کا شکوہ۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عشق کی طرح حُسن کو بھی بے حجاب اور آزاد کر دیا جائے۔

؎ عہدِ نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت نیا زمانہ بجلی کی صفات رکھتا ہے اور ہر کھلیان کو پھونک ڈالنا چاہتا ہے۔ اس بجلی سے کوئی صحرا یا کوئی باغ محفوظ نہیں۔ یعنی نئے زمانے کی آگ ہر طرف پھیل رہی ہے۔ جب نئے زمانے کی لگائی ہوئی آگ کے لیے پرانی قومیں ایندھن کا کام

دے رہی ہیں۔ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ نیا زمانہ زمانے کا ساتھ نہ دے سکنے والی اقوام کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے لباس میں بھی شعلے بھڑک رہے ہیں۔

لیکن اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اس لئے کہ اگر آج بھی مسلمانوں میں حضرت ابراہیمؑ جیسا ایمان پیدا ہو جائے تو یہی آگ مسلمانوں کے لیے گلشن کے طور طریقے اختیار کرلے گی۔

ع دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی

وضاحت لیکن اس ابتر صورتحال کے باوجود اے گلشنِ ملت کے مالی تجھے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ بیشک اب یہ چمن اجڑا ہوا نظر آتا ہے لیکن تمام شاخوں پر غنچوں کے ستارے کھلنے والے ہیں۔ اب گلستان گھاس پھونس اور غیر ضروری چیزوں سے پاک ہونے والا ہے اور شہیدوں کے خون کی سرخی اب پھول بکھیر رہی ہے۔

ذرا دیکھ کہ آسماں کا رنگ بھی عنابی ہو رہا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اب مشرقی افق سے سورج نکلنے والا ہے۔ واضح رہے کہ سورج نکلنا زوال و نکبت کے خاتمے اور عروج و ترقی کے آغاز کی طرف اشارہ ہے۔

ع اُمتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں ـ ـ ـ

وضاحت زندگی کے گلستان میں بے شمار قومیں ایسی بھی ہیں جو اپنی کوشش اور جدوجہد کا پھل پاکر سرخرو ہو چکی ہیں۔ ایسی قومیں بھی ہیں جو اب تک پھل سے محروم ہیں اور جن پر خزاں چھائی ہوئی ہے۔ زندگی کے باغ میں بیشمار درخت ہیں اور ان میں سے بعض درخت بہت کمزور اور مرجھائے ہوئے ہیں۔ جبکہ کچھ درخت تر و تازہ اور سرسبز و شاداب بھی نظر آتے ہیں اور بہت سے پودے ایسے بھی ہیں جو ابھی گلستان کے بطن میں چھپے ہوئے ہیں اور اگنے والے ہیں (مراد یہ ہے کہ دنیا میں بعض قومیں ترقی یافتہ ہیں، بعض ترقی پذیر ہیں اور بعض زوال آمادہ ہیں) لیکن ان تمام پودوں میں شجرِ اسلام پھلنے پھولنے کے معاملے میں مثال اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل یہ سینکڑوں سال کی محنت اور باغبانی کا ثمر ہے۔

ع پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا ـ ـ ـ

وضاحت لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایک مسلمان کا دامن وطنی نظریات و تصورات اور وطن کی محبت کے غبار سے پاک ہوتا ہے۔ تیری حیثیت ایسے یوسفؑ کی ہے جس کے لئے مصر کی سرزمین بھی کنعان کا درجہ رکھتی ہے۔ (واضح رہے کہ بھائیوں

کی دشمنی کی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو کنعان سے مصر جانا پڑا تھا جہاں آپ کو غلام کی حیثیت سے فروخت کیا گیا۔ اس کے باوجود آپ اپنی محنت و کاوش سے مصر کے بادشاہ بنے۔) اس تلمیح کے ذریعے اقبال یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے ہر خطۂ زمین وطن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان تیرا قافلہ کبھی ویران نہیں ہو سکے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے سامان و اسباب میں گھنٹی کی آواز کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ (یعنی مسلمان کہیں رکتا نہیں بلکہ قافلے کی گھنٹی سن کر جس طرح قافلہ چل پڑتا ہے اسی طرح مسلمان مسلسل منزل کی طرف گامزن رہتا ہے)

اے مسلمان تیری مثال شمع جیسی ہے۔ شمع کی طرح تیرا دھاگا اور رشتہ بھی شعلے میں دوڑتا ہے اور تیرے فکر و خیال کا سایہ بھی آخرِ کار سوز اور جلن پیدا کرے گا۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال وطن کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بالفرض اگر ایران کی سلطنت ختم ہو جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام اور مسلمان بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ بات بالکل ایسے ہی ہے جیسے شراب کے نشے کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ شراب کو کس طرح کے برتن میں ڈال کر پیا جا رہا ہے۔ یعنی مسلمان ایران، عراق، ہندوستان یا افریقہ، ایشیا اور یورپ کے کسی بھی خطے اور ملک میں رہیں وہ مسلمان ہی رہیں گے۔ کسی ایک ملک کی آزادی اور غلامی اسلام کے آفاقی اصولوں کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ بات تو تاتاریوں کے حملوں سے بھی کھل جاتی ہے جنھوں نے ایک زمانے میں سلطنتِ بغداد اور دیگر اسلامی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی لیکن پھر یہی تاتاری مغل اور ترکوں کے روپ میں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اسلام کے علمبردار بن گئے اور یوں اللہ تعالیٰ نے بتخانوں میں بیٹھنے والوں سے کعبے کی حفاظت کا کام لیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان ختم ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ حق و سچائی کی کشتی کے لیے دنیا میں مسلمان ہی واحد سہارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ رات کی طرح تاریک ہے اور مسلمان اس تاریک رات میں آسمان پر چمکنے والے اُس دھندے سے ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسافروں کی رہنمائی کرتا اور انھیں امید کا پیغام دیتا ہے۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا ۔ ۔ ۔

وضاحت ترکوں پر اہلِ بلغاریہ کے حملوں نے جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے،

دراصل یہ غفلت برتنے والوں کے لئے بیدار ہونے اور اپنے نفع ونقصان کا احساس کرنے کا پیغام ہے۔ تیرا خیال ہے کہ شاید ان حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہے لیکن حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے ایثار اور خودداری کا امتحان مقصود ہے اور کچھ نہیں۔

آخر تو دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے کیوں ڈر رہا ہے، تجھے یقین رکھنا چاہیئے کہ حق وصداقت کا نور دشمنوں کی پھونکوں سے نہیں بجھ سکتا۔

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تری ؎

وضاحت دنیا کی مختلف قوموں سے ابھی تک تیری اصلیت اور حیثیت پوشیدہ ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کو ابھی تیری ضرورت ہے۔ تیری ہی گرمی وحرارت اس دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔ تیری خلافت وحکومت ممکنات کی اِس دنیا کی تقدیر کا ستارہ ہے یعنی اگر تو ختم ہوگیا تو یہ کائنات بھی ختم ہو جائے گی۔

اس سے تجھے اندازہ کر لینا چاہیئے کہ ابھی فرصت وفراغت کے دن نہیں آئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو کام تیرے سپرد کر رکھا ہے ابھی اس کی تکمیل باقی ہے۔ خدا کی وحدانیت کو ابھی پوری دنیا میں عام نہیں کیا جا سکا اور یہی کام تجھے انجام دینا ہے۔

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا ۔ ۔ ۔ ؎

وضاحت تو پھول کی خوشبو کی طرح غنچے میں قید ہے۔ تجھے چاہیئے کہ اس قید سے رہا ہوکر اور گلستان کی ہوا کے کاندھے پر اپنا سامانِ سفر لاد کر چار دانگ عالم میں پھیل جا۔ اگر تو بے بضاعت ہے اور تیرا سرمایہ بہت کم ہے تو تجھے ذرے سے صحرا میں تبدیل ہو جانا چاہیئے۔ اگر اب تو موج کے نغمے کی حیثیت رکھتا ہے تو اس حیثیت کو ترک کر کے طوفان کے ہنگامے کی شکل اختیار کرلے۔

اپنے عشق کی طاقت سے دنیا کی ہر ادنیٰ چیز کو اعلےٰ بنا دے اور اِس تاریک زمانے میں آنحضرتؐ کے نام سے اُجالا پھیلا دے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو ۔ ۔ ۔ ؎

وضاحت آنحضورؐ کا ذکر کرنے کے بعد اقبال نعتیہ اشعار لکھنے لگ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں، اگر یہ پھول نہ ہو تو پھر کوئی بھی بلبل نغمے نہ گا سکے۔ دنیا کے اِس گلستان میں کلیاں مسکرانا چھوڑ دیں۔ آنحضرتؐ کو ساقی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آپ ساقی نہ

ہوں تو پھر دنیا میں نہ شراب رہے اور نہ شراب کے مٹکے ۔ نہ توحید کی محفل سجائی جا سکے اور نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے :

آسمانوں کا خیمہ اس نام کی برکت سے اور اسی نام کے طفیل قائم ہے اور زندگی کی نبض میں اس نام کی حرارت موجود ہے ۔

یہ نعتیہ بند ایک حدیث قدسی کے ترجمے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر آنحضرت صلعم کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ آسمان بھی پیدا نہ کئے جاتے ۔

۵ دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت آنحضرت صلعم کا اسم مبارک اور اس اسم کی برکت صحراؤں، پہاڑوں کی وادیوں اور میدانوں میں یعنی ہر جگہ موجود ہے ، سمندر ، موجوں کی گود اور طوفان میں ہے ۔ چین کے شہروں اور آبادیوں اور مراکش کے بیابانوں میں وجود رکھتی ہے ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ایمان کی قوت میں چھپی ہوئی ہے ۔ گویا اقبال کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کی نبوت زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد ہے اور ہر خطہ زمین اور ہر زمانے کے لئے ہے ۔

دنیا کی مختلف قومیں قیامت تک یہ منظر دیکھتی رہیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کا ذکر بلند اور بول بالا رکھنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح پورا کیا جاتا رہا ہے ۔ مطلب یہ کہ توحید کے ساتھ ساتھ رسالت اور نبوت بھی رہتی دنیا تک برقرار رہے گی اور سورۃ الانشراح میں آنحضرت صلعم سے اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گا ۔

۵ مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا ۔ ۔ ۔

وضاحت زمین کی آنکھ کی پتلی یعنی وہ دنیا جسے کالی دنیا قرار دینا چاہیئے اور جس میں شہیدوں کی پرورش ہوتی ہے ۔ وہ دنیا جسے سورج کی گرمی نے پالا ہے ، یعنی جہاں بہت زیادہ گرمی پڑتی ہے اور جو اسلامی پرچم کی علامت ہلال سے منسلک ہے یعنی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے جسے اہل عشق حضرت بلال حبشی کے نام سے منسوب کرتے ہیں یعنی براعظم افریقہ آنحضرت صلعم ہی کے نام کے باعث پارے کی طرح پُرجوش و متحرک ہے اور اسی نام کے طفیل آنکھ کے تارے کی طرح نور اور روشنی میں ڈوبی ہوئی ہے ۔

۵ عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری ۔ ۔ ۔

وضاحت اے مسلمان : عقل تیرے لیے ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے اور عشق تلوار کی

اے میرے درویش اور فقیر تیری حکومت و خلافت ساری دنیا پر محیط ہے۔ تیری آواز تکبیر اللہ تعالےٰ کے سوا ہر چیز کے لیے آگ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اگر تو صحیح معنوں میں مسلمان بن جائے تو پھر تُو تقدیر کا پابند نہیں رہتا بلکہ تیری تدبیر ہی تقدیر کا روپ دھار لے گی۔

اگر تُو نے آنحضرتؐ سے وفا کے تقاضوں کو نبھایا تو یاد رکھ کہ ہم بھی تیرے ہیں۔ اس دنیا کی تو حیثیت ہی کیا ہے میرے لوح و قلم بھی تیری ہی ملکیت قرار پائیں گے۔ یعنی اس صورت میں تیرا حکم زمان و مکاں سے ماوراء ہر چیز پر چلے گا اور ہر شے تیری فرمانبردار و اطاعت گذار ہو گی۔

ساقی

(۲۰۸)

حل لغات بادہ کش: شراب پینے والے ؛ **آبِ بقائے دوام**: زندگی کو ہمیشگی عطا کرنے والا پانی یعنی آبِ حیات ؛ **ہنگامہ گستری**: ہنگامے پیدا کرنا ؛

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے ساقی لوگوں کو نشہ دے کر اور انھیں مدہوش و بدمست کر کے گرا دینا تو کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جو لوگ گر رہے ہوں انھیں سنبھال لیا جائے۔ جو لوگ بدمست و مدہوش ہوں انھیں اپنے نفع و نقصان کا احساس کرنے کے قابل بنایا جائے۔ اے ساقی جو پرانے شراب پینے والے تھے وہ تو ایک ایک کر کے اِس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں لہٰذا اب تجھے چاہیئے کہ کہیں سے آبِ حیات لا تا کہ ان لوگوں کو حیاتِ دوام مل سکے۔

تمام رات تو تُو نے ہنگامے پیدا کرنے میں گذار دی۔ اب صبح ہونے والی ہے لہٰذا

مناسب یہ ہے کہ ہنگاموں کو ترک کرکے سیدھے راستے پر آجا اور اللہ کا نام لے تاکہ کم از کم تیری عاقبت تو سنور جائے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نظم میں مسلمان رہنماؤں پر طنز کیا گیا ہے۔

تعلیم اور اس کے نتائج

(۲۰۹)

حلِ لغات تضمین: کسی دوسرے شاعر کے کسی شعر یا مصرع کو خیال کی مناسبت سے اپنے کلام میں شامل کرنا؛ ملا عرشی: ایران کے شہر تبریز سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے احدی تخلص کرتے تھے بعد ازاں عرشی اختیار کیا۔ یہ ایران کے صفوی بادشاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا دیوان تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ لبِ خنداں: ہنستے ہوئے ہونٹ؛ الحاد: کفر، اسلام سے پھر جانا۔

؎ خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر ۔ ۔ ۔

وضاحت نوجوانوں نے جو ترقی کی ہے اسے دیکھ کر دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی خوش تو ہوتے ہیں لیکن کیا کیجئے ہنستے ہنستے ہونٹوں سے بے اختیار آہ بھی نکل جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تعلیم کی وجہ سے قوم کی مشکلات دور ہوں گی لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس فراغت اور آسانی و آسائش کے ساتھ ساتھ کفر و الحاد بھی آجائے گا۔ اور ہمارے نوجوان اسلام سے روگردانی اختیار کرلیں گے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پرویز جیسے بادشاہ کے گھر میں شیریں تو آگئی لیکن مشکل یہ ہے کہ شیریں اپنے ساتھ فرہاد کا وہ تیشہ اور کدال بھی لائی ہے جس نے کوہِ بے ستوں تو توڑ دیا تھا اور اب اس محل کو بھی ویران و برباد کر دے گا۔ یعنی تعلیم فراغت کے ساتھ ساتھ قوم کی بربادی کا باعث بھی بن جائے گی۔

اب ہمیں کہیں سے نیا بیج لانا چاہیئے اور وہ کاشت کرنا چاہیئے کیونکہ جو کچھ ہم نے پہلے

کاشت کیا تھا، ندامت کے باعث اس کی فصل کاٹنا تو بہت مشکل ہو گیا ہے۔

قربِ سلطان

(۲۰۹)

حلِ لغات
تمیز: فرق۔ ہمدوش: ہمسر، برابر۔ بندگی: غلامی، خروش: ہنگامہ۔ مرشد شیراز: خواجہ حافظ شیرازی مراد ہیں۔

تمیزِ حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی ۔۔۔

وضاحت
دنیا سے حاکم اور محکوم کا فرق نہیں مٹ سکتا اور یہ فرق ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس لئے کہ ایک فقیر اور بھکاری کسی بادشاہ کی برابری نہیں کر سکتا۔ دنیا میں غلامی کا کمال یہی ہے کہ حاکم کی پرستش کی جائے اور اس کا حکم بے چون و چرا مان لیا جائے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ حاکم کی مرضی و منشا کا خیال رکھا جائے اور اپنا لباس رنگین کر لیا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حاکم کی خوشنودی حاصل کرنا چاہے تو لوگ اسے عہدے کا لالچی اور قوم کو فروخت کر دینے والا کہنے لگتے ہیں۔ قدیم طرزِ عمل میں ہزار طرح کی مشکلات ہیں جبکہ وقت یہ ہے کہ نئے اصول اور قاعدے سے ہماری فکر کی گود خالی ہے۔ اِس آسمان کے نیچے رہنے کا لطف تو یوں ہے کہ اگر ہماری زبان پر کہنے والی ہزاروں باتیں ہوں تو بھی ہم خاموش ہی رہیں اور کچھ نہ کہیں۔

زندگی میں آرام و اطمینان پیدا کرنے والا اصول خواجہ حافظ شیرازی نے یوں پیش کیا ہے کہ اے حافظ تُو دنیا کو ترک کر کے ایک گوشے میں پناہ لینے والا فقیر ہے۔ لہٰذا تجھے چُپ رہنا چاہیئے اور شور و ہنگامہ نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر تو ہنگامہ اور شور کرنا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے کر لیکن اپنے لئے صاف شراب حاصل کر اور راگ و رنگ کے ساتھ پی جا۔ بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کی محفل میں شرکت کر اور ہوش کے شیشے کو لالچ اور ہوس کے پتھر سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ شیراز کے مرشد کا پیغام بھی سُن لے۔ یہ پیغام

خوشخبری دینے والے فرشتے کے ضمیر میں چھپا ہوا بھید ہے ۔ اور وہ پیغام یہ ہے کہ بادشاہوں کی رائے پر تجلیوں کا نور برستا ہے ۔ جب تو بادشاہ کے پاس بیٹھے گے تو اپنی نیت کو صاف رکھنے کی کوشش کر ۔

شاع

(۲۱۰)

حلِ لغات جوئے سرود آفریں : نغمے پیدا کرنے والی ندی ؛ شراب لالہ گوں : لالے کے پھول جیسی شراب یعنی بہت اعلیٰ سُرخ شراب ؛ دُختر خوشخرام ابر : بادل کی خوبصورت چال والی بیٹی یعنی ندی ۔ دل نواز : دل موہ لینے والا ؛ مزرع : کھیتی ؛ سخنوری : شاعری ؛

جوئے سرود آفریں آتی ہے کہسار سے ۔ ۔ ۔

وضاحت نغمے گانے والی ندی بہار کے شراب خانے سے گل لالہ جیسی سُرخ شراب پی کر آتی ہے ۔ تو اپنی چال کے نشے میں مست اِس ندی کا پیغام سُن ۔ یہ کہہ رہی ہے کہ اس دنیا میں وہی چیز زندہ ہے جسے سکون و ثبات سے کام نہیں اور جو ہمیشہ رو بہ عمل اور متحرک رہتی ہے ۔ یہ خوبصورت چال والی بادل کی بیٹی یعنی ندی وادیوں میں کتنے دلفریب انداز میں گھوم پھر رہی ہے اور گلستان کے سبزے سے عشق لڑاتی پھر رہی ہے یہ ندی پہاڑ کے شراب خانے سے شراب کا پیالہ حاصل کرتی ہے اور اونچے نیچے مقامات کو طے کر کے کھیتوں تک پہنچتی اور انھیں سیراب کر کے سرسبز و شاداب کرتی ہے ۔

بعض شارحین نے جوئے سرود آفریں سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ ندی باغات اور کھیتوں کو سیراب کرتی ہے جس سے زندگی پھلتی پھولتی ہے اور انسان کے علاوہ دیگر جاندار بھی خوشی کے نغمے گاتے ہیں ۔ یوں گویا ندی سرود آفریں قرار پائی ۔ لیکن یہ محض دور کی کوڑی لانے والی بات ہے ورنہ اقبال نے خود پانی کے بہاؤ کی وجہ سے پیدا ہونے والی آواز کو ندی کے

نغمات سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ وہ نظم ہمالہ میں کہتے ہیں ۔ ؎

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اِس عراقِ دلنشیں کے ساز کو

اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

اسی طرح فلسفۂ غم میں کہتے ہیں ۔

؎ آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی

آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

؎ شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری ۔ ۔ ۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ ندی پہاڑوں سے آکر کھیتوں کو سیراب کرتی اور ان کو سرسبز و شاداب بناتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دل موہ لینے والا شاعر بھی اپنی شاعری میں مبالغہ آرائی اور جھوٹ کی بجائے سچی بات کے اظہار کو اپنا شعار بنا لے تو اس کی شاعری کے اثر سے زندگی کی کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ یعنی ندی صرف کھیتوں کو سرسبز و شاداب کرتی ہے جبکہ شاعری زندگی کے لئے مفید و سود مند ہوتی ہے۔ البتہ اس کے لئے اقبال نے کچھ شرائط کا ذکر کیا ہے مثلاً شاعری دل موہ لینے والی ہو اور اس میں کھری اور سچی بات بیان کی گئی ہو۔

ایسے شاعر کے کلام سے حضرت ابراہیمؑ کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب شاعر کی قوم آزر کی عادت اختیار کرکے بت تراشی اور بت پرستی شروع کر دے یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد یا چچا کے بنائے ہوئے بت توڑ کر قوم کو توحید کا درس دیا اور صحیح راستہ دکھایا تھا اس طرح ایک اچھا شاعر بھی اپنی قوم کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتا ہے۔

خونِ جگر اور خلوص سے پرورش پانے والی شاعری زمین پر رہنے والوں کے لئے ہمیشگی کی زندگی کے نسخے کی حیثیت رکھتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر زمانے کے باغ میں شاعری کی شراب کی ندی نہ ہو یعنی اچھی اور خونِ جگر سے تربیت پانے والی شاعری نہ ہو تو پھول، کلی، سبزہ اور خود گلستان تک اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں گے۔

اِس نظم میں علامہ اقبال نے اپنا نظریۂ شعر واضح کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو معیار علامہ اقبال نے دیا ہے اس پر سب سے زیادہ خود اُن کی اپنی شاعری پوری اُترتی ہے۔

نویدِ صبح

(۲۱۱)

تعارف بانگ درا میں کی گئی صراحت کے مطابق یہ نظم ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی، غالباً علامہ اقبال نے نظم کے سنِ تصنیف کی وضاحت اِس لئے کی کہ اِس نظم میں پیش کئے گئے مضامین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اِسی عہد کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے میں دنیا کے تقریباً ہر خطے میں مسلمانوں کا زوال اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

حلِ لغات احرام : وہ خاص لباس جو حج کرتے ہوئے پہنا جاتا ہے لیکن یہاں پر عام لباس ہی مراد ہے ؛ رہ پیما : راستہ ناپنے والا، مسافر؛ گردوں : آسماں، سحاب : بادل ؛ ستیز : جنگ، لڑائی ؛ خوشتر : اچھی، بہتر؛ خود افشانی : خود کو بکھرانا ؛ خفاش : چمگادڑ ؛ رازِ مضمر : چھپا ہوا راز ؛

آتی ہے مشرق سے جب ہنگام در دامن سحر ـــــ

وضاحت جب صبح مشرق کی طرف سے اپنے دامن میں ہنگامے لئے ہوئے آتی ہے تو کائنات سے خاموشی رخصت ہو جاتی ہے۔ کائنات کی خاموشی ٹوٹتی ہے اور دنیا کی ہر چیز اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے لگتی ہے۔ پرندے بھی زندگی کا پیغام پاکر چہچہانے لگتے ہیں اور پھول بھی کھل کر زندگی کا لباس پہن لیتے ہیں۔

اے سوئے ہوئے مسلمان : اب تو بھی اُٹھ، مصروفِ عمل ہو اور چاروں طرف ہنگامے برپا کردے۔ وہ دیکھو افق چمکنے لگا یعنی مشرقی افق پر روشنی پھیل گئی لہٰذا کائنات کی دیگر چیزوں کی طرح تجھے بھی اپنی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہو جانا چاہیئے۔

ے
وسعتِ عالم میں رہِ پیما ہو مثلِ آفتاب ۔ ۔ ۔

وضاحت اے مسلمان اب تو بھی سورج کی طرح دنیا کے پھیلاؤ میں اپنا سفر شروع کر۔ اپنی روشنی سے آسمان کے دامن پر لگے ہوئے داغوں کو مٹا دے ۔ تو اپنی روشنی کی کرن کی تلوار کو تیار کر لے اور جنگ میں مصروف ہو جا اور باطل وغیر حق کے اندھیروں کو ختم ہوجانے کا طریقہ سکھا دے ۔ یعنی انھیں ختم کر دے ۔ اے مسلمان تو سر سے پاؤں تک روشنی ہی روشنی ہے اور تیرے لئے عریاں ہو جانا ہی زیادہ اچھا ہے ۔ صرف عریاں ہونا ہی کافی نہیں بلکہ عریاں ہو کر تجھے پوری دنیا پر بکھر جانا چاہیئے ۔ یعنی اے مسلمان تو کھلم کھلا اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کر۔

اے مسلمان تجھے نمایاں اور ظاہر ہو کر چمگادڑ کی آنکھوں پر روشنی ڈالنی چاہیئے (مطلب یہ ہے کہ باطل چمگادڑ ہے اور تیرا نور جب ظاہر ہو گا تو چمگادڑیں بھاگ جائیں گی) تو اس کائنات کا خفیہ اور پوشیدہ بھید ہے ۔ اب تو ظاہر ہو جا ۔

دُعا

(۲۱۲)

تعارف نظرثانی میں اس نظم کا ایک شعر قلمزد کر دیا گیا تھا جو روزگارِ فقیر میں درج ہے ۔

حلِ لغات وادیٔ فاراں : وہ پہاڑ جس پر بائیبل کی روایت کے مطابق اسلام کی تکمیل ہوتی ، مجازی معنوں میں خانہ کعبہ مراد ہے ؛ دیدۂ بینا : دیکھنے والی آنکھ ؛ آہو : ہرن ؛ خوگر : عادی ؛ شاہد : محبوب ؛ ہمدوش : برابر ، ہمسر ثریا : آسمان پر چھ یا سات ستاروں کا جھرمٹ جو بہت بلندی پر نظر آتا ہے ؛ لوث : لالچ امروز : آج کا دن ، حال ؛ فردا : آنے والی کل یعنی مستقبل ؛ داتا : دینے والا ؛

ے
یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے ۔ ۔ ۔

وضاحت اے اللہ مسلمانوں کے دلوں کو ایسی زندہ و بیدار آرزو عطا کر جو ان

کے دلوں کو گرما دے اور ان کی روحوں میں تڑپ پیدا کر دے۔ وادیِ فاراں یعنی خانہ کعبہ کے ایک ایک ذرّے کو روشن کر دے اور مسلمانوں کے دلوں میں اِس روشنی کو دیکھنے کا شوق پیدا کر دے۔ وہ بھی اِس طرح کہ یہ لوگ جدوجہد پر آمادہ ہو جائیں۔ مسلمان دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اے اللہ انھیں پھر سے دیکھنے والی آنکھ عطا کر۔ بلکہ انھیں وہ بصیرت عطا کر کہ انھیں اپنی بصیرت سے مستقبل کے پردے میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے۔ اس منظر کو یہ سب لوگ بھی دیکھ سکیں۔ آج مسلمانوں کی حالت اُس ہرن جیسی ہے جو اپنا راستہ بھول چکا ہو۔ اے اللہ اِسے پھر منزل یعنی خانہ کعبہ اور اسلام کی طرف لوٹا دے۔ یہ شہر کا عادی ہو گیا ہے اور یوں یہ تن آسان ہو کر اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ یا اللہ اِسے پھر صحراؤں کی وسعت اور پھیلاؤ عطا فرما تاکہ سخت کوشی سے اس کی صلاحیتیں نکھر سکیں۔ مسلمانوں کے دل ویران ہو چکے ہیں۔ اے اللہ ان ویران دلوں میں قیامت کا ہنگامہ پیدا کر دے۔ دل کے اس خالی کجاوے میں پھر لیلیٰ جیسا محبوب عطا کر دے۔ یہ دور تاریکی اور اندھیرے کا دور ہے جس میں کسی کو کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کے دل پریشانی اور ابتری کا شکار ہیں۔ ایسی صورت میں ان دلوں کو محبت کے ایسے داغ عطا کر جو اپنی روشنی کے باعث چاند کے لئے بھی قابلِ رشک بن جائیں۔ اے اللہ! مسلمانوں کے پیشِ نظر مقاصد کو بلندی کے اعتبار سے آسمان پر موجود ثریا جیسے بلند ستاروں کے جھرمٹ کا ہمسر بنا دے۔ مسلمانوں کو ساحل جیسی خودداری اور دریا جیسی آزادی دیدے۔ ان کے دل ایسی محبت سے بھر دے جس میں لالچ کا شائبہ تک نہ ہو اور انھیں بے خوف ہو کر سچ بولنے کی توفیق عطا فرما۔ انسان کے تاریک سینوں میں روشنی پیدا کر دے اور ان کے دلوں کو صراحی بنا دے جو دوسروں کو فیض پہنچانے کیلئے خود خالی ہو جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کی ملی زندگی چاروں طرف سے مصائب و آلام میں گھری ہوئی ہے اور مسلمانوں کو ان مصیبتوں کا احساس بھی نہیں۔ اے اللہ انھیں مصائب و آلام کے آثار کا احساس عطا کر۔ مسلمانوں کو آج یعنی زمانہ حال کے ہنگاموں کے پس منظر میں مستقبل کی فکر عطا کر۔

میں ملتِ اسلامیہ کے اجڑے ہوئے باغ میں نالے بلند کرنے والا بلبل ہوں۔ میرے گریہ وزاری میں تاثیر نہیں ہے۔ میں تاثیر کا محتاج ہوں۔ تو سب کی مرادیں پوری کرنے والا اور سب کو اُن کی خواہش کے مطابق عطا کرنے والا ہے لہٰذا میرے نالوں کو تاثیر عطا کر۔

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

(۳۱۳)

تعارف نسیم امروہوی فرہنگ اقبال میں اس نظم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مولوی نظام الدین حسین نظامی مالک نظامی پریس وایڈیٹر "ذوالقرنین" بدایوں (یوپی) نے اگست ۱۹۱۵ء میں اقبال سے فرمائش کی کہ عید کے شمارے کے لئے چند شعر کہہ دیں۔ چونکہ اقبال اس زمانے میں ترکوں کی زبوں حالی سے بہت مغموم تھے۔ اس لئے انھوں نے مقتضائے حال کے مطابق اپنے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے شگفتہ نظم کی بجائے قوم کا یہ مرثیہ کہہ دیا جو ۱۱ اگست کے ذوالقرنین میں شائع ہوا۔

نظر ثانی میں اس نظم کا ایک شعر قلمزد کیا گیا جو روزگار فقیر میں درج ہے۔

حل لغات شالامار: لاہور کا ایک مشہور تاریخی باغ، برگ زرد: پیلا یعنی سوکھا ہوا اور خشک پتا، زائرانِ چمن: گلستان کی زیارت یعنی سیر کرنے والے، شاخِ نشیمن: وہ شاخ جس پر گھونسلا بنایا گیا ہو، فصل بہار: بہار کا موسم، ہلالِ عید: عید کا چاند،

یہ شالامار میں اک برگِ زرد کہتا تھا ـــ

وضاحت شالامار باغ میں ایک خشک اور سوکھا ہوا پتا کہتا تھا کہ پھولوں کا وہ موسم ختم ہو گیا جس کا میں رازدار ہوں۔ باغ کی سیر کو آنے والوں کو چاہیئے کہ وہ مجھے اپنے پاؤں کے نیچے نہ کچلیں۔ اس لئے کہ میں اس شاخ کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہوں جس پر اُن کا گھونسلا تھا۔

چھوٹے اور جھولی سے پتے کی اِس بات نے مجھے بیتاب کر دیا۔ میں باغ کی سیر کو آیا تھا لیکن یہاں آکر میں سراپا موسم بہار کا غم بن گیا۔ اب میرے چمن یعنی ملتِ اسلامیہ پر خزاں چھائی ہوئی ہے اور میں خزاں میں موسم بہار کو یاد کر کے روتا ہوں۔ ایسے میں مجھے عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ میں تو غمزدہ ہوں۔ پرانے زمانے کے تمام شراب خانے ویران ہو گئے ہیں اور میں

پرانے شراب پینے والوں کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہوں۔

ایسی صورت میں عید کا چاند ہمیں عیش وعشرت اور خوشی کا پیغام دے کر دراصل ہمارا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ

(۲۱۴)

تعارف

جیسا کہ حضرتِ علامہ اقبال نے خود وضاحت کر دی ہے کہ یہ نظم ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی اور اِس نظم کا موضوع ایک مسلمان لڑکی ہے جو طرابلس کی جنگ میں ترک اور عرب مجاہدوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔

نظرِ ثانی میں اِس نظم کے دو شعروں میں جزوی ترمیم ہوتی اور چار شعر قلمزد کر دیئے گئے۔ قلمزد کئے گئے اشعار سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔ سرودِ رفتہ میں وہ مصرعے بھی دیئے گئے ہیں جن میں جزوی ترمیم کی گئی تھی۔

حلِ لغات

فاطمہ بنتِ عبداللہ : فاطمہ بنت عبداللہ کے قدرے تفصیلی حالات ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ایک رنگین تصویر کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ الہلال کے مطابق فاطمہ بنت عبداللہ ایک عرب سردار شیخ عبداللہ کی بیٹی تھیں۔ شیخ عبداللہ نے جنگِ طرابلس میں اسلامی لشکر کے ساتھ حصہ لیا۔ شیخ کے قبیلے کے سب لوگ عورتوں سمیت اِس جنگ میں شریک تھے۔ عورتیں مردوں کی مدد کے علاوہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور غازیوں کو پانی پلانے کا کام بھی کرتی تھیں۔ ایک محاذ پر شیخ عبداللہ کی کمسن بیٹی بھی موجود تھی۔ وہ ایک زخمی ترک کو پانی پلانا چاہتی تھی۔ ایک اطالوی نے فاطمہ کو روکنا چاہا۔ فاطمہ نے تلوار اٹھائی اور اطالوی کو زخمی کر دیا لیکن فاطمہ کو بندوق کی نشانہ بنا دیا گیا اور یوں وہ جہاد کے دوران شہید ہو گئی۔ علامہ اقبال نے اِس عرب لڑکی کے جذبۂ جہاد سے متاثر ہو کر اسے اپنی نظم کا موضوع بنایا۔ طرابلس : ترکوں کا ایک صوبہ جسے آجکل لیبیا کہا جاتا ہے ؛ معصوم : گناہوں سے پاک ؛ سقائی : پانی پلانا ؛

تیغ : تلوار ، **سپر** : ڈھال ، **جسارت آفریں** : جرأت پیدا کرنے والا ، **خاکستر** : راکھ ، **آفرینش** : آغاز ، ابتداء ، پیدائش ، **نامحرم** : ناواقف ، **ضو** : روشنی ، **تابانی** : روشنی ، چمک دمک ، **کوکب** : ستارہ ،

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے فاطمہ بنت عبداللہ تو اس اُمت کی عزت و آبرو کی حیثیت رکھتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا رحم نازل کیا اور تیری مٹی یعنی جسم کا ایک ایک ذرہ گناہوں سے پاک اور منزہ ہے ۔ اے صحرا کی حور یہ سعادت اور نیکی تیرے حصّے میں آئی تھی اور دین کے راستے میں فتح حاصل کرنے والوں کو پانی پلانے کا اعزاز بھی تیرے حصّے کی بات تھی ۔ خدا کے راستے میں ضروری ساز و سامان اور تلوار و ڈھال کے بغیر یہ جہاد حیرت انگیز ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہادت پانے کے شوق نے تجھے کس قدر جرأت مند اور بہادر بنا دیا تھا ۔ تیری زندگی اور موت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ اے اللہ ہمارے اجڑے ہوئے گلستان میں ایسی کلی بھی موجود تھی اور مسلمان جو راکھ کا ڈھیر بن چکے ہیں اُن میں ایسی تابناک اور جلا دینے والی چنگاری بھی موجود تھی ۔

فاطمہ بنت عبداللہ کی زندگی کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے صحرا میں ابھی بہت سے ہرن چھپے ہوئے ہیں ۔ گو اب مسلمان ایک برسے ہوئے بادل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تمام توانائی زائل ہو چکی ہے اس کے باوجود اِس میں فاطمہ بنت عبداللہ جیسی مجاہدہ کی صورت میں بےشمار بجلیاں چھپی ہوئی ہیں ۔

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے فاطمہ بنت عبداللہ گو ہماری آنکھیں تیرے غم میں آنسو برسا رہی ہیں لیکن ماتم و آہ و زاری کے ان نالوں میں عیش و عشرت کے نغمے بھی موجود ہیں ۔ تیری مٹی کا رقص یعنی تیری زندگی اور موت کا واقعہ ہمارے لئے خوشیوں کو بڑھانے والا ہے ۔ تیری مٹی کا ایک ایک ذرہ زندگی کی جلن سے بھرا ہوا ہے ۔ تیری خاموش قبر میں بھی ایک ہنگامہ موجود ہے اور اِس کی گود میں ایک نئی قوم کی پرورش ہو رہی ہے ۔ میں اِس نئی قوم کے مقاصد کی وسعت اور بلندی سے بےخبر ہوں لیکن یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قوم کی ابتداء اور پیدائش تیرے مزار ہی سے ہو رہی ہے ۔ آسمان کی فضا میں نئے ستارے ظاہر ہو رہے ہیں ۔ اور یہ ستارے

ایسے ہیں کہ ابھی تک انسان ان کی روشنی سے ناواقف ہے ۔ اور انسان کی آنکھ انھیں نہیں دیکھ سکی ۔
یہ ستارے ابھی وقت کی تاریکی سے نکل رہے ہیں اور ان کی روشنی ابھی تک صبح و شام کی قید سے ناواقف ہے ۔ کمال یہ ہے کہ ان ستاروں کی روشنی اور چمک دمک میں پرانا انداز بھی موجود ہے اور نیا بھی ۔ اور اے فاطمہ بنت عبداللہ ان ستاروں میں تیری قسمت کے ستارے کا پرتو بھی شامل ہے ۔ ستاروں میں نئے اور پرانے انداز کی بیک وقت موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان نوجوان قدیم روایات اور زندگی کے نئے تقاضوں کو ایک ساتھ لے کر آگے بڑھینگے ۔

شبنم اور ستارے

(۲۱۵)

حل لغات زہرہ : انتہائی روشن اور خوبصورت ستارہ جو غروب آفتاب کے وقت مغربی افق پر نظر آتا ہے ۔ مغربی افق سے غروب ہونے کے چند ماہ بعد یہی ستارہ صبح کے وقت مشرقی افق پر دکھائی دیتا ہے ۔ کشور : سلطنت ؛ **مرغ نوا ریز** : نغمے گانے والا پرندہ ؛ گردوں : آسماں ؛ طوف : طواف ، کسی چیز کے چاروں طرف گھومنا ؛ درماں : علاج ؛ کاشانہ : گھر ؛ قرطاس : صفحہ ؛

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے

وضاحت ایک رات ستارے شبنم کو کہنے لگے کہ تجھے ہر صبح نئے نئے منظر دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ معلوم نہیں تو کتنی دنیائیں دیکھ چکی ہے اور جو چیزیں عروج پا کر زوال کا شکار ہو چکی ہیں تو اُن کے نشان و آثار بھی دیکھ چکی ہے ۔ زہرہ ستارے نے ایک فرشتے سے یہ بات سنی ہے کہ انسان کی آبادی آسمان سے بہت دوری پر واقع ہے لیکن چونکہ تو اس دنیا کو جانتی ہے لہٰذا دل کو پسند آنے والی اس سلطنت کی کہانی ہمیں بھی سُنا ۔ یہ ایسی دنیا ہے کہ چاند بھی اس کی محبت کے نغمے گاتا رہتا ہے ۔

۵ اے تارو نہ پوچھو چمنستانِ جہاں کی ۔ ۔ ۔

وضاحت ستاروں کے سوال کے جواب میں شبنم کہتی ہے کہ اے ستارو تم مجھ سے دنیا کے باغ کی کہانی نہ پوچھو ۔ یہ گلشن یا باغ نہیں ہے بلکہ آہوں اور سسکیوں کی ایک آبادی ہے ۔ وہاں صبا صرف اس لئے آتی ہے کہ پھر وہاں سے لوٹ جائے ۔ یعنی ۔ سکون و اطمینان اور ہمیشگی کسی بھی چیز کو حاصل نہیں ہے ۔ کلی بھی صرف اس لیے کھلتی ہے کہ کھل کر مرجھا جائے تمہیں کیا بتاؤں کہ کلی باغ کو کس قدر سجاتی اور آراستہ کرتی ہے ۔ یہ کلی، کلی نہیں بلکہ درحقیقت ایسے شعلے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں جلن نہ ہو ۔ اِس دنیا میں بلبل پھولوں کے عشق میں مبتلا ہو کر نالہ و فریاد کرتا ہے ۔ لیکن پھول اس آہ و زاری کو سننے سے قاصر ہیں ۔ میں اِس کے دامن میں موتی بن کر گرتی ہوں لیکن پھول ان موتیوں کو حاصل کرنے کی قوت نہیں رکھتا ۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو پرندے نغمے گاتے ہیں انھیں قیدی بنالیا جاتا ہے ۔ جن شاخوں پر پھول کھلتے ہیں انہی پر پھولوں کے ساتھ میں کانٹے بھی اگتے ہیں ۔ نرگس کی آنکھ ہمیشہ روتی رہتی ہے ۔ نرگس کو آنکھ میں مناظر دیکھنے کی تڑپ ہے لیکن اس کی آنکھ بینائی سے محروم ہے ۔ شمشاد کا دل فریاد کی گرمی سے جلا ہوا ہے ۔ کہنے کو یہ درخت آزاد ہے لیکن حقیقتاً یہ بھی قیدی ہے ۔ ستارے جو بہت خوبصورت ہیں وہ بھی انسان کے نزدیک آہوں کے شرارے ہیں اور گلستان والے مجھ شبنم کو آسمان کے آنسوؤں سے تعبیر کرتے ہیں ۔ چاند زمین کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے گرد طواف کرتا اور گھومتا رہتا ہے ۔ لیکن یہ اس کی نادانی اور بے سمجھی ہے ۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے جگر پر جو داغ ہے ، زمین پر اس داغ کا علاج موجود ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے گھر کی بنیاد محض ہوا پر قائم ہے ۔ دنیا درحقیقت فنا کے صفحے پر فرہاد کی تصویر کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اقبال نے دنیا کی بے ثباتی کو بڑے خوبصورت انداز میں واضح کیا ۔ اقبال نے کہا کہ دنیا کی بنیاد ہوا پر قائم ہے گویا دنیا کو محض خیال ، ہوائی قلعہ اور بربادی قرار دیا گیا ۔

محاصرۂ ادرنہ

(۲۱۶)

ابتدا میں اِس نظم کا عنوان "اسلامی رواداری" تھا۔ بانگ درا کی اشاعت کے وقت نظر ثانی میں نظم کا عنوان بھی بدل دیا گیا اور اس کے چھ شعر بھی حذف کر دیتے گئے۔

جو باقیاتِ اقبال میں درج ہیں۔

حلِ لُغات

ادرنہ : فتح قسطنطنیہ سے قبل سلطنتِ عثمانیہ کا دارالحکومت تھا۔ فروری ۱۹۱۳ء میں بلغاریہ اور سرویا نے ادرنہ پر حملہ کر دیا اور ترکوں کی شدید مزاحمت کے باوجود یہ شہر ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن جولائی ۱۹۱۳ء میں غازی انور پاشا نے موقع پاکر اس شہر کا پھر محاصرہ کر لیا اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ نظم بلغاریہ اور سرویا کی افواج کے محاصرہ کے دوران میں پیش آنے والے واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ؛ شکری : شکری پاشا ادرنہ میں محصور ترک فوجوں کا سالار تھا جو بہت بے جگری سے لڑا اور جس کی تعریف پر دشمن بھی مجبور ہوئے ؛ مستور : چھپا ہوا ؛ عسکر : لشکری ؛ عصفور : چڑیا ؛ صاعقہ : بجلی ؛ ذمی : اصطلاح میں وہ تمام غیر مسلم مراد ہیں جو کسی قدر عوضانہ پر اپنے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے سپرد کر دیں۔

ع یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی ـ ـ ـ

وضاحت

جب یورپ میں حق و باطل کی جنگ کا آغاز ہو گیا تو حق اپنے خنجر کی تیزی آزمانے پر مجبور ہو گیا ۔جب صلیب یعنی عیسائیت کا گرد وغبار قم یعنی اسلام کے ارد گرد حلقہ باندھ کر کھڑا ہوا یعنی جب عیسائی افواج نے مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا اور مسلم افواج کے سالار شکری پاشا کو ادرنہ کی دیواروں میں محصور ہونا پڑا ۔اس محاصرے کے دوران اسلامی فوج کے خوراک کے ذخیرے ختم ہو گئے اور انھیں فتح کی جو امید تھی وہ خوراک کے ذخیرے ختم ہونے کے باعث ختم ہو گئی۔ آخری چارہ کار کے طور پر ترکی کے لشکر کے سردار نے جنگ کے قانون کو شہر کا عام قانون قرار دے دیا یعنی حسب ضرورت فوج کے لئے جبراً رسد اکٹھی کرنا۔ جس کے نتیجے میں اسلامی لشکر نے عام لوگوں کے خوراک کے ذخیرے بھی اپنے ہاں منتقل کر لئے اور یوں گویا شاہین چڑیوں کی خوراک کا بھکاری بن گیا۔ لیکن جب یہ

بات شہر کے مفتی اور فقیہہ نے سُنی تو وہ غصّے کی وجہ سے کوہِ طور کی بجلی کی طرح غضبناک ہو گیا اور اس نے فتویٰ دیا کہ پناہ میں آتے ہوئے غیر مسلموں کا مال اسلامی لشکر پر حرام ہوتا ہے۔ مفتی کا یہ فتویٰ شہر میں مشہور ہوا تو یہ حالت ہو گئی کہ خوراک کے ذخیرے ختم ہو جانے کے باوجود یہودیوں اور عیسائیوں کے مال کو اسلامی لشکر کے لوگ ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے اور یوں مسلمان اپنی ضرورتوں کے باوجود خدا کے حکم سے مجبور ہو گئے۔

غلام قادر رہیلہ

(۲۱۷)

تعارف

"غلام قادر رہیلہ" نظم میں علامہ اقبال نے جن کرداروں کا ذکر کیا ہے وہ تاریخی اور واقعی کردار ہیں۔ لیکن اِس نظم میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کی بعض جزئیات کی تائید کسی بھی تاریخ سے نہیں ہوتی۔ اِسی وجہ سے بعض ناقدین اِسے علامہ اقبال کی غلطی قرار دیتے ہیں۔ یہاں پر ایک امر قابلِ وضاحت ہے کہ شاعر نظریۂ امکانات کے تحت اُن واقعات کو موضوع بنا سکتا ہے جو بیشک پیش نہ آئے ہوں لیکن جن میں وقوع پذیر ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس نظم میں بھی جس واقعہ کو پیش کیا گیا ہے وہ قصے کی منطق کے اعتبار سے غلط نہیں ہے۔

غلام قادر روہیلہ، روہیل کھنڈ کے سردار ضابطہ خاں کا بیٹا اور نجیب الدولہ کا پوتا تھا۔ نجیب الدولہ اُن چند امرا میں شامل تھا جس نے مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں نے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں جو ہزیمت اٹھائی تھی اس کا بدلہ انھوں نے اس وقت لیا جب نجیب الدولہ کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ بد قسمتی یہ تھی کہ روہیل کھنڈ پر حملہ کر کے یہاں پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے اور خواتین کی بے حرمتی کرنے والوں میں مرہٹوں کے ساتھ ساتھ شاہ عالم ثانی مغلیہ تاجدار کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ غلام قادر نے یہ سب کچھ بچپنے میں دیکھا تھا

اُس وقت تو وہ اس کے خلاف کچھ نہ کر سکا البتہ اس کے دل میں انتقام کا لاوا پکتا رہا۔ ۱۷۸۸ء میں اسے یہ موقع ملا اور اس نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دیں۔ بہرحال غلام قادر کچھ عرصے بعد متھرا میں مرہٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

علامہ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کے ساتھ ترنم سے پڑھ کر سنائی۔

حلِ لغات

جفاجُو: ظلم کرنے والا۔ **کینہ پرور**: بغض اور عداوت پالنے والا۔ **شاہِ تیموری**: مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ **سمن بر**: چنبیلی جیسے جسم والی۔ **مغفر**: جنگ کے دوران میں سر پر پہنا جانے والا لوہے کا خود۔ **تابانی**: روشنی، چمک دمک۔ **چشمِ احمر**: سرخ آنکھیں، نیند سے بوجھل آنکھیں۔ **اخگر**: انگارے۔ **حمیت**: غیرت۔

۵ رہیلہ کس قدر ظالم، جفاجو، کینہ پرور تھا ـ ـ ـ

وضاحت

غلام قادر رہیلہ کے کردار پر نظر ڈالیے۔ یہ شخص کتنا ظالم، جفا کرنے والا اور اپنے دل میں بغض و عداوت پالنے والا تھا۔ اِس نے اپنے باپ کے عہد میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا بدلہ لینے کے لئے مغل بادشاہ شاہ عالمؔ ثانی کی آنکھیں اپنے خنجر سے نکال دیں۔ اس کے بعد اس نے شاہی گھرانے کی خواتین کو حکم دیا کہ وہ اُس کے سامنے ناچیں۔ ظاہر ہے کہ ظلم ڈھانے کا یہ انداز قیامت آنے کی نشانیوں سے کم نہ تھا۔ غور کیجئے کہ غیرت کو ختم کر دینے والے اس حکم کی تعمیل چنبیلی جیسا جسم رکھنے والی شاہی گھرانے کی خوبصورت عورتوں سے کس طرح ممکن تھا۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ غلام قادر رہیلہ نے بیدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان خواتین کو عیش و عشرت کا سامان بنایا جن کا حسن سورج، چاند اور ستاروں کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ تھا یعنی جو انتہائی باپردہ خواتین تھیں۔ ان خواتین کے نازک دل لرزتے تھے لیکن برامِ مجبوری ان کے پاؤں رقص کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ غلام قادر رہیلہ تھوڑی دیر تک رقص دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے سر سے خود اتار دیا۔ اِس کے بعد اپنی کمر سے لوگوں کی جان لینے اور آگ اگلنے والی تلوار کھول دی۔ یہ ایسی تلوار تھی کہ اس کا جوہر ستاروں کو بھی چمک دمک اور روشنی کا سبق سکھاتا تھا۔ پھر اس نے اپنا خنجر اپنے سامنے رکھا اور کچھ سوچتے ہوئے لیٹ گیا۔ یُوں لگتا تھا جیسے اس کی سرخ آنکھیں سو جانے کا تقاضا کر رہی ہیں۔ پھر اسے نیند آ گئی اور نیند نے اس کی آنکھوں کے انگارے بجھا دیئے۔

یعنی غلام قادر روہیلہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ یوں لگتا تھا جیسے شہزادیوں کے رقص کے درد انگیز منظر سے اِس ظالم کی آنکھیں شرما گئی ہوں۔ اِس کے بعد وہ اٹھا اور شاہی محل کی خواتین سے کہنے لگا کہ تمھیں اپنی قسمت سے کوئی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ میرا سوجانا حقیقی نہیں تھا بلکہ یہ محض دکھاوا تھا۔ ورنہ فوج کی صفیں سجانے اور جنگ میں حصہ لینے والے غفلت نہیں برتا کرتے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی مغل شہزادی مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالنے کی کوشش کرے لیکن آخرِ کار ساری دنیا پر یہ راز کھل گیا کہ جس چیز کو غیرت کہتے ہیں اب وہ تیموری خاندان سے رخصت ہوگئی اور یہی تمھاری ذلت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

ایک مکالمہ

(۲۱۹)

حلِ لغات

مرغِ سرا: گھریلو پرندہ مثلاً چڑیا، کبوتر اور کوا وغیرہ۔ یعنی وہ پرندے جو انسانی آبادیوں میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ مرغِ ہوا: ہوا میں اڑنے والے وہ تمام پرندے جو عام طور پر انسان سے مانوس نہیں مثلاً شاہین وغیرہ۔ ہواگیر: ہوا پکڑنے والا، ہوا میں اڑنے والا۔ پندار: غرور۔ حمیت: غرور۔ گردوں: آسمان۔

اِک مرغِ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے — — —

وضاحت

ایک گھریلو پرندے نے ایک آزاد پرندے سے کہا کہ اگر تُو پر رکھتا ہے تو کیا میں پروں والا نہیں ہوں۔ یعنی پرواز کے لئے میں بھی پر رکھتا ہوں۔ اگر تو ہوا میں اڑ سکتا ہے تو میں بھی ہوا میں اُڑنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اگر تُو آزاد ہے تو میں بھی گرفتار اور قیدی نہیں ہوں۔ پرواز کرنا کچھ تیری خصوصیت نہیں بلکہ ہر پرندہ اڑ سکتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ تو ہمیشہ غرور اور تکبر کا اظہار کرتا ہے۔ ان باتوں سے مرغِ ہوا کی غیرت کو ٹھیس لگی۔ چنانچہ وہ یہ دل دکھانے والی بات سن کر کہنے

لگا کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ تو بھی پرواز کرنے میں آزاد ہے لیکن تو زیادہ سے زیادہ کسی دیوار تک اڑ سکتا ہے۔ در اصل تو آزاد پرندوں کی ہمت سے واقف نہیں ہے۔ تو نے اپنا گھونسلا مٹی پر بنا رکھا ہے جب کہ میری قبیل کے پرندے آسمان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو گھر بلو پرندہ ہے اور اپنی خوراک زمین اور مٹی سے حاصل کرتا ہے جب کہ ہم دانہ سمجھ کر ستاروں تک کو اپنی چونچ کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔

میں اور تو

(۲۲۰)

حل لغات مذاقِ دید: دیکھنے کا ذوق اور لذت، رہین: گروی رہنے والا، فزوں: زیادہ، سود: فائدہ، نفع، زیاں: نقصان۔

مذاقِ دید سے ناآشنا نظر ہے مری ۔۔۔

وضاحت میری نگاہ دیکھنے کے ذوق اور لذت سے محروم ہے اور تیری نگاہ فطرت و قدرت کے تمام رازوں سے واقف ہے تو کیا ہوا؟ میری زبان زمانے کا شکوہ اور شکایت کرنے ہی میں لگی رہتی ہے جب کہ آسمان کی گردش تیری خواہش کے مطابق چلتی ہے تو بھی کیا ہوا۔ اگر آسمان نے مجھے نسیم کی موجوں کی طرح ایک سے دوسرے چمن تک آوارہ رکھا اور تمہیں آشیاں اور گھر عطا کر دیا تو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر تیری زندگی کا سرمایہ منافع اور فائدے سے بڑھ رہا ہے اور ہمیشہ نقصان اور خسارے کی کوشش و کاوش میرا نصیب ہے تو بھی کیا ہوا؟ تمہارے طیارے فضاؤں میں اڑتے پھرتے ہیں اور میرے جہاز کو بادبان بھی میسر نہیں تو کیا فرق پڑا۔

اگر تو طاقت ور ہے تو کیا اور اگر میں کمزور ہوں تو کیا ہوا؟ ایسے ہو گیا تو کیا ہوا اور ویسے ہو گیا تو کیا فرق پڑ گیا۔ اس دنیا میں کسی طرح بھی قرار و سکون میسر نہیں ہے۔ اگر

تو بہار ہے اور میں خزاں ہوں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ آخر کار دونوں کا انجام ایک ہے۔

تضمین بر شعرِ ابو طالب کلیم

(۲۲۱)

حل لغات تضمین : مضمون کی مناسبت سے کسی شاعر کے شعر یا مصرع کو اپنے کلام میں شامل کرنا؛ ابو طالب کلیم : مشہور فارسی شاعر جو ہمدان میں پیدا ہوا۔ مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا اور دربار سے منسلک ہو گیا۔ لیکن پھر واپس ایران چلا گیا اور صفوی دربار سے وابستگی اختیار کی۔ شاہجہان کے عہد میں دوبارہ ہندوستان آیا۔ شاہجہان کشمیر آیا تو ابو طالب کلیم بھی ساتھ تھا۔ اسے یہ خطہ اس قدر پسند آیا کہ شاہجہان کی اجازت سے یہیں مقیم ہو گیا اور کشمیر ہی میں وفات پائی۔ شاہجہاں نے اسی شاعر کو چاندی میں تلوایا تھا؛ شعار : عادت، طریقہ، سنت؛ خاتم : انگوٹھی؛ گردوں : آسماں؛ کاشانہ : گھر؛

خوب ہے تجھ کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اے مسلمان تجھے آنحضرتؐ کی سنت اور اُن کے طریقے کا اچھا خیال ہے۔ تیری زندگی کا جو طور ہے وہ صاف کہہ رہا ہے کہ تو مسلمان ہی نہیں ہے۔ اے مسلمان تیری غفلت نے وہ نگینہ کھو دیا جس کے طفیل آسمان یعنی تقدیر تیری انگوٹھی کی قیدی تھی۔ نماز کی وجہ سے تیری پیشانی پر پڑنے والا وہ نشان سجدہ جو ستارے کی طرح روشن تھا، اب تیری پیشانی پر نظر نہیں آتا۔ یعنی تو نے نماز ترک کر دی۔ ذرا اپنے عمل کو غور سے دیکھ۔ کیا تجھے اپنی زندگی میں اب وہ سچائی نظر آتی ہے جس کی بے خوفی ایک زمانے میں لوگوں کو حیران کر دیتی تھی۔ وہ باطل اب تیرے دل میں مقیم ہے جس کے لئے تیرے بزرگوں کی نگاہ بجلی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یعنی اب تو خود اُن کافرانہ طریقوں کے مطابق زندگی گذار رہا ہے جنھیں تیرے بزرگوں نے ختم کرنے کے لیے جہاد کیا تھا۔ اے غافل تو پھر پرانے طور طریقوں

کو زندہ کر۔

غور کر کہ حقیقت پہ نظر رکھنے والا ابوطالب کلیم کیا نغمہ الاپ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تو نے جس سے بغاوت اختیار کی پھر اسی کی اطاعت قبول کر۔ یعنی تو جس مقام سے شعلے کی طرح بلند ہوا تھا پھر اسی پر براجمان ہو جا۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کو پھر اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

شبلی وحالی

(۲۲۲)

مولانا شبلی نعمانی نومبر ۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے اور مولانا الطاف حسین حالی نے دسمبر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ علامہ اقبال نے اس قطعے نما مرثیے میں دونوں بزرگوں کی وفات کا تذکرہ انتہائی دکھ بھرے انداز میں کیا ہے۔

حلِ لغات دیوانِ جزو کل: دنیا مراد ہے؛ فرد: یگانہ، بے مثل، سرودِ رفتہ: گذرا ہوا نغمہ؛ چرخِ لاجورد: نیلا آسمان؛ نبرد: جنگ؛ غماز: ظاہر کرنے والا، چغلی کھانے والا؛

مسلم سے اک روز — — — — — — —

وضاحت ایک دن اقبال نے مسلم سے کہا کہ اِس کائنات میں تیرا وجود بالکل یگانہ اور بے مثل ہے۔ آج جن نئے نئے علوم کا غلغلہ بلند ہے یہ دراصل تیرے ہی گذرے ہوئے نغمے ہیں۔ یعنی اِن علوم کی ابتداء مسلمانوں ہی نے کی تھی۔ اسی طرح آج جس چیز کو تہذیب کہا جاتا ہے وہ دراصل تیرے ہی پرانے قافلے کا گرد و غبار ہے۔ انسان کی عزت و آبرو کا شیشہ بہت نازک ہے اور اِس کے لئے ہوا کا جھونکا بھی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں میں عمل کی قوت ہوتی ہے وہ حادثوں کے اسباب تلاش کر کے گہرے نیلے آسمان کی طرف سے ڈھائے گئے مظالم کا علاج کر لیتے ہیں۔ تجھے چاہیئے کہ

تو اُن لوگوں سے پوچھے جو تیرے گلستان یعنی امتِ اسلامیہ کے پرانے رازداں ہیں کہ آخر ملت کے باغ سے خزاں کیوں جنگ آزما ہوئی اور مسلمان خزاں کا شکار کیوں ہو گئے ۔

مُسلم نے میری گفتگو سنی تو وہ بے چین ہو گیا اور ایک ٹھنڈی آہ نے اس کے چھپے ہوتے غم کو ظاہر کر دیا ۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے کہنے لگا تو ذرا خزاں کی کیفیت تو دیکھ ۔ ہماری زندگی کے درخت کے پتے سوکھ چکے ہیں اور جو لوگ زندگی کے راز سے واقف تھے اور جن کی درد بھری آواز ہمارے دلوں کو پگھلا دیتی تھی ، ایک ایک کر کے خاموش ہو گئے یعنی وفات پا گئے ۔ ابھی مسلمان شبلی کی وفات پر آنسو بہا رہے تھے کہ مولانا حالی بھی اِس دنیا سے کوچ کر کے فردوس کے راستے کے مسافر ہو گئے ۔

اب یہ جرات کس میں ہے کہ وہ باغبان سے یہ سوال کرے کہ بلبل نے کیا کہا ، گل نے کیا سُنا اور صبا نے کیا عمل کیا ۔

ارتقاء

(۲۲۳)

حلِ لغات **ستیزہ کار** : جنگ آزما ۔ **ازل** : وہ لمحہ جب کائنات تخلیق کی گئی ۔ **امروز** : آج ، حال ۔ **چراغِ مصطفوی** : آنحضرتؐ کا چراغ یعنی حق و صداقت اور اسلام ۔ **شرارِ بولہبی** : ابولہب کی چنگاری یعنی کفر اور باطل ۔ **سرشت** : عادت ۔ **زم** : سردی ۔ **شیشۂ حلبی** : عراق کے شہر حلب میں بننے والا شیشہ جو بہت ہی مشہور تھا ۔ **آتشِ علبی** : انگور کی آگ ، شراب ۔ **تب و تاب** : چمک دمک ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ۔ ۔ ۔

وضاحت جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے اُس وقت سے لے کر آج تک باطل اور کفر ، حق و صداقت اور اسلام سے مصروفِ پیکار رہا ہے یعنی ان کی جنگ اور آویزش جاری ہے ۔ اقبال نے یہی خیال ایک اور نظم میں یوں پیش کیا ہے ۔

ے نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

زندگی اپنے مزاج کے اعتبار سے شعلے کی طرح جلا ڈالنے والی ہے۔ غیرت مند اور شور و غوغا بڑھانے اور پسند کرنے والی ہے۔ اس کی عادت ہے کہ یہ اپنے لئے مشکلات جھیلے اور دشواریاں چاہے۔ یعنی آرام و چین اور چین و سکون زندگی کی فطرت نہیں ہے۔ شام کی خاموشی سے لے کر صبح کے شور و غوغا تک رات بظاہر خاموشی سے گذرتی ہے لیکن درحقیقت یہ خاموشی بھی اپنے دامن میں نصف شب کو کھینچے جانے والے ہزار ہا نالوں اور آہوں کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ تاریک، باصن مٹی ہی سے حلب میں بننے والا نہایت نفیس اور اعلیٰ آئینہ تیار ہوتا ہے۔ لیکن مٹی کو آئینے کے مرتبے پر پہنچنے کے لئے ہزاروں مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اِس مٹی کو آئینہ بننے کے لئے سردی گرمی، حدت و حرارت اور زنراش و خراش کے بیشمار مرحلے پیش آتے ہیں۔

موسم بہار کے بادل سے برسنے والی بارش کے ایک قطرے اور انگور سے حاصل ہونے والی شراب میں بظاہر کچھ فرق نہیں لیکن بارش کے ایک قطرے کو انگور کی آگ بننے کے لئے پہلے انگور کی بیل میں سرایت کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ قطرہ انگور بن کر بیل پر لگتا ہے پھر اسے توڑا جاتا ہے پھر نچوڑنے، پکانے اور شراب کو دیگر آلائشوں سے جدا کرنے کے لئے کشید کے مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر شراب بنتی ہے۔

یہی مسلسل کشمکش جس نے رات کو صبح میں بدلا، مٹی کو شیشہ بنایا اور پانی کے ایک قطرے کو شراب کے مرتبے پر فائز کیا، تمام قوموں کی زندگی کا حقیقی سبب ہے اور ملتِ اسلامیہ کی چمک دمک کا راز بھی یہی ہے۔ یعنی ملتِ اسلامیہ نے بھی کشمکش اور جد وجہد کے انہی مراحل کو طے کر کے عروج حاصل کیا۔

شراب بنانے والے بظاہر انگور کو پانی بناتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ستارے توڑتے ہیں اور ان سے سورج بناتے ہیں۔

صدیق رض

(۲۲۴)

تعارف اِس نظم میں خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیق رض کے ایثار و قربانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو واقعہ اِس نظم میں پیش کیا گیا ہے وہ جنگ تبوک میں پیش آیا تھا۔

نظرِ ثانی میں اِس نظم کے آخری شعر کے پہلے مصرع میں جزوی ترمیم کی گئی تھی۔ پہلا مصرع سرودِ رفتہ میں درج ہے۔

حلِ لغات فرط: زیادہ ؛ طرب: خوشی ؛ درہم: پرانے زمانے میں رائج سکے کا نام ؛ راہوار: گھوڑا ؛ دست نگر: محتاج ؛ عیال: اولاد ؛ خویش و اقارب: رشتہ دار اور عزیز ؛ استوار: مضبوط ؛ مِلک یمین: دائیں ہاتھ کی ملکیت مراد لونڈی ؛ دینار: پرانے زمانے میں رائج سکے کا نام ؛ رخت: لباس، ساز و سامان ؛ جنس: غلہ ؛ اسپ قمر سم: چاند جیسے سموں والا گھوڑا۔ قاطر: خچر ؛ حمار: گدھا ؛ تکوین: پیدا ہونا، تخلیق ہونا ؛

ع اک دن رسولِ پاک ص نے اصحاب سے کہا ۔ ۔ ۔

وضاحت ایک دن آنحضرت ص نے اپنے صحابہ اور ساتھیوں سے فرمایا کہ تم میں جو لوگ مالدار اور دولت مند ہوں وہ اپنی دولت اللہ کے راستے میں عطیہ کے طور پر دیں آنحضرت ص کا یہ ارشاد سن کر حضرتِ عمر فاروق رض حد درجہ خوشی کے عالم میں اُٹھے۔ انھیں اِس بات کی خوشی تھی کہ اس دن اُن کے پاس کئی ہزار درہم تھے۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہے تھے کہ آج میں یقیناً حضرت ابو بکر صدیق رض سے زیادہ مال راہِ خدا میں صرف کر کے ان سے بازی لے جاؤں گا آخر وہ آنحضرت ص کی خدمت میں اپنا مال و اسباب لے کر پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی کام کا آغاز ایثار و قربانی کا تقاضا کرتا ہے اور اِس کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

جب حضرتِ عمر رض اپنا مال لے آئے تو آنحضرت ص نے ان سے دریافت فرمایا کہ اے عمر رض بیشک اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث تمھارے دل کو چین و سکون میسر ہے لیکن یہ بتاؤ کہ کیا اپنی

اولاد کے لیے بھی گھر میں کچھ رہنے دیا ہے یا نہیں۔ اِس لیئے کہ بہرحال ایک مسلمان اپنے عزیز اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا بھی پابند ہے۔ حضرتِ عمر فاروق رضؓ نے جواب دیا کہ جناب آدھے مال پر لڑکے اور بیوی کا حق ہے۔ باقی آدھا ملتِ اسلامیہ کے لئے قربان کرنے کے لئے لے آیا ہوں۔

۵ اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ آنحضرتؐ کے دوست جن سے عشق و محبت کی بنیاد مضبوط اور قائم ہے۔ یعنی حضرتِ ابوبکر صدیق رضؓ بھی آ پہنچے۔ یہ وفا کی عادت رکھنے والا شخص اپنے ساتھ ہر وہ چیز لے آیا جس سے کوئی شخص اِس دنیا میں باعزت کہلا سکتا ہے۔ وہ جو کچھ لائے اس میں لونڈیاں، درہم، دینار، لباس، غلہ، چاند جیسے سموں والے گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے شامل تھے۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ راہ حق میں خرچ کرنے علاوہ کچھ آل و اولاد کی فکر بھی کرنی چاہیئے۔ اس کے جواب میں وہ عشق و محبت کے راز جاننے والا کہنے لگا کہ اے رسولؐ! آپ کی ذاتِ بابرکات سے چاند اور ستاروں کی آنکھیں فروغ پاتی ہیں اور آپؐ کی ذات اِس کائنات کی تخلیق و پیدائش کی وجہ ہے۔ اس دنیا میں پروانے کے لیے شمع اور بلبل کے لیے پھول کافی ہے اور مجھ صدیقؓ کے لیے بھی بس خدا کے رسولؐ کافی ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

تہذیبِ حاضر

(۲۲۵)

حل لغات تضمین: کسی دوسرے شاعر کے شعر یا مصرع کو کلام کی مناسبت سے اپنے کلام میں شامل کر لینا۔ فیضی: مغلِ اعظم جلال الدین اکبر کا ہندی نژاد فارسی گو شاعر جو ۹۵۰ھ میں پیدا ہوا اور ۱۰۰۴ھ میں وفات پا گیا۔ فیضی عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت چاروں زبانوں پر مہارت رکھتا تھا۔ بھبھوکا: آگ کا شعلہ۔ تابِ مستعار: ادھار دی

ہوئی چمک ؛ **تدبر** : تدبیر کرنے کا عمل ؛ **ناشکیبائی** : بے صبری ؛ **کہنہ ادراکی** : پختہ عقل یا

۵ حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں ۔ ۔ ۔

وضاحت

موجودہ عہد کی شراب میں غضب کی حرارت اور گرمی ہے ۔ اتنی گرمی کہ اس کے اثر سے مسلمانوں کا مٹی کا بنا ہوا جسم شعلہ بن کر جل اٹھا ہے ۔ موجودہ زمانے میں چمکنے والے اور جلوے والے سورج کی شوخی دیکھئے کہ اس نے ایک حقیر ذرے کو چمک دمک ادھار دے کر جگنو بنا دیا ہے ۔ اس تہذیب کی وجہ سے نوجوانوں نے بالکل نئے انداز سیکھ لئے ہیں مثلاً بناؤ سنگھار کا پیدا کردہ حسن ، دیر تک جاگنا ، ہر پابندی سے آزادی اور بے خوفی جو درحقیقت گستاخی کا دوسرا نام ہے ۔ تہذیب حاضر کی وجہ سے ان نوجوانوں کے تدبر اور تخیل میں ایسا انقلاب آگیا ہے کہ یہاں پر پھولوں کی جگہ جاگی یعنی خلوص کے ساتھ انجام دیئے گئے کارناموں کو محض مذاق سمجھا جانے لگا ہے ۔ اس دور کے جادوگر یعنی تہذیب نے ایسے دل لبھانے والے منظر دکھائے کہ تازہ پروانوں یعنی نوجوانوں نے اپنے آشیاں کو فراموش کر دیا یعنی اپنی اصل سے تعلق منقطع کر لیا ۔ اس تہذیب کے زیر اثر پروان چڑھنے والی زندگی اپنے ساتھ کیسی عجیب وغریب لذتیں لے کر آئی ہے ، ان لذتوں میں رشک وحسد ، اپنے آپ کو فروخت کر دینا ، بے صبری اور حرص ولالچ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ نوجوان انہی جذبوں کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں ۔ مسلمانوں کی محفل بھی نئی شمع کی روشنی سے جگمگانے لگی اس کے باوجود میری پختہ اور سرد وگرم زمانہ سے آشنا عقل ان نوجوانوں کو کہتی ہے کہ اے پروانے تو نے یہ گرمی اور حرارت ایک شمع محفل سے حاصل کی ہے یعنی اس میں تیرا کمال نہیں ۔ اگر تو اپنے دل میں سوز وجلن رکھتا ہے تو تو اپنی ہی آگ اور حرارت میں جل ۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں

(۲۲۶)

تعارف

علامہ اقبال نے یہ نظم اپنی والدہ کے انتقال پر مثنوی کی ہیئت میں مرثیہ کے طور پر لکھی۔ جس میں مرثیہ کے علاوہ موت وحیات کے رموز واسرار پر بھی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ "اقبال کی طویل نظمیں" میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ یہ نظم ابتداء میں گیارہ بندوں اور ۸۹ اشعار پر مشتمل تھی۔ نظرثانی میں کچھ شعر حذف کر دیئے گئے اور کچھ اشعار کا اضافہ بھی ہوا۔ موجودہ صورت میں نظم تیرہ بندوں اور ۶۸۰ اشعار پر مشتمل ہے، اس طرح دیکھا جائے تو نئے سرے سے اضافہ کئے گئے اشعار سے قطع نظر حذف کئے گئے اشعار کی تعداد ۲۱ بنتی ہے جبکہ اس نظم کے حذف شدہ اشعار کے سلسلے میں روزگار فقیر میں صرف ایک شعر دیا گیا ہے جب کہ سرودِ رفتہ میں یہ تعداد ۱۱ شعروں تک پہنچتی ہے۔ ایک اور امر قابلِ وضاحت ہے اور وہ یہ کہ نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں ۶۸ کی بجائے ۸۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ بہرحال اسے کاتب کی غلطی تصور کرنا چاہیئے۔

علامہ اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ یہ انتہائی شریف النفس، پاکیزہ اور متقی خاتون تھیں۔ اَن پڑھ ہونے کے باوجود اقبال کی تربیت میں انھوں نے زبردست کردار ادا کیا۔ ان کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر نے مطالبِ بانگ درا میں ۱۹۱۵ء لکھا ہے جو درست نہیں۔

حلِ لغات

زندانی تقدیر: قسمت کا قیدی۔ انجم سیماب پا: پارے جیسے پاؤں رکھنے والے ستارے، یعنی ہمہ وقت متحرک رہنے والے ستارے، سبو: مٹکا۔ نیرنگی: تبدیلی، تغیر۔ خنداں: ہنستا ہوا۔ گریاں: رونے والا۔ قاصد: پیغام لانے والا۔ حکمت: دانائی۔ پائندہ: مضبوط و مستحکم۔ عرفان: حقیقت معلوم ہونا، واقفیت۔ دود: دھواں۔ گنجِ آب آورد: پانی کا لایا ہوا خزانہ یعنی آنسو۔ رفتہ: گذرا ہوا وقت، ماضی۔ محرم: آشنا، واقف۔ چشمِ گوہر بار:

موتی برسانے والی آنکھ ۔ مرقد : قبر، مزار ۔ طفلک بے دست و پا : بے بس بچہ ۔ محکم : مضبوط و استوار ۔ برنا : جوان ۔ پیر : بوڑھا ۔ دوش : گزری ہوئی کل، ماضی ۔ فردا : آنے والی کل، مستقبل ۔ ارزاں : سستی ۔ کلبہ : تنگ و تاریک گھر ۔ کاشانہ : گھر، محل ۔ قلزم : سمندر ۔ گلوافشار : گلا گھونٹنے والا ۔ درا : گھنٹی ۔ نہ پردۂ گردوں : نو آسمانوں کا پردہ، قدیم علم ہیئت میں آسمانوں کی تعداد سات یا نو تصور کی جاتی تھی، اُسی کی طرف اشارہ ہے ۔ خاک بے سپر : پامال ہونے والی مٹی ، یہاں پر جسم مراد ہے ۔ رازِ نہاں : چھپا ہوا بھید ۔ حباب : بلبلہ ۔ حجت : دلیل ۔ سیماب : پارا ۔ ممنون : احسان مند ۔ قدسی : پاک، منزہ، فرشتے ۔ مضراب : ساز بجانے کا آلہ ۔ کم بہا : کم قیمت والا ۔ تخم : بیج ۔ مستور : چھپا ہوا ۔ خودنمائی : اپنا اظہار چاہنا ۔ خود فزائی : اپنے آپ کو بڑھانا اور پھیلانا ۔ تربت : قبر ۔ آشفتہ : بکھری ہوئی ۔ تجدید : جدید بنانا تازہ کرنا ۔ خوگر : عادی ۔ سنجیدن : پر تولنا ۔ افسوں : جادو ۔ ناگہاں : اچانک ۔ سرشک آباد : آنسوؤں سے بھری ہوئی ۔ شکیبائی : صبر ۔ دلاسائی : دل کی تسلی اور اطمینان ۔ خفتگان : سوئے ہوئے ۔ رود بار : دریا، ندی، نالے ۔ آئین : دستور، قاعدہ ۔ دامِ سیمیں : چاندی سے بنا ہوا جال ۔ بے ثبات : ناپائیدار ۔ جولاں گاہ : گھوڑے دوڑانے کا میدان، میدانِ جنگ ۔ فروزاں : روشن ۔ شبستاں : رات گذارنے کی جگہ، آرام گاہ ۔ لحد : قبر ۔ سبزۂ نورستہ : تازہ اگا ہوا سبزہ ۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے — — —

وضاحت

اس کائنات کا ایک ایک ذرہ تقدیر اور قسمت کا قیدی ہے ۔ جس چیز کو ہم تدبیر کا نام دیتے ہیں وہ دراصل اپنی مجبوری اور بے بسی پر پردہ ڈالنے کی ایک صورت ہوتی ہے ۔ کائنات میں آسمان بھی مجبور ہے ۔ سورج اور چاند بھی مجبور ہیں اور پارے کی طرح متحرک پاؤں رکھنے والے ستارے بھی چلنے اور سفر کرنے پر مجبور ہیں اور وہ کسی بھی حالت میں رُک نہیں سکتے ۔ غنچے کے مٹکے یعنی پھول کا انجام ٹوٹنے کے سوا کچھ نہیں ۔ گلستان میں خواہ سبزہ ہو یا پھول ہو، یہ سب اِس امر پر مجبور ہیں کہ نمو پائیں اور پھلیں پھولیں ۔

خواہ بلبل کا نغمہ ہو یا انسان کے ضمیر کی خاموش آواز، سب چیزیں سارے عالم پر محیط اسی تقدیر کی زنجیر کی قیدی ہیں ۔

؎ آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سِر مجبوری عیاں - - -

وضاحت

جب ہماری آنکھوں پر اپنی مجبوری اور بے بسی کا راز کھلتا ہے تو غم واندوہ کی وجہ سے دل میں پیدا ہونے والا آنسوؤں کا سیلاب خود بخود خشک ہو جاتا ہے - یعنی انسان اپنی مجبوریوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا ہے - ایسی صورت میں انسان کے دل میں عیش اور غم کا احساس باقی نہیں رہتا - زندگی کا گیت تو باقی رہتا ہے لیکن اس کا اتار چڑھاؤ اور اس کے نیچے اُونچے سُر ختم ہو جاتے ہیں - یعنی انسان پر ایک بے حسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ مختلف جذبوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے - چیزوں کے بارے میں واقفیت اور دانائی درحقیقت اشکوں اور آہوں کے اثاثے کے لیے رہزن کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی زندگی کے اسرار و رموز سے واقف دل، دل نہیں بلکہ پتھر کا ٹکڑا ہو جاتا ہے - میں بھی زندگی کے بھیدوں سے واقف ہوں اسی لیے میرے باغ میں شبنم کی پیدا کردہ سرسبزی وشادابی نہیں ہے اور میری آنکھوں میں خون کے آنسو نہیں ہیں - دراصل میں انسان کے غم والم کا راز جانتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میری طبیعت شکوہ وشکایت کی طرف مائل نہیں ہوتی - میرے ہونٹوں پر زمانے کے تغیرات اور تبدیلیوں کی کہانی نہیں ہے - نہ میرا دل زندگی کی صورتحال پر حیرت زدہ ہوتا ہے - نہ میں خوشی کے موقع پر ہنستا ہوں اور نہ حادثاتِ غم پر روتا ہوں -

اِس کے باوجود اے والدۂ ماجدہ تیری تصویر مسلسل اور لگاتار رونے کا پیغام لاتی ہے یعنی میں تیری تصویر دیکھتا ہوں تو رونے لگتا ہوں - افسوس کہ یہی بات میری پختہ واستوار دانائی کی تردید کر دیتی ہے - یعنی رونے کی کیفیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ میں زندگی کے اسرار و رموز سے بے خبر ہوں -

؎ گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے - - -

وضاحت

مسلسل رونے سے زندگی کی بنیاد مضبوط ومستحکم ہوتی ہے - درد اور تکلیف کی حقیقت جاننے کے سلسلے میں پتھر دل عقل عاجز ہے - میرا آئینۂ آہوں کے دھوئیں کی موجوں سے روشن اور شفاف ہے اور میرا دامن پانی کے لاتے ہوئے خزانے یعنی آنسوؤں کے خزانے سے بھرا ہوا ہے - میں تیری تصویر کے معجزے پر حیران ہوں - اِس تصویر نے وقت کی پرواز کی سمت کو بالکل ہی بدل ڈالا ہے - یعنی تیری تصویر نے حال و ماضی کو یکجا کر دیا ہے - اور جوانی کے اِس دور میں مجھے میرے بچپن سے ہمکنار کر دیا ہے - وہ بچپن جب میری کمزور جان

تیرے دامن کے زیرِ سایہ پرورش پا رہی تھی اور میں نے ابھی بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب کہ آج ہر جگہ میری شوخ شاعری کا ذکر ہو رہا ہے یعنی لوگ میری شاعری کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور آج میری موتی برسانے والی آنکھ کے آنسو اپنی قیمت کے اعتبار سے انمول ہیں۔

؎ علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور ۔۔۔

وضاحت علم حاصل کرنے اور عالم بن جانے کے بعد سنجیدہ اور لائق توجہ گفتگو، اپنے بڑھاپے اور عمر کے باعث حاصل ہونے والی دانائی اور عقل، دنیا میں حاصل ہونے والے مراتب و مناصب اور اُن کی شان، جوانی اور اس کا ولولہ و جوش، غرور و تکبر، اپنی ماں کے سامنے انسان ان سب بلندیوں سے اُتر آتا ہے اور صرف ایک سادہ اور معصوم بچہ بن جاتا ہے، اپنی ماں کے سامنے بڑے بڑے لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر ہنستے مسکراتے اور قہقہے لگاتے ہیں اور ہر طرح کے تفکرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ جنت جو بچپن کی عمر گذرنے کے بعد انسان سے چھن جاتی ہے، ماں کے سامنے اُسے پھر پا لیتے ہیں اور وہ خود کو اُس دنیا میں محسوس کرتے ہیں۔

؎ کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار ۔۔۔

وضاحت والدۂ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہمیشہ میرے خط کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ اب وطن میں میرے خط کا کون انتظار کرے گا اور اگر چند دن میرا خط نہ ملا تو میرا خط نہ آنے کی وجہ سے کون بے تاب اور بے چین ہوگا؟ میں تیری قبر پر یہ فریاد لے کر آؤں گا کہ اب آدھی رات کے وقت کی جانے والی پُرخلوص دعاؤں میں مجھے کون یاد کرے گا اور کون میرے لیے دُعاگو ہوگا۔ تیری تربیت کے باعث مجھے ستاروں جیسی قسمت اور تقدیر ملی۔ واضح ہو کہ ستارے بہت بلند، روشن اور رات کی تاریکی میں مسافروں کے لیے رہنما ہوتے ہیں۔ تیری ہی تربیت کے باعث میں اس قابل ہوا کہ میری وجہ سے میرے بزرگوں کے گھر کو عزت و وقعت ملی۔ ہستی کی کتاب میں تیری زندگی ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ میرے لیے اوّل تا آخر دین اور دنیا میں بہترین سبق ثابت ہوئی۔ تو نے تمام زندگی بڑی محبت سے میری خدمت کی لیکن افسوس کہ جب میں تیری خدمت کرنے کے قابل ہوا تو تیرا انتقال ہو گیا۔ وہ جوان جو جسامت میں بلند و بالا سرو جیسا ہے اور جس نے میری نسبت کہیں زیادہ تیری خدمت کی ہے، وہ جو زندگی کے کاروبار میں میرا شریک ہے جو مجھ سے تیری ہی طرح محبت کرتا ہے اور وہ جو میرا

بازو یعنی مددگار اور معاون ہے، تیری وفات پر غم کی وجہ سے ایک بے بس بچے کی طرح روتا ہے، وہ صبر سے بالکل ناواقف ہے اور اسے صبح و شام صرف رونے سے کام ہے۔ جوان سے مراد اقبال کے بڑے بھائی ہیں۔

تو ہماری جان کی کھیتی میں جس محبت کا بیج کاشت کر گئی تھی وہ محبت تیری وفات کے غم میں شرکت کے باعث مزید پختہ اور مضبوط ہو گئی ہے۔

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر — — —

وضاحت

آہ! یہ دنیا کیا ہے۔ یہ تو ہر جوان اور بوڑھے کے لئے ماتم اور رنج و اندوہ کے گھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن آدمی اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اور معلوم نہیں وہ ماضی اور مستقبل کے کس جادو میں پھنسا رہتا ہے۔ زندگی اور موت کا تقابل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی گذارنا کس قدر مشکل کام ہے جب کہ موت کتنی آسان ہے۔ دنیا میں موت اتنی ہی سستی ہے جتنی باغ میں نسیم ارزاں ہوتی ہے۔ انسان کے لئے موت کا پیغام لانے کے لئے زلزلے، بجلیاں، قحط اور مصیبتیں نجانے کیا کیا کچھ موجود ہے۔ اور زمانے کی ماں نے اس کام کے لئے کیسی کیسی بیٹیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ غربت کے تنگ و تاریک گھر اور امراء کے عشرت کدوں میں بھی موت موجود ہے۔ بیابان و صحرا، شہر، باغ اور ویرانے بھی موت سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ موت ان سمندروں میں بھی موجود ہے جو ہر طرح کے ہنگاموں اور طوفانوں سے محفوظ تصور کئے جاتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ موج اور لہروں کی گود میں سفر کرنے والے جہاز کشتیاں غرق ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود نہ کسی کو شکایت کرنے کی جرأت ہے اور نہ بات کرنے کا حوصلہ۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ زندگی زندگی نہیں بلکہ گلا گھونٹنے والے طوق کی حیثیت رکھتی ہے۔

دیکھا جائے تو زندگی کے قافلے میں گھنٹی کی فریاد کے علاوہ کوئی دوسری چیز موجود نہیں یہاں پر زندگی کی صرف ایک دولت ہے اور وہ دولت بھیگی ہوئی اور رونے والی آنکھ ہے۔

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی — — —

وضاحت

لیکن آخر کار امتحان کا یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ نو آسمانوں کے پردے کے پیچھے ابھی کچھ مزید دور بھی باقی ہیں جنھیں ظہور پذیر ہونا ہے۔ اگر اس دنیا میں لالہ و گلاب کے سینے چاک ہیں اور بلبل آہ و زاری پر مجبور رہے تو

کیا ہوا؟ وہ جھاڑیاں جن کے پنجرے میں خزاں کی آہ قید ہے یعنی جو خزاں کی نذر ہو چکی ہیں انھیں ہمیشہ رہنے والی بہار کی ہوائیں نئے سرے سے ترو تازہ کر دے گی۔ اگر ہماری زندگی کی چنگاری یعنی روح پامال ہونے والی مٹی میں سوئی ہوئی ہے اور مٹی سے بنا ہوا یہ جسم ہمارے لئے عارضی اور وقتی پہناوے کی حیثیت رکھتا ہے تو کیا ہوا؟ یہ بات تو طے ہے کہ زندگی کی آگ کا انجام صرف راکھ نہیں ہے۔ زندگی ایسا موتی نہیں ہے جس کے مقدر میں شکست لکھی ہو۔

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ـــ

وضاحت

زندگی قدرت کی نگاہ میں اتنی پیاری ہے کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کرتے ہوئے اس کی فطرت میں اپنی زندگی کی حفاظت کا جذبہ رکھ دیا ہے اگر موت زندگی کو فنا کرنے کی قوت رکھتی ہے اور زندگی کا نقش موت کے ہاتھوں مٹ سکتا تو کائنات کا نظام موت کو اس قدر عام نہ کر دیتا۔ اگر موت بہت سستی اور ارزاں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے بالکل اسی طرح جس طرح سو جانے سے آدمی کی زندگی میں کسی طرح کا نقص واقع نہیں ہوتا۔ گویا اقبال کے نزدیک موت انسان کے سو جانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اے غافل! موت کا پوشیدہ راز درحقیقت کچھ اور ہے اور اگر زندگی کا نقش ناپائیدار اور فنا ہونے والا ہے تو اس سے کچھ اور حقیقت واضح ہوتی ہے۔ پانی کی سطح پر ہوا کے ذریعے بننے والے نقوش یعنی بلبلوں کا نظارہ بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔ مضطرب اور بے چین موجیں بلبلوں کو توڑتی اور پھر نئے سرے سے تعمیر کرتی ہیں اور پھر ہوا ان بلبلوں کو موج کے دامن میں چھپا دیتی ہے یعنی ختم کر دیتی ہے۔ دیکھئے ہوا نے اپنا بنایا ہوا نقش کتنی بیدردی کے ساتھ مٹا دیا ہے۔ اگر ہوا یہ نقش نئے سرے سے تعمیر نہ کر سکتی تو پھر اس کو مٹانے اور بگاڑنے میں وہ اس قدر بے پروائی سے کام نہ لیتی۔ کیا کبھی غور کیا کہ ہوا کے اس طریق کار سے تعمیر کی صلاحیت پر کیا اثر پڑتا ہے یعنی کوئی منفی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ تو اس بات کی دلیل ہے کہ ہوا ان نقوش اور بلبلوں بار بار بنانے اور تعمیر کرنے کی قوت سے مالا مال ہے۔

اِس سے ایک ہی بات خیال میں آتی ہے اور وہ یہ کہ شاید زندگی کی فطرت ہمیشہ نئی نئی آرزوؤں کی شیدائی اور عاشق رہتی ہے اور اسے اپنے لئے ہمیشہ کسی زیادہ بہتر جسم کی تلاش رہتی ہے۔

آہ! سیماب پریشاں انجم گردوں فروز - - -

وضاحت

آہ یہ آسمان پر بکھرا ہوا پارا یعنی وہ ستارے جو آسمان کو روشن کئے ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ متحرک رہتے ہیں یہ شوخ چنگاریاں جو اپنی روشنی کے لئے رات کے احسان مند ہیں یعنی صرف رات کو چمکتی ہیں - عقل ان کی عمر کے بارے میں غور کرتی ہے تو کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے حیران رہ جاتی ہے - اس لئے کہ انسان کی عمر ان ستاروں کے مقابلے میں صرف ایک لمحے کے برابر ہے - ان ستاروں کے مقابلے میں انسان جس کی نظر آسمان سے بھی آگے دیکھتی ہے اور جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے فرشتوں سے بھی بلند ہے - جو قدرت کی محفل میں ایک جلتی ہوئی اور روشن شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی فطرت اور صلاحیتوں کے مقابلے میں آسمان کی حیثیت صرف ایک نقطے جیسی ہے اور جو اپنی ناسمجھی کے باعث زندگی کے حقائق جاننے کے لئے بے چین ہے اور جس کا وجود زندگی کے ساز کے لیے مضراب کی حیثیت رکھتا ہے - کیا یہ شعلہ یعنی انسان اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے آسمان کی ان چنگاریوں یعنی ستاروں سے بھی کمتر درجے کا ہے اور کیا یہ آفتاب یعنی انسان ان ستاروں سے بھی کم قیمت ہے - اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر ستاروں کی زندگی اس قدر طویل ہے کہ پوری حیات انسانی اس کے مقابلے میں ایک لمحے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تو پھر انسان ستاروں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہونے کے باعث یقیناً فانی نہیں -

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خواب بھی بے باک ہے - - -

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ پھول کے بیج کی آنکھیں مٹی میں دفن ہو کر بھی جاگتی رہتی ہیں - اسی سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ یہ بیج نشو و نما پانے اور پروان چڑھنے کے لیے کتنا بے تاب اور بے چین ہے - اس بیج میں زندگی کا جو شعلہ چھپا ہوا ہے، وہ اپنے اظہار اور نمود کے لئے فطری طور پر مجبور ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی قبر کی سردی کے باوجود بجھ نہیں پاتا اور مٹی میں دب جانے کے باوجود اپنی جلن سے محروم نہیں ہوتا - زندگی کی اسی خواہش کے نتیجے میں بیج پھول بن کر اپنی قبر سے نکل آتا ہے - گویا اس طرح موت کے ہاتھوں زندگی کا لباس پہنتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبر انسان کو فنا نہیں کرتی بلکہ انسان کی ان منتشر صلاحیتوں اور قوتوں کو منظم کرتی ہے جو آسمان کی گردن میں بھی اپنی کمند ڈال سکیں - اس طرح دیکھا جائے تو موت فنا نہیں کرتی بلکہ زندگی کے ذوق کی تجدید کا دوسرا نام ہے اور نیند اور خواب کے پردے

میں دراصل جاگنے کے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔

پرواز کرنے کے عادی کو پرواز کے دوران میں کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا اور موت اس کائنات میں نئے سرے سے پرواز کرنے کے لیے پر تولنے اور تیار ہونے کا دوسرا نام ہے۔

؎ کہتے ہیں اہل جہاں دردِ اجل ہے لا دوا ۔ ۔ ۔

وضاحت دنیا والے کہتے ہیں کہ موت کے درد کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کے باوجود موت کی وجہ سے اپنے عزیز و اقارب کی جدائی کا جو زخم لگتا ہے، وہ وقت گذرنے سے شفا پالیتا ہے۔ یعنی گذرنے کے ساتھ ساتھ انسان دکھ اور صدمے کو بھول جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل، جہاں مرنے والوں کا غم آکر آباد ہوتا ہے، صبح و شام کی قید یعنی وقت کی گذران سے آزاد ہوتا ہے۔ گریہ و زاری اور نالۂ غم وقت کے جادو سے بھی نہیں رکتا۔ دراصل جدائی کی تلوار کے زخم کے لئے وقت بھی مرہم اور دوا کی حیثیت نہیں رکھتا۔ انسان پر جب بھی کوئی مصیبت آ پڑے تو اس کی آنکھوں سے لگاتار بہنے والے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور پھر انسان کا دل نالہ و فریاد کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور انسان کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں سے دل کا خون بہنے لگتا ہے۔ اگرچہ انسان صبر کی قوت سے محروم ہے اس کے باوجود اس کی فطرت میں ایک نامعلوم اور غیر محسوس سا خیال چھپا ہوا ہے اور وہ یہ کہ انسان کا جوہر موت سے واقف نہیں ہے۔ انسان موت کے بعد بیشک ہماری نگاہوں سے چھپ جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ غم کے شعلوں کے باعث زندگی کا لباس خاک ہو جاتا ہے لیکن غم کی یہ آگ صرف اسی احساس کی بدولت بجھتی ہے کہ مرنے والا فنا نہیں ہوا بلکہ تھوڑے وقت کے لئے ہم سے جدا ہوا ہے۔

اگر ایک انسان اپنے کسی عزیز کی وفات پر آہ و فریاد کو ضبط کرتا اور رونے دھونے سے گریز کرتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ غم کے احساس سے غافل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ موت کے اسرار سے واقفیت کے باعث مطمئن ہے۔

؎ پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح ۔ ۔ ۔

وضاحت جب مشرقی افق سے صبح طلوع ہوتی ہے تو یہ صبح ساری دنیا کے دامن سے رات کی تاریکی کا داغ دھو دیتی ہے۔ یعنی اندھیرا بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ لالے کے مرجھائے ہوئے پھول کو آتشیں اور سرخ لباس عطا کرتی ہے۔ وہ پرندے جو زبان نہیں رکھتے انھیں نغمے گانے میں مست کر دیتی ہے۔ بلبل کے سینے کے قید خانے سے گانے آزاد ہوتے ہیں اور صبح کی ٹھنڈی ہوا ہزاروں نغموں سے آباد ہو جاتی ہے۔ زندگی کے وہ تمام مظاہر جو باغوں، پہاڑوں

اور درباؤں میں محوِ خواب ہوتے ہیں، صبح ہوتے ہی زندگی کی ہماہمی سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔
غور کیجئے کہ اگر زندگی کا یہی قانون ہے کہ ہر رات کے بعد صبح طلوع ہو اور پھر سے زندگی کا آغاز ہو جاتے تو آخر انسان کی قبر کی رات کیوں ختم نہ ہوگی اور انسان نئے سرے سے کیوں زندگی کا آغاز نہیں کرے گا؟

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر ـ ـ ـ ـ

وضاحت میرے خیالات کا چاندی جیسا جال تمام دنیا پر محیط ہے اور اے والدۂ مرحومہ میں نے تیری یادوں کو اِس جال میں اسیر کر لیا ہے۔ میرا دکھیا دل تیری یاد سے بھرا ہوا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے کعبے کی فضا دعاؤں سے بھری ہوتی ہے۔ زندگی نوائص کے تسلسل کا نام ہے۔ زندگی لاکھوں ناپائیدار دنیاؤں میں جلوہ گر ہے۔ لیکن زندگی کی ہر منزل کا طریقہ مختلف ہے۔ آخرت یعنی مرنے کے بعد انسان جس دنیا میں جاتا ہے وہ بھی زندگی ہی کا ایک میدان ہے موت کی کھیتی پر وہاں کوئی پھل نہیں آتا یعنی اس دنیا میں موت نہیں ہے۔ البتہ وہاں کی دنیا عمل کے لئے بہت سازگار اور مناسب ہے۔ فطرت کا نور جسم کے اندھیروں کا قیدی نہیں ہے یعنی وہاں انسان اپنے جسم کے ساتھ موجود نہیں ہوگا صرف روح ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر انسانی فکر کا دائرہ اس قدر تنگ نہ ہوگا جس قدر اس دنیا میں جسم کی تحدید کی وجہ سے تنگ اور محدود رہنے۔

اے والدۂ ماجدہ تیری زندگی چاند سے بھی زیادہ روشن تھی اور تیرا سفر صبح کے ستارے کے سفر سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ خدا کرے کہ صبح کے گھر کی طرح تیری قبر بھی منور اور روشن رہے اور تیری مٹی سے بنی ہوئی آرام گاہ یعنی قبر نور سے لبریز رہے۔

خدا کرے کہ آسمان تیری قبر پر شبنم برسائے اور تیری قبر کی نگہبانی تازہ اُگا ہوا سبزہ کرے۔ گویا اس طرح علامہ اقبال نے نہایت دلآویز اور دلکش انداز میں اپنی والدہ کے لئے مغفرت کی دُعا کی ہے۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ کی سنت اور عمل سے ثابت ہے کہ جس قبر پر سر سبز و شاداب پتے اور شاخیں رکھ دی جائیں اُس قبر میں مرنے والے کو راحت اور سکون ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قبر پر سبزہ اُگا ہوگا اُس کی میت کے لئے راحت ہی راحت ہے۔

شعاعِ آفتاب

(۲۲۷)

تعارف علامہ اقبال نے یہ نظم پندرہ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ایک مشاعرے میں پڑھی تھی جو گورنر پنجاب سر مائیکل اڈوائر کے حکم پر جنگ عظیم اول میں اتحادیوں کی فتح کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ یہ نظم پہلی مرتبہ یکم ۱۹۱۹ء کو اخبار "حق" میں شائع ہوئی۔ نظر ثانی میں فرہنگ اقبال اور باقیاتِ اقبال کے مطابق اس نظم کا صرف آخری شعر بدلا گیا جب کہ مولانا مہر کے مطابق ساتویں شعر کے پہلے مصرع میں بھی جزوی ترمیم ہوئی۔ سرودِ رفتہ میں یہ مصرع اور متروک شعر دونوں کا متن درج ہے۔

حلِ لغات **ناشکیبا**: بے صبر۔ **خُو**: عادت۔ **خفتہ**: سوئے ہوئے۔ **تنویر**: روشنی۔ **ناری**: آگ سے بنی ہوئی۔ **مہرِ عالم تاب**: ساری دنیا کو روشن کرنے والا، سورج۔ **جویا**: متلاشی۔

ع صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی ۔۔۔

وضاحت صبح کے وقت جب میری نگاہ مختلف منظر دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی تو میں نے آسمان پر سورج کی ایک شعاع کو ادھر ادھر گھومتے پھرتے دیکھا۔ میں نے اس شعاع سے پوچھا کہ اے سر سے پاؤں تک مضطرب رہنے والی آخر تیری بے صبر جان میں یہ کیسی بے چینی ہے؛ کیا تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے جسے آسمان قوموں کے کھلیان کے لئے جوان کر رہا ہے یعنی کیا مستقبل میں تجھ سے قوموں کی تباہی و بربادی کا کام لیا جانا ہے۔ تیرا اِدھر اُدھر گھومنا تیری تڑپ اور بے تابی کی وجہ سے ہے یا ازل سے اللہ نے اسے تیری عادت بنا دیا ہے۔ اسے تیرا ناچ اور آوارگی کہنا چاہیئے یا تجھے کسی چیز کی تلاش ہے جس کی وجہ سے تُو اِدھر اُدھر پھرتی ہے۔

ع خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں ۔۔۔

وضاحت شعاع اقبال کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ میری خاموش زندگی میں ہنگامے سو رہے ہیں۔ میں صبح کی گود میں پروان چڑھی اور پلی ہوں مجھے میری تقدیر ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی ہے۔ میں اِدھر اُدھر پھرتی ہوں تو دراصل

مجھے روشنی کی تلاش ہے۔ اگرچہ میں آگ سے بنی ہوں، اِس کے باوجود میری عادت آتشیں بجلی جیسی نہیں ہے بلکہ میں تو ساری دنیا کو منور کر دینے والے سورج کی طرف سے دنیا کے لیے بیداری کا پیغام لے کر آتی ہوں۔ میں انسان کی آنکھ میں سُرمہ بنکر سما جاؤں گی اور رات نے اپنے تاریک پردے میں جو کچھ چھپا دیا تھا، وہ لوگوں پر ظاہر کر دوں گی یعنی ہر چیز کو روشن کر دونگی۔

بس تم صرف یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے مستوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو ہوش و خرد کا متلاشی ہو۔ کیا سونے والے بیشمار لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو جاگنا چاہتا ہو۔

عُرفی

(۲۳۸)

حلِ لغات **عُرفی**: جلال الدین محمد اکبر کے عہد کا ایک فارسی گو شاعر جو ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوا۔ ہندوستان آیا تو دہلی میں خان خاناں کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ صرف چھتیس سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کیا۔ کم عمری میں وفات پانے کے باوجود فارسی شاعری کی تاریخ میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ **تصدق**: نثار، قربان۔ **سینا**: حکیم ابو علی بن سینا جو ریاضی، منطق، فلسفہ اور کلام میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے بڑا فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ ۹۸۰ء میں بخارا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور ۱۰۳۷ء میں وفات پائی، اشارات شفا اور قانون اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ **فارابی**: محمد بن طرخان ابو نصر فارابی ۸۷۰ء میں فاراب ترکستان میں پیدا ہوا اور ۹۵۰ء میں وفات پائی۔ اس نے اکثر علوم پر کتابیں لکھی ہیں۔ اس وجہ سے اسے ارسطو کے مقابلے میں معلم ثانی کہا جاتا ہے۔ **اشک عنابی**: خون کے آنسو۔ **تربت**: قبر۔ **سیماب**: پارہ۔ **ظلمت رُبا**: اندھیرے کو کھینچے یعنی ختم کرنے والا۔

ے محل ایسا تعمیر کیا عرفی کے تخیل نے - - -

وضاحت عرفی کے تخیل نے ایسی خوش نما عمارت تعمیر کی جس پر سینا و فارابی جیسے عظیم فلسفیوں کو حیران کرنے والا فلسفہ قربان کیا جا سکتا ہے۔ یعنی عرفی کی

شاعری اتنی عمدہ ہے کہ سینا و فارابی کے فلسفے کی اُس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ اس نے عشق کی فضا پر ایک ایسا نغمہ لکھا جس کی وجہ سے آج تک اہلِ درد کی آنکھوں کو خون کے آنسو بہانا پڑتے ہیں۔ ایک دن میرے دل نے عرفی کی قبر سے شکایت آمیز لہجے میں کہا کہ اب دنیا کے ہنگاموں میں مضطرب اور بے چین کرنے والا سامان موجود نہیں ہے۔ دنیا والوں کے مزاجوں اور طبیعتوں میں کچھ ایسی تبدیلی آگئی ہے کہ دنیا سے وہ پارے جیسی کیفیت رخصت ہو گئی ہے یعنی ہر طرف سکون ہی سکون اور اطمینان ہی اطمینان ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اہل انجمن کو اور شعر سننے والے لوگوں کی آنکھ بے خوابی اور بیداری کے لطف سے واقف نہ ہو تو پھر آدھی رات کو کھینچے جانے والی شاعر کی فغاں اہلِ محفل کی سماعت پر گراں گذرتی ہے۔ اگر صورتحال یہ ہو کہ لوگ رات اور تاریکی کی پرستش کرنے لگیں تو ایسے لوگوں کو صبح کے وقت آسمان کی روشنی بھی ناگوار لگنے لگتی ہے۔ ایسی صورت حال میں کوئی شاعر اپنی فریاد کے شعلوں سے اندھیرے اور تاریکی کو کیسے دور کر سکتا ہے۔ میری شکایت سن کر عُرفی کی قبر سے آواز آئی کہ دنیا والوں کی شکایت نہ کرو۔ اگر لوگوں میں شعر و نغمہ کا ذوق کم نظر آئے تو اپنی آواز کو زیادہ تلخ اور دردناک بنالے تاکہ لوگ زیادہ متوجہ ہو سکیں۔ اگر اونٹنی کے محمل کا وزن زیادہ ہو جائے تو حدی خوانی زیادہ تیزی سے کی جائے۔

ایک خط کے جواب میں

(۲۳۸)

تعارف نسیم امروہوی فرہنگ اقبال میں اس نظم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال کے دوست نے، جن کا نام اقبال نے ظاہر نہیں کیا، اقبال کو مشورہ دیا کہ بہتر اور اچھی زندگی گذارنے کے لئے حکام و عمّال سے تعلقات پیدا کیجئے تاکہ آپ کی بیرسٹری اور زیادہ چمکے۔ اس مشورے کے جواب میں علامہ اقبال نے یہ نظم لکھی۔ مولانا غلام رسول مہر نظم کے پس منظر کے بارے میں ایک اور روایت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کو کسی دربار سے دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اقبال نے جواباً یہ نظم لکھی۔

حلِ لغات **تگ و تاز** : جدوجہد، کوشش ؛ **جاہ** : شان و شوکت، اقتدار و منصب ؛ **ریزہ کار** : باریک کام کرنے والا، سخت محنت کرنے والا ؛ **سحاب** : بادل

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمتِ تگ و تاز ۔۔۔

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ اوّل تو مجھے شان و شوکت اور اقتدار و منصب کی خواہش ہی نہیں ہے لیکن اگر بالفرض ہو بھی تو ان چیزوں کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ اور تلاش و جستجو کرنا پڑتی ہے لیکن اِس کوشش و کاوش کی ہمت اور طاقت مجھ میں نہیں۔ یعنی میں اقتدار و منصب حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری طبیعت باریک اور محنت طلب کام کرنے کی عادی ہے۔ اس کے لئے میں خدا کا ہزاروں مرتبہ شکر ادا کرتا ہوں کہ میرا دماغ فتنے پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ میری شاعری سے میری قوم کے لوگوں کے دلوں کی کھیتی سرسبز و شاداب ہے اور یوں دیکھا جائے تو میں دنیا میں اُس بادل کی مثال ہوں جس کے برسنے سے دریا بنتے اور بہتے ہیں۔ سیاست کی گتھیاں جن کا تو نے مجھے مشورہ دیا ہے، خدا تجھے ہی نصیب کرے۔ اس لئے کہ عشق کے فیضان کے باعث میرا ناخن تو سینہ خراشی میں مصروف ہے اور میرے لیے یہی بات کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہوں اور امراء کی بزم کی ہوا یعنی ان لوگوں کی بزم میں شرکت اور مصاحبت درحقیقت دل کے مردہ ہونے کی دلیل ہے اور یہ بھید شاعرِ رنگین نوا خواجہ حافظ شیرازی نے کھول دیا ہے۔

خواجہ حافظ شیرازی کہتے ہیں کہ اگر تیرے دل میں خضر کے پاس بیٹھنے اور اس کی مصاحبت اختیار کرنے کی آرزو ہے تو پھر آبِ حیات کا چشمہ سکندر کی طرح تمہاری نظروں سے بھی چشمہ پوشیدہ رہے گا۔

نانک

(۲۳۹)

تعارف نانک سکھ مذہب کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیمات میں توحید کا درس دیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس نظم میں گرو نانک کی تعریف کی ہے۔

ابتداء میں اس نظم کے گیارہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں تین شعر حذف کر دیے گئے جو سرودِ رفتہ

میں درج ہیں۔

حلِ لغات **گوتم:** بدھ مت کے بانی مہاتما گوتم بدھ۔ **گوہر یک دانہ:** ایسا موتی جس کی مثال نہ ہو۔ **آشکارہ:** ظاہر۔ **شودر:** ہندوؤں کے ہاں ذات پات کی تقسیم کے باعث جو طبقات پیدا ہوئے اُن میں سب سے اعلیٰ برہمن اور سب سے کمتر اور حقیر شودر ہیں جو ہندو ہونے کے باوجود نہ مندروں میں جا سکتے ہیں نہ اپنی مذہبی کتابیں پڑھ اور سن سکتے ہیں۔ **آزر:** حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا جو بُت تراش تھے۔

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پرواہ نہ کی ـــ ـــ ـــ

وضاحت کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان میں گوتم بدھ پیدا ہوتے جو یہاں کے انسانوں میں بے مثال اور نادر انسان کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اہل ہند نے اُن کے پیغام پر توجہ نہیں دی گویا یہ گوتم بدھ کے مقام و مرتبے کو پہچان نہیں سکے۔ اہل ہند بدقسمت تھے لہٰذا حق و صداقت کی آواز سے بے خبر رہے اور کیوں نہ ہوتے۔ ہر درخت اپنے پھل کی مٹھاس سے ناواقف ہی ہوتا ہے لہٰذا ہندوستانیوں کو بھی کیونکر پتا چل سکتا تھا کہ گوتم بدھ اور اُن کے پیغام کی کیا اہمیت ہے؟ گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کے ذریعے زندگی کے راز کو ظاہر کیا لیکن چونکہ ہندوستانیوں کو اپنے فلسفے پر ناز تھا لہٰذا انھوں نے گوتم بدھ کی تعلیمات پر توجہ نہیں دی۔ دراصل یہ وہ بزم ہی نہیں تھی جو حق و صداقت کی شمع سے روشن ہو سکتی۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت کی بارش تو ہوئی لیکن چونکہ زمین اپنے بنجرپن کے ساتھ سرسبز و شاداب ہونے کی اہلیت سے عاری تھی لہٰذا بارش سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ افسوس یہ ہے کہ شودروں کے لئے ہندوستان غموں کے گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اس طبقے کو یہاں قدم قدم پر مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں اور اِس سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ شاید یہ بستی یعنی ہندوستان انسان کی تکالیف اور مصیبتوں کے احساس سے عاری ہے۔ ایک زمانہ گذر گیا، نیا دور آگیا لیکن برہمن آج تک غرور و تکبر کے نشے میں مست ہے اور گوتم نے جو شمع ہندوستان میں جلائی تھی وہ یہاں پر روشنی پیدا کرنے کی بجائے غیروں کی محفل میں جل رہی ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان میں بدھ مت کے پیرو نہیں ہیں جبکہ ہند چینی، جاپان اور چین وغیرہ میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہندوستان جہاں پر بتوں کی پرستش کی جاتی ہے، ایک عرصے بعد پھر روشن ہوا اور آذر یعنی بت تراش کے گھر میں حضرت ابراہیمؑ

کے نور سے روشنی پیدا ہوئی یعنی ہندوستان میں پھر وحدت کا گیت الاپا گیا۔
آخر کار پھر پنجاب سے توحید کی آواز بلند ہوئی اور ایک مردِ کامل یعنی گرونانک نے ہندوستان کو خواب سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

کفر و اسلام

(۲۴۰)

حلِ لغات **تضمین**: کسی دوسرے شاعر کے کسی شعر کو یا مصرع کو مضمون کی مناسبت سے اپنے کلام میں شامل کرنا۔ **میر رضی دانش**: فارسی گو شاعر جو شاہجہان کے زمانے میں مشہد سے ہندوستان آیا۔ ایک قصیدے کے عوض دو ہزار روپے انعام حاصل کیا۔ بعد ازاں داراشکوہ سے وابستگی اختیار کی جس نے صرف ایک شعر پر ایک لاکھ روپے بطور انعام دیئے۔ **آتشِ نمرود**: وہ آگ جو نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے تیار کی تھی اور جو گلستان میں بدل گئی تھی۔ **پنہاں**: پوشیدہ۔ **صاحبِ سینا**: کوہ سینا کی رعایت سے حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے۔ **خلیل**: دوست۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا۔ **خاکستر**: راکھ۔ **سطوت**: شان و شوکت۔

۵ • ایک دن اقبال نے پوچھا کلیم طور سے — — —

وضاحت اقبال نے ایک دن حضرتِ موسیٰؑ سے سوال کیا کہ آپ کے نقشِ قدم سے کوہِ سینا کی وادی چمن اور گلستان کے مرتبے پر فائز ہے۔ اب تک دنیا میں آتشِ نمرود کے شعلے بکھرے ہوئے ہیں یعنی اب تک کفر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ آخر آپ کا درد پرانا سوز کہاں چلا گیا جو باطل کو جلا ڈالنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں موسیٰ نے فرمایا کہ اگر تو مسلمان ہے تو پھر غائب کو چھوڑ کر حاضر اور نظر آنے والی چیزوں کا عاشق نہ بن لیکن اگر بالفرض تو حاضر ہی کے ذریعے حقیقت جاننا چاہتا ہے تو پھر سطحی نظر سے چیزوں کو دیکھنے کی بجائے حضرت ابراہیمؑ جیسا ایمان پیدا کرنا ضروری ہے۔ مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے

رات کی تاریکی میں ستاروں کو چمکتے دیکھا تو انھیں خدا قرار دیا پھر چاند نکلا تو آپ نے سوچا کہ ستارے نہیں بلکہ یہ چاند خدا ہے۔ صبح ہوئی اور سورج نکلا تو چاند کی روشنی بھی ماند پڑ گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے سورج کو معبود قرار دیا لیکن شام کو سورج بھی غروب ہو گیا تو وہ حاضر و موجود اشیاء کے اِس غائر مشاہدے کے بعد اِس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب چیزیں خدا نہیں ہیں بلکہ خدا وہ ہے جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر حاضر و موجود کا ذوق ہے تو پھر حضرت ابراہیمؑ جیسے ایمان کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ لباس زندگی کے لباس کو جلا کر راکھ میں بدل دے گا۔ لیکن اگر تو غائب پر ایمان لاتا ہے اور ان چیزوں کا عاشق ہے جو نظر نہیں آتیں، اللہ تعالیٰ، فرشتے، جنت دوزخ، قیامت اور قضا و قدر وغیرہ تو پھر کچھ پرواہ نہیں، وادیٔ فاراں میں ڈیرے ڈال کر یعنی اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر حالات کے بدلنے کا انتظار کر۔ موسیٰؑ کہتے ہیں کہ حاضر و موجود اشیاء کی شان و شوکت بالکل عارضی اور وقتی ہے جب کہ غائب کی شان ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس صداقت کا محبت سے وہی تعلق ہے جو جان اور جسم میں ہوتا ہے یعنی ایکدوسرے کے بغیر دونوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت ضروری ہے۔

بالفرض اگر دنیا میں نمرود کا شعلہ روشن ہے یعنی کفر کا دور دورہ ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر شمع بھی انجمن میں جل جل کر ہی پگھلتی ہے یعنی کفر بھی شمع ہی کی طرح ختم ہو جائے گا جب کہ میرا یعنی حق و صداقت کا نور پتھر کی آگ کی طرح نظروں سے اوجھل ہے اور اس کے لیے اوجھل ہونا ہی بہتر ہے۔

بلالؓ

(۲۴۱)

حل لغات

بلالؓ : آنحضرتؐ کے ایک حبشی صحابی جنکا خاندان بعثتِ اسلام سے بہت پہلے مکہ معظمہ آگیا تھا۔ غلام ہونے اور کافر آقاؤں کے ظلم و ستم

کے خوف کے باوجود اسلام قبول کیا اور اس سلسلے میں جو بھی مصائب پیش آئے خندہ پیشانی سے اُن کا مقابلہ کیا۔ آپؓ آنحضرتؐ کے سچے عاشق تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے وصال کے بعد بلالؓ نے اذان کہنا ترک کر دی تھی؛ **مغربی حق شناس** : مغرب کا حق جاننے اور پہچاننے والا؛ **جولانگہ** : گھوڑے دوڑانے کا میدان، میدانِ جنگ؛ **سکندرِ رومی** : مشہور فاتح سکندر یونانی جو مقدونیہ سے نکلا اور وسیع وعریض علاقے فتح کرتا ہوا ہندوستان تک آ پہنچا۔ اِس سے آگے جانے کے لیے اِس کی فوج تیار نہ تھی لہٰذا واپسی کا سفر اختیار کیا لیکن راستے ہی میں انتقال ہو گیا؛ **گردوں** : آسمان **پورس** : ہندوستان کا ایک حکمران جس نے سکندر کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی؛ **مستنیر** : روشن؛ **اسود** : کالا؛ **احمر** : سُرخ؛ **چرخِ پیر** : بوڑھا آسمان؛

۵ لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے ۔ ۔ ۔

وضاحت مغرب کا ایک عالم، جو حقیقت کو پہچانتا تھا اور جس کا اہلِ قلم میں بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ لکھتا ہے کہ ایشیا سکندر رومی کے لیے جنگ کا میدان بنا۔ یعنی مقدونیہ میں پیدا ہونے والا سکندر نوعمری ہی میں ایشیا کے مختلف ممالک کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کا مقام و مرتبہ آسمان سے بھی اونچا تھا۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ہندوستان اور ایران کے بادشاہوں نے سکندرِ رومی کے سامنے اپنی عظمت اور برتری کا جو دعویٰ کیا تھا وہ غلط تھا یعنی سکندر کے سامنے اُن کی کوئی حیثیت و حقیقت نہیں ہے۔

سکندر دنیا میں ایسا بادشاہ ہو گزرا ہے جس کی فوج ستاروں جیسی تھی۔ اسی لئے آسمان تک اِس شخص کو بہت حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔ اِس کے باوجود صورتِ حال یہ ہے کہ آج ایشیا کے اس عظیم فاتح کو ایشیا میں بھی کوئی نہیں جانتا۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا مورخ بھی اِس کے کارناموں سے واقف نہیں ہیں۔

۵ لیکن بلال وہ حبشی زادۂ حقیر ۔ ۔ ۔

وضاحت لیکن بلالؓ جو ایک حقیر اور حبشی کا لڑکا تھا۔ جس کے اوضاع و اطوار نے نبوت کے نور سے روشنی پائی تھی اور جس کا سینہ ازل سے اس اذان کا امانت دار قرار پایا تھا جو بادشاہ سے لیکر فقیر تک پر حکومت کرتی ہے یعنی اذان ہوتی ہے تو کیا بادشاہ کیا فقیر سب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ اذان جو

دنیا کی تمام قوموں میں میل جول اور اخوت و محبت پیدا کرتی ہے اور جو غریب کو امیر کے برابر لا کھڑا کرتی ہے ایک ایسی آواز کی حیثیت رکھتی ہے جو جگر کو پگھلا دے اور سینکڑوں سال سے بوڑھے آسمان کے کان اذان کی آواز سن رہے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ غور کرنا چاہیئے کہ یہ کس ہستی کا فیضان ہے جس کی وجہ سے سکندر رومی جیسا عظیم بادشاہ تو مٹ گیا لیکن بلال رضؓ حبشی کو دائمی زندگی حاصل ہو گئی۔ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ سکندر اپنی فتوحات کے باوجود فنا ہو گیا لیکن بلال حبشی عشق رسولؐ اور اسلام کی برکات کی وجہ سے دائمی شہرت اور ناموری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مسلمان اور تعلیم جدید

(۲۴۲)

حل لغات تضمین: کسی شاعر کے شعر یا مصرع کو مضمون کی مناسبت سے اپنے کلام میں شامل کرنا۔ ملک قمی: ایران کے شہر قم کا ایک مشہور شاعر جو دسویں صدی ہجری میں دکن پہنچا اور ابراہیم عادل شاہ والئ بیجاپور کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ ظہوری بھی اسی دربار سے وابستہ ہوا تو ملک قمی نے اپنی بیٹی کی شادی ظہوری سے کر دی۔ شوریدہ سر: دیوانہ۔ رہرو: راستہ چلنے والا مسافر۔ متاع کس مخر: ایسا مال جسے کوئی نہ خریدے۔ بار آور: پھل لانے والی، نتیجہ خیز۔ دیرک: چالاک۔ نیشتر: نشتر۔ زبوں بختی: بد قسمتی۔

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر ۔۔۔

وضاحت مجھے میرے مرشد نے سکھایا تھا کہ اے دیوانے مسلمان دنیا میں ہر مسافر کے لئے سفر کا سامان بھی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اب زمانے کی ہوا بدل گئی ہے اور ایک انقلاب آیا جس کی وجہ سے انتہائی قیمتی چیزیں بھی بے قیمت ہو گئیں اور ان کے خریدار نہ رہے۔ تیرا دہ روشن شعلہ جس سے اندھیرے ختم ہو جاتے تھے آہستہ آہستہ ختم ہوتا رہا اور

اِس نے گھٹ کر ایک معمولی سی چنگاری کی شکل اختیار کر لی۔ ایسی صورتحال میں یہ لازم ہو گیا ہے کہ تو غائب یعنی نظر نہ آنے والی چیزیں مثلاً اللہ تعالےٰ، فرشتے، جنت و دوزخ، قیامت اور قضا و قدر کا دیوانہ نہ رہ بلکہ جو چیزیں نظر کے سامنے موجود ہیں ان کی پرستش کر۔ اِس لئے کہ اب دنیا کی تمام اقوام پر نظر آنے والے خداؤں کا اثر چھایا ہوا ہے یعنی مذہب وغیرہ کو ترک کر کے تہذیب حاضر کے رنگ کو اختیار کرلے۔ بصورتِ دیگر اِس باغ میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تیری کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوں۔ اس لئے کہ اب تیرا جال پرانا ہو چکا ہے۔ بہت تیز اڑنے والا پرندہ جسے تو اپنا شکار بنانا چاہتا ہے، انتہائی چالاک ہو گیا ہے۔ اِس دور میں تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ رہ گیا ہے جو ملت کو لاحق بیماریوں کا علاج کر سکے۔ دراصل تعلیم گندے اور فاسد خون کے لئے نشتر کا کام دیتی ہے یعنی جس طرح نشتر انسانی جسم سے زہریلے اور فاسد مادوں کو خارج کر دیتا ہے اس طرح تعلیم بھی انفرادی اور اجتماعی بیماریوں کا علاج کر دیتی ہے۔ نئے زمانے کے رہنما کے اشارے سے مجھے بھی تعلیم حاصل کرنے کا جنون ہو گا۔ دراصل صحرا میں بھٹکنے والے کے لئے حضرتِ خضر کا حکم ماننا نہایت ضروری ہے۔ لیکن نکتے تلاش کرنے والی نظر میری بدقسمتی ملاحظہ کرے کہ میں پاؤں سے کانٹا نکالنے لگا کہ کجاوہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں صرف ایک لمحہ کے لئے غافل ہوا اور سینکڑوں سال پیچھے رہ گیا۔

مراد یہ کہ میں نے رہنما کے مشورے سے جدید تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ خیال یہ تھا کہ یہ میری بیماریوں کا علاج کرے گی لیکن علاج کی طرف متوجہ ہونے کی صورت میں حقیقت میری نظروں سے غائب ہو گئی اور میں بھٹک گیا یعنی جدید تعلیم چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کر کے انسان خاص طور پر مسلمان کو اِس سے بڑی مرض میں مبتلا کر دیتی ہے اور انسان حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔

پھولوں کی شہزادی

(۲۴۳)

حلِ لغات | باغِ رضواں : جنت مراد ہے ؛ فردوس در دامن : اپنے دامن میں

جنت لئے ہوئے ۔ سریر آرا : تخت کو سجانے والی، حکمران ۔ درخشاں : روشن، چمک دار ۔ افتندہ : افتاد پڑی ہوئی، گری ہوئی ۔ اہل محرم : غمزدہ اور دکھیا لوگ ۔

کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں ۔۔۔

وضاحت ایک دن شبنم باغ میں کلی سے کہہ رہی تھی کہ میں طویل عرصے تک جنت کے غنچوں میں رہی ہوں لیکن تمہارے گلستان میں ایسی مست کر دینے والی فضا ہے کہ اس کو دیکھنے سے میری حیران کر دینے والی آنکھ اپنے دامن میں جنت لئے ہوئے ہے یعنی جس طرف دیکھتی ہوں جنت کے نظارے نظر آتے ہیں ۔ میں نے سُنا ہے کہ اس باغ میں ایک شہزادی حکومت کرتی ہے اور وہ ایسی شہزادی ہے کہ اگر اس کے قدموں کے نشان صحراؤں اور ویرانوں میں بھی لگ جائیں تو وہاں بھی ان نقوشِ پا کے باعث پھول کھلنے لگتے ہیں ۔

لہذا میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ کبھی مجھے بھی اس شہزادی کے پاس لے چل ۔ اگر عام حالات میں ممکن نہ ہو تو خوشبو کی طرح مجھے اپنے دامن میں چھپا کر لے چل ۔

کلی بولی سریر آرا ہماری ہے وہ شہزادی

وضاحت شبنم کی بات کا جواب دیتے ہوئے کلی کہنے لگی کہ ہماری شہزادی ایسی شان والی ہے کہ اُس کی ٹھوکر سے پتھر بھی موتی بن کر چمکنے لگتے ہیں لیکن تجھے اس شہزادی کے آستاں تک لے جانا مشکل ہے ۔ اس لئے کہ تو اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک گری ہوئی اور بے قیمت چیز ہے جبکہ شہزادی کی شان بہت بلند ہے ۔ لہٰذا تیرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ تو ہماری ساتھی بن کر شہزادی تک پہنچ سکے ۔ البتہ ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ اگر تو کسی مصیبت زدہ کا گرم آنسو بن جائے تو ہماری شہزادی تک پہنچ سکتی ہے ۔

جو لوگ دکھیا اور غمزدہ ہوں اُن کے لئے ہماری شہزادی کی نظر خوشی و مسرت کا پیغام لاتی ہے اور ہماری شہزادی غمزدہ لوگوں کے آنسوؤں کو موتی بنا دیتی ہے ۔

تضمین بر شعرِ صائب

(۲۴۳)

حلِ لغات

تضمین : کسی دوسرے شاعر کے کسی شعر یا مصرع کو مضمون و خیال کی مناسبت سے اپنے کلام میں شامل کرنا ؛ صائب : فارسی زبان کا مشہور شاعر جس کا نام محمد علی تھا۔ یہ تبریز میں پیدا ہوا۔ افغانستان آکر کابل کے صوبہ دار ظفر خان سے وابستہ ہو گیا۔ آخری عمر میں پھر اصفہان چلا گیا اور وہیں وفات پائی ؛ تقاضائے خود افزائی : خود کو بڑھانے کی خواہش ؛ پیری : بڑھاپا ؛ برنائی : جوانی ؛ زہراب : زہریلا پانی، کڑوا ؛ شکر نوائی : میٹھی چیز پکانا ؛ خوشتر : زیادہ اچھی اور مناسب ؛

کہاں اقبال تُو نے اپنا آشیاں بنایا ۔ ۔ ۔

وضاحت

اے اقبال تُو نے کس باغ میں آکر اپنا گھونسلا بنایا ہے۔ یہاں تو بلبل کا ترنم اور اس کے نغمے بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ تُو ملتِ اسلامیہ کی سرزمین میں وادیٔ ایمن کی چنگاریاں کاشت کرنے کا نادر کارنامہ انجام دیتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ یہاں پر سینا کا بیج بوئے۔ ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ خود چیزوں میں ترقی پانے اور پھلنے پھولنے کا شوق موجود ہو اور جہاں یہ شوق نہ ہو وہاں پر سانس کی قوت سے بھی کسی کلی کو پھول بنا دینا ممکن نہیں ہے۔ یعنی ملتِ اسلامیہ ارتقاء کی خواہاں نہیں ہے۔ ایسے میں تیری شاعری مسلمانوں کو ترقی کے راستے پر گامزن نہیں کر سکتی۔ زیادہ ستم انگیز بات یہ ہے کہ گلستان کی فطرت سو چکی ہے نہ یہاں پر بوڑھوں کے دل بیدار ہیں اور نہ جوانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت موجود ہے اور جب بھید جاننے والے دل سینے میں سو جاتے ہیں اور اپنے اچھے بُرے سے غفلت برتنے لگتے ہیں تو شاعر کے لئے میٹھی چیزیں بھی زہرناک اور کڑوی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا تجھے چاہیئے کہ تو خاموش ہو جائے اور اگر تیرے لیے یہ ممکن نہیں ہے اور تُو اپنی آہ و فغاں کو ضبط نہیں کر سکتا تو پھر ان بے خبر اور اپنی حالت سے غفلت برتنے والوں کی نسبت کسی صحرا اور ویرانے کی تنہائی زیادہ اچھی اور بہتر ہے یعنی وہاں جا کر نغمے گانے چاہئیں۔

ایسی صورت میں یہی بہتر ہے کہ لیلیٰ اپنے جلوؤں سے بیابان کو مستفیض کرے۔ اس لئے کہ شہر کی تنگی صحرائی حسن کی تاب نہیں لاسکتی۔ یعنی مردہ دل قوم کے لئے زندہ قوموں کے ترانے کچھ زیادہ پُرلطف نہیں ہوتے۔ یہ ترانے زندہ قوموں میں ہی گائے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

فردوس میں ایک مکالمہ

(۲۴۴)

حلِ لغات

فردوس: جنت ؛ ہاتف: غیب سے آواز دینے والا فرشتہ ؛ حالی: اردو کے مشہور شاعر و ادیب اور نقاد مولانا الطاف حسین حالی جو ۱۸۵۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی ؛ سعدیٔ شیراز: فارسی کے مشہور شیخ سعدی شیرازی مراد ہیں جو اپنی دو کتابوں گلستان و بوستاں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ گلستان نثر کی کتاب ہے اور بوستاں نظم کی ؛ واماندہ: پیچھے رہ جانے والا ؛ تگ و تاز: کوشش، جدوجہد ؛ تزلزل: ہلچل، زلزلہ پیدا ہونا، مستحکم و استوار نہ رہنا ؛ طائر: پرندہ ؛ زمیں تاز: زمین پر دوڑنے والی یعنی انتہائی پست ؛ الحاد: کفر، اسلام سے روگردانی ؛ شاہِ یثرب: آنحضرتؐ مراد ہیں ؛ غماز: چغلی کھانے والا ؛

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز ـــــ

وضاحت

ایک دن مجھے غائب کی خبر دینے والے فرشتے نے کہا کہ جنت میں شیخ سعدی شیرازی، مولانا الطاف حسین حالی سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ تو نے اپنی شاعری کی روشنی سے آسمان کے چاند ستاروں تک کو روشن کر دیا ہے۔ ذرا مجھے ہندی مسلمانوں کی حالت تو بتا کہ یہ لوگ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں یا ابھی تک منزل کے حصول کے لیے مصروفِ جدوجہد ہیں۔ اُس ہندی مسلمان کی رگوں میں مذہب کی حرارت باقی ہے کہ نہیں جس کی آواز کی گرمی ایک زمانے میں آسمان تک کو جلا ڈالتی تھی۔

حالی، شیخ سعدی کی باتوں سے متاثر ہوا اور رو رو کے کہنے لگا کہ اے معجزے دکھانے والے

جب بوڑھے آسمان نے دلوں کا صفحہ پلٹا یعنی جب نیا دور شروع ہوا تو یہ آواز بلند ہوئی کہ اب دنیا میں اس کو عزت نصیب ہو گی جو جدید تعلیم حاصل کرے گا۔ لہٰذا ہندی مسلمان بھی جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے لیکن۔ مشکل یہ ہوئی کہ اس تعلیم کے باعث عقیدوں میں وہ پہلا سا استحکام اور استواری باقی نہیں رہی۔ یوں نئی تعلیم سے گو ہندوستانی مسلمانوں نے دنیاوی اعتبار سے قدرے عزت حاصل کر لی لیکن دین اُن کی زندگیوں سے رخصت ہو گیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یا جماعت دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتی ہے تو اس سے اُن کے مقاصد میں عظمت اور رفعت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہندی نوجوان دین سے بیگانہ ہو گئے لہٰذا اُن کی فطرت انتہائی پست ہو گئی۔ مذہب ہی کی وجہ سے مختلف رنگ و نسل کے افراد میں ہم آہنگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر ملّت کا اتحاد ساز کی حیثیت رکھتا ہے تو اس ساز کے لیے مذہب زخمہ کا کام کرتا ہے۔ یعنی دین ہی کی وجہ سے اِس ساز سے آوازیں اور نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر چمن کی حفاظت کرنے والی دیوار کی بنیاد لرز جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ چمن کے انجام کا آغاز ہو چکا ہے اور اب چمن کی رونق اور شادابی ختم ہونے والی ہے۔ چونکہ ملّت کو زمزم کے چشمے سے پانی نہیں مل سکا یعنی اسلام کے زریں اصولوں سے نوجوانوں کو متعارف نہیں کرایا گیا لہٰذا اب ان میں الحاد و کفر کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

میں نے آپ سے ہندی مسلمانوں کی حالتِ زار تو کہہ دی لیکن میں یہ درخواست بھی کرتا ہوں کہ آپ ان باتوں کا ذکر آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں نہ کیجیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہندی مسلمان مجھے چغل خور کہنے لگیں۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جو کانٹے بوئے تھے ان سے کھجور حاصل کرنے کی توقع عبث ہے اور جو اُون ہم نے تیار کی تھی اُس سے حریر و پرنیاں اور ریشم تیار نہیں ہو سکتا۔

آخری شعر، شیخ سعدی شیرازی کا ہے لیکن یہ شعر مولانا حالی کی گفتگو کا جزو ہونے کے باعث زیادہ پر لطف ہو گیا ہے اس لیے کہ جدید تعلیم کا پرچار کرنے والوں میں مولانا حالی بھی پیش پیش تھے۔

مذہب

حلِ لغات تضمین : کسی دوسرے شاعر کے شعر یا مصرع کو مضمون کی مناسبت کی وجہ سے اپنے کلام میں شامل کرنا ؛ **بیدل** : مرزا عبدالقادر بیدل، فارسی کے مشہور شاعر اور نثر نگار، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان سے نثر کی کئی کتابیں اور تقریباً ایک لاکھ شعر منسوب ہیں، بڑے خود دار اور غیور شاعر تھے۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب عالمگیر کے لڑکے کی طرف سے قصیدہ لکھنے کی فرمائش پر ملازمت سے استعفاء دے دیا تھا۔ اس کے بعد نہ کسی نواب سے وابستہ ہوتے نہ کبھی دربار میں گئے۔ شعری اسلوب میں انتہائی مشکل پسند اور مضمون آفریں شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ یہاں تک کہ غالبؔ کو بھی کہنا پڑا۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے،

محسوس : وہ اشیاء جو حواس خمسہ کے ذریعے دریافت و معلوم کی جاسکیں ؛ **انتقاش** : بلند ہونے کی کیفیت

تعلیمِ پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کے دانشور اور فلسفی آج کل یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ وہ سب لوگ نادان اور بے سمجھ ہیں جو اس دنیا میں کسی ایسی ہستی کو تلاش کرنے کے خواہاں ہیں جو غائب ہے اور محسوس نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ غائب ہستی نظر نہ آتے تو یہ ایک فضول اور بیکار بات ہے اور آج کے دور میں شیخ یعنی مسلمان بھی برہمنوں اور ہندوؤں کی طرح بت پرستی کی طرف مائل ہوگئے ہیں۔ نئے دور کے تمام نئے علوم کی بنیاد اُن اشیاء پر ہے جو حواسِ خمسہ کی گرفت میں آسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس زمانے میں تقریباً تمام مذاہب کے عقیدوں کا شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے یعنی مذہب ختم ہوگیا ہے۔ اِس لیئے کہ مذہب نے ایک ناپختہ جنون اور دیوانگی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور اِس زمانے میں مذہب سے صرف فکر و تخیل کو بلند پرواز کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

لیکن مغربی دانشوروں کے مقابلے میں ایک مرشد کامل یعنی مرزا بیدل نے مجھ پر ایک اور راز فاش کیا ہے اور یہ راز زندگی کے فلسفے سے زیادہ قریب ہے۔

وہ راز یہ ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لیے تھوڑا سا جنون درکار ہوتا ہے خواہ یہ کمال عقلِ کل

ہی ہو لیکن اگر اس میں بھی جنون شامل نہ ہو تو بیکار ہے۔

جنگ یرموک کا ایک واقعہ

(۲۴۷)

حلِ لغات
جنگ یرموک : یرموک موجودہ اُردن میں دمشق سے کچھ فاصلے پر ایک میدان کا نام ہے۔ یہ علاقہ ایک زمانے میں مملکتِ شام کا حصہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بیس ہزار مسلمانوں نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سپہ سالاری میں دو لاکھ رومی عیسائیوں کو شکستِ فاش دی تھی۔ یہ جنگ ۱۵ھ میں لڑی گئی۔ **عروس** : دلہن۔ **سیماب مضطرب** : بے چین پارا۔ **امیر عساکر** : سپہ سالار۔ **بو عبیدہ** : حضرت بو عبیدہ بن جراح ایک عظیم الشان صحابی اور نڈر جرنیل تھے۔ آنحضرتؐ کے ساتھ تمام جنگوں میں شریک رہے۔ ۱۵ھ میں جنگ یرموک کے بعد فاتح شام کی حیثیت سے مشہور ہوئے ۱۸ھ میں ۵۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

ع صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند ۔ ۔ ۔

وضاحت
جنگ یرموک کا موقع تھا اور تلواروں سے مسلح عرب نوجوان میدانِ جنگ میں صفیں باندھ چکے تھے۔ شام کی زمین کی دلہن مہندی کا انتظار کر رہی تھی؛ یعنی لڑائی کی وجہ سے طرفین کا خون سرزمین شام کو سرخ کرنے والا تھا۔ اتنے میں ایک پارے کی طرح بے چین نوجوان آکر فوجوں کے سپہ سالار سے گفتگو کرنے لگا۔ نوجوان نے کہا کہ اے بو عبیدہ بن جراح اب آپ مجھے جنگ کرنے کی اجازت دیں اس لئے کہ میرے صبر و سکون کا پیالہ بھر چکا ہے اور میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ میں آنحضرتؐ کی فرقت میں بہت بے چین ہو رہا ہوں اور محبت میں تو فراق کا ایک لمحہ بھی حرام اور بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں جنگ لڑ کر شہید ہونا چاہتا ہوں تاکہ آنحضرتؐ کی بارگاہ میں جا سکوں اور اگر آپ اُن کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں تو میں یہ پیغام بڑی خوشی سے آنحضرتؐ تک پہنچا دوں گا۔ اس نوجوان لڑکے کا شوقِ شہادت اور شوقِ زیارتِ رسول دیکھ کر بو عبیدہؓ بن جراح کی وہ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں جن کی نظریں بے نیام تلوار کی طرح تھیں

اور پھر وہ کہنے لگے کہ اے نوجوان تیرا جذبۂ عشق بوڑھوں کے لئے بھی واجب احترام ہے۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا تیری دلی خواہشیں پوری کرے۔ میں رشک کرتا ہوں تیری محبت کا مقام کس قدر بلند ہے جب تو آنحضرتؐ کے دربار میں پہنچے تو میری طرف سے سلام کے بعد اُن کی خدمت میں صرف یہ عرض کر دینا کہ خدائے غیور نے ہم پر اپنا کرم کر دیا ہے اور آپ نے مسلمانوں سے جو وعدے کئے تھے وہ سب کے سب پورے ہو گئے ہیں۔

مذہب

(۲۴۸)

تعارف نسیم امروہوی کی تحقیق کے مطابق یہ نظم دو جولائی ۱۹۱۵ء کی تصنیف ہے۔ ابتداء میں یہ نظم کل چھ اشعار پر مشتمل تھی۔ آخری شعر فارسی زبان کے مشہور شاعر صائب کا تھا۔ نظر ثانی میں جو تین شعر حذف کئے گئے اُن میں یہ شعر بھی شامل تھا۔ حذف شدہ تینوں اشعار باقیاتِ اقبال اور روزگارِ فقیر میں موجود ہیں۔

حلِ لغات ترکیب: بناوٹ، ڈھنگ: طور، انحصار: دار و مدار، مستحکم: مضبوط و استوار،

۱؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر ۔۔۔

وضاحت مسلمانوں کے بنیادی سیاسی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا مقابلہ مغربی اقوام سے نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی ان کی دیکھا دیکھی اور بلا سوچے سمجھے اُن کی روش پر چلنا چاہیئے۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ کی اُمت یعنی مسلمان اپنی بناوٹ اور طرز و انداز کی وجہ سے دوسری قوموں سے کہیں مختلف ہیں۔ مغربی اقوام کی جمعیت اور اتحاد کا دار و مدار اُن کے خطۂ ارض اور اُن کے نسل و خون کی نسبتوں پر ہوتا ہے۔ یعنی مغرب میں چونکہ مذہب افراد و اقوام کی زندگی سے نکل کر محض انفرادی نوعیت کا معاملہ رہ گیا ہے لیکن مسلمانوں کا اتحاد اور اُن کی جماعت صرف اور صرف مذہب کی قوت کی وجہ سے مضبوط و پائیدار ہو سکتی ہے۔

اگر مسلمان مغرب کے لوگوں کی طرح دین کو ترک کر دیں اور اہل مغرب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسے انفرادی معاملہ تصور کر لیں تو ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور اتحاد ختم ہو گا ویسے ہی بحیثیت قوم و ملت مسلمانوں کا وجود ختم ہو کر رہ جائیگا۔

اقبال نے اِس مختصر سی نظم میں یہ اہم نکتہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان صرف اسی وقت تک ترقی کر سکتے ہیں جب تک وہ اسلام سے اپنے تعلق کو مضبوط و مستحکم بنائے رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(۲۴۸)

حلِ لغات

پیوستہ : جڑا ہوا، جو الگ نہ کیا جا سکے ۔ فصل : موسم ۔ سحاب : بادل ؛ برگ و بار : پتے اور پھل ، زرِ کامل عیار : خالص سونا جو کسوٹی پر پورا اُترے ۔ طیور : طائر کی جمع، پرندے ، شاخِ بریدہ : کٹی ہوئی شاخ ۔ روزگار : زمانہ ؛

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ۔۔۔۔

وضاحت

علامہ اقبال ایک تمثیل کے ذریعے فرد اور جماعت کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے اچھے برے حالات میں فرد کو جماعت سے اپنا تعلق مضبوط و مستحکم رکھنے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شاخ خزاں کے موسم میں خزاں کی وجہ سے سوکھ کر الگ ہو گئی اور جس نے مشکلات کے دور میں درخت کا ساتھ چھوڑ دیا گویا اس نے اپنے نئے سرے سے تر و تازہ ہونے اور سرسبز و شاداب ہونے کے تمام تر امکانات کا خاتمہ کر دیا۔ اب بہار کا بادل لاکھ برسے لیکن اس شاخ کو فائدہ نہیں پہنچ سکے گا اور نہ یہ سرسبز و شاداب ہو گی۔ گویا اس شاخ کے لیے خزاں کا موسم لازوال ہو گیا یعنی یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوکھ گئی۔ اور اب اس پر پھل پھول آنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان تو اِس مثال سے سبق سیکھ۔ تیرا گلستان یعنی ملتِ اسلامیہ بھی آجکل خزاں اور زوال کی زد میں ہے اور پھولوں یعنی مسلمانوں کی جیب خالص سونے سے خالی ہے یعنی مسلمان

اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو گئے ہیں ۔ جو پرندے پتوں کی تنہائی میں بیٹھے ہوئے نغمے گاتے تھے وہ اب تیرے سایہ دار درخت سے رخصت ہو گئے یعنی ملت اسلامیہ کی رونق ختم ہو گئی ۔ ایسے میں تجھے درخت سے کٹ کر الگ ہو جانے والی شاخ سے سبق سیکھنا چاہیئے ۔ یعنی شاخ درخت سے الگ ہوتی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوکھ گئی ۔ اگر تو بھی ملت کے زوال کے خیال سے مسلمانوں سے قطع تعلق کرے تو ملت پر تو شاید کبھی بہار آ جائے لیکن تیرے پھلنے پھولنے اور ترقی پانے کے امکانات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے ۔ لہٰذا اگر تو زمانے کے دستور سے ناواقف ہے تو تجھے اس کٹی ہوئی شاخ سے سبق لینا چاہیئے اور خزاں کے باوجود اپنی ملت سے مضبوط تعلق رکھتے ہوئے بہار کی آمد کی اُمید رکھنی چاہیئے ۔

شبِ معراج

(۲۴۹)

حل لغات

شبِ معراج : انتہائی عروج کی رات ، ۲۶ اور ۲۷ رجب کی درمیانی رات جس میں آنحضرت ﷺ کو مکہ معظمہ سے بیت المقدس لے جایا گیا اور وہاں سے آپ ﷺ اپنے جسمِ اطہر کے ساتھ حضرت جبریل کے ہمراہ سدرۃ المنتہیٰ تک تشریف لے گئے ۔ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر جبریل نے بھی مزید پرواز سے معذرت کی اور آپ رفرف پر سوار ہو کر عرشِ معلیٰ تک پہنچے ۔ اللہ تعالیٰ کی تمام نشانیاں دیکھیں ۔ جنت و دوزخ کی سیر کی اور تمام اجرام و اجسامِ فلکی و سماوی کو دیکھا ؛ **اخترِ شام :** شام کو طلوع ہونے والا ستارہ ، زہرہ ؛ **رہِ یک گام :** ایک قدم کا راستہ ، بہت کم سفر ؛

۵ اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز

وضاحت

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ آسمان کی وسعتوں میں سے شام کے ستارے کی یہ آواز آ رہی ہے کہ شبِ معراج ایسی عظمت والی رات ہے کہ اس رات کو صبح بھی سجدہ کرتی ہے یعنی صبح بھی اِس رات کا احترام کرتی ہے ۔ مسلمان کو معراج کی رات یہ سبق دے رہی ہے کہ اگر ہمت ہو تو زمین سے عرش بریں تک کا یہ طویل فاصلہ صرف ایک قدم کی راہ ہے یعنی بہت مختصر ہے ۔

پھول

(۲۴۹)

حلِ لغات پیرہن: لباس ؛ رفو کرنا: سینا ؛ آبرو: عزت ؛ خُو: عادت ؛ **صنوبر**: ایک درخت جو بہت اونچا ہوتا ہے ؛ **پا بگل**: جس کے پاؤں مٹی میں دھنسے ہوں۔ قیدی ؛ **تنک**: کم ۔ معمولی ؛ **استغنا**: بے نیازی ؛ **خجالت**: شرمندگی ؛ **منت کش**: احسان اٹھانے والا ؛ **نگوں**: الٹا ؛ **دستار**: پگڑی ؛ **جورِ گلچیں**: پھول توڑنے والے کے مظالم ؛ **مضمر**: پوشیدہ ؛ **آئینہ رو**: آئینے جیسے چہرے والا، خوبصورت ؛

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دلِ صد چاک بلبل کی ۔ ۔ ۔

وضاحت اے پھول تجھے بلبل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے دل کی فکر کیوں ہے اور تُو اس کے غم میں کیوں گھُلا جا رہا ہے ۔ تیرے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ بُلبل کی فکر کرنے کی بجائے پہلے اپنے لباس پر توجہ کرے اور پہلے اس کے چاک سی کر اِسے عیوب سے پاک کر لے یعنی انسان کو دوسروں کے اعمال پر تنقید کرنے کی بجائے پہلے اپنی فکر کرنی چاہیئے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے ۔

اگر تم زندگی کے باغ یعنی دنیا میں عزت پانے کے خواہاں ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان کانٹوں میں رہ کر اور مشکلات جھیل کر زندہ رہنے کی عادت ڈال لے یعنی مشکلات سے نبرد آزما ہوتے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

صنوبر کے درخت کو دیکھو ۔ یہ درخت پھل نہیں لاتا اسے آزاد کہا جاتا ہے لیکن غور کرو تو معلوم ہو گا کہ آزاد ہونے کے باوجود اس کے پاؤں مٹی میں دھنسے ہوئے ہیں اور یہ قیدی ہے ۔ تجھے بھی مکمل آزادی کا تصور ترک کر کے صنوبر کی طرح پابندیوں کو قبول کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیئے ۔ بصورتِ دیگر تُو پابندیوں سے مطلق آزادی چاہے گا تو اپنا وجود بھی کھو بیٹھے گا ۔

اگر کوئی شخص تجھے تھوڑا بہت دے کر تجھے ممنون کرنا چاہے تو تجھے چاہیئے کہ ان چیزوں کو قبول کر کے ممنونِ احسان ہونے کی بجائے بے نیازی کا رویہ اختیار کرے اور اپنی بے نیازی سے ان دینے

والوں کو شرمندہ کر دے۔ تجھے چاہیئے کہ تو ان شبنم عطا کرنے والوں کا احسان نہ اٹھائے اور اپنے پیالوں اور مٹکوں کو الٹا رکھے۔ علامہ اقبال نے یہی مضمون نظم تصویرِ درد اور شمع و شاعر میں بھی نظم کیا ہے۔

ع بہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثلِ حبابِ آبجو رہنا

ع تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر۔

اے پھول! یہ بات تیری خودداری کے خلاف ہے کہ کوئی شخص تجھے چمن سے توڑے اور اپنی پگڑی کی زینت بنا لے اور کوئی تجھے توڑے اور ہار بنا کر گلے میں ڈال لے اور اپنی آرائش کرے۔ تجھے اس رویے کو ترک کر دینا چاہیئے۔ شبنم گلستان میں پھول کے غنچے سے یہ کہہ کر اڑ گئی کہ اگر تو پھول توڑنے والے کے مظالم برداشت کرنے کا ذوق رکھتا ہے تو پہلے رنگ و بو پیدا کر۔ گلچیں پھول کو صرف اس کی خوشبو یا رنگ کی وجہ سے توڑتا ہے۔ اس لیے اگر تم بھی ان مظالم کو برداشت کرنے کے خواہاں ہو تو پہلے اپنی شخصیت اور کردار میں خوبیاں پیدا کرو اور تو یہ چاہتا ہے کہ تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے اور تو ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے تو پہلے رنگ اور خوشبو سے اپنا تعلق منقطع کر لو۔ یعنی خزاں صرف رنگ و بو کی وجہ سے آتی ہے مثلاً پھول کا رنگ اڑتا ہے اور خوشبو بکھر جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ پھول پر خزاں چھا گئی لیکن اگر خوشبو اور رنگ سے پھول اپنا تعلق توڑ لے تو نہ خوشبو اڑ سکے گی نہ رنگ پھیکا پڑے گا اور نہ پھول خزاں کی زد میں آئے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے پھول تیری زندگی کا کمال اسی امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی حسین اور خوبصورت شخص تجھے توڑے اور اپنے دامن کی زینت بنا لے۔

شیکسپیئر

(۲۵۱)

تعارف علامہ اقبال نے یہ نظم اس وقت لکھی جب انگریزی زبان کے مشہور ڈرامانگار شاعر

پر دنیا کے تقریباً تمام بڑے بڑے شعراء سے نظمیں لکھوانے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس طرح جو نظمیں لکھی گئیں اُن کے انگریزی تراجم ایک کتاب کی شکل میں شائع کئے گئے۔

شیکسپیئر ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور اس نے ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ تقریباً ۱۵۸۷ء میں شیکسپیئر لندن آگیا اور یہاں تھیٹریکل کمپنی میں قسمت آزمائی کی۔ ۱۵۹۴ء میں پہلا ڈراما لکھا جو بہت کامیاب رہا۔ ۱۶۱۱ء تک ڈراما نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ شیکسپیئر کو دنیا بھر کے انگریزی جاننے والے افراد پسند کرتے ہیں۔ شیکسپیئر انسانی نفسیات کا بہت بڑا مزاج داں تھا۔ اقبال نے شیکسپیئر کی اسی خوبی کو واضح کیا ہے۔

حلِ لغات

شفق: صبح کے وقت سورج نکلنے سے ذرا پہلے مشرقی افق پر پھیلی ہوئی سرخی؛ **خرام**: چال، رفتار؛ **آئینہ**: وہ شیشہ جس میں منہ دیکھتے ہیں؛ **شاہدِ مے**: شراب جو محبوب کا درجہ رکھتی ہے؛ **حجلہ**: دلہن کے بیٹھنے کا کمرہ؛ **فکرِ فلک رس**: آسمان تک رسائی رکھنے والی فکر؛ **مآل**: انجام، حاصل؛ **تاب**: روشنی، کرن، شعاع؛ **مستور**: چھپی ہوئی؛ **حفظ**: حفاظت؛ **اسرار**: راز، بھید؛ **سودا**: جنون؛

٥ شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ — — —

وضاحت

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ دریا کی چال اور بہاؤ شفق کی سرخی کے لیے آئینے کا کام دیتی ہے۔ یعنی اگر کسی کو شفق کی حقیقی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہو تو صبح کے وقت دریا کے بہاؤ کا منظر دیکھنا چاہیئے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص شام کے گیت سے لطف اندوز ہونا چاہے تو اُسے شام کے وقت چاروں طرف چھا جانے والی خاموشی کو دیکھنا چاہیئے کہ یہ شام کے نغموں کے لیے آئینے کا کام کرتی ہے۔ بہار کے خوبصورت چہرے اور رخسار کے لیے پھول کی پتی آئینے کی حیثیت رکھتی ہے اور پیالے کا کمرہ یعنی پیالہ شراب کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح حقیقت اور سچائی کے لیے حسن آئینے کا کام دیتا ہے اور دل حسن کے لیے آئینے کا کام دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص انسان کے دل کے اسرار و رموز اور کیفیات سمجھنا چاہے تو اس شخص کو شیکسپیئر کا کلام پڑھنا چاہیئے۔ کہ انسانی مزاج و نفسیات کا آئینہ یہی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے شیکسپیئر دراصل زندگی کا کمال آسمان تک پرواز کرنے والے تیرے تخیل کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا تیری روشن فطرت زندگی کے انجام کی حیثیت رکھتی تھی یعنی کیا زندگی تیری فطرت و طبیعت سے بہتر فطرت پیدا نہیں کر سکی۔

۵ تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا ۔۔۔

وضاحت اے شیکسپیئر جب تیرا دیدار کرنے کی خواہاں آنکھ نے تجھے ڈھونڈنا چاہا تو اس آنکھ نے سورج کو اُس کی شعاعوں اور روشنی میں چھپا ہوا دیکھا۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح کوئی آدمی سورج کو دیکھنا چاہے تو سورج کی تیز روشنی کے باعث وہ سورج کو تو نہیں دیکھ سکے گا البتہ اِس روشنی اور سورج کی تیز شعاعوں کی وجہ سے سورج کی حقیقی قدر وقیمت کا اندازہ ضرور کرے گا۔ اسی طرح جب کسی نے شیکسپیئر کو پانا چاہا تو وہ شیکسپیئر کی حقیقی عظمت کا اندازہ تو نہ کر سکا۔ البتہ اس کے کلام کی وجہ سے بڑی حد تک اُسے سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اے شیکسپیئر! دنیا کی آنکھوں سے تیرا وجود چھپا رہا، جبکہ تیری آنکھوں نے اس دنیا کے تمام پردے ہٹا دیئے اور اسے بالکل بے پردہ دیکھ لیا۔ یعنی تیرے کلام میں زندگی کے اسرار و رموز بالکل بے پردہ ہو گئے ہیں۔ لیکن قدرت کو اپنے راز چھپانے کا اِس قدر جنون ہے کہ وہ اپنے رازوں کو ایسی انداز میں سمجھنے والا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں کرے گی۔ یعنی جس طرح تُو نے قدرت کے اسرار و رموز کو عریاں کر دیا ہے، قدرت اسے پسند نہیں کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تجھ جیسی دوسری شخصیت پیدا نہیں ہو گی۔ گویا اس طرح اقبال نے شیکسپیئر کو بے مثال اور منفرد شاعر قرار دیا ہے۔

مَیں اور تُو

(۲۵۲)

تعارف روزگارِ فقیر کے مطابق علامہ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے منعقدہ ۱۹۱۸ء میں پڑھی تھی۔ اس وقت نظم کے اشعار کی تعداد ۱۲ تھی۔ نظرِ ثانی میں تین شعر حذف کر دیئے گئے جو روزگارِ فقیر میں درج ہیں۔

حلِ لغات **کلیم**: کلام کرنے والا، بولنے والا، حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے اللہ تعالےٰ سے گفتگو کی تھی۔ **خلیل**: دوست، حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ ہے۔ **سامری**: جادوگر، یہ بنی اسرائیل کے ایک جادوگر کی طرف اشارہ ہے جس نے

حضرت موسیٰؑ کی توحید پرست قوم کو پھر سے بت پرستی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ کی غیر حاضری میں اس شخص نے بنی اسرائیل کو ایک بچھڑے کی پوجا کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اتفاق سے اِس سامری کا نام بھی موسیٰ ابن ظفر تھا؛ **قتیل** : مارا ہوا؛ **شیدائی** : عاشق؛ **آذر** : حضرت ابراہیم کے والد یا چچا جو بہت بڑے بت تراش تھے؛ **پریدہ رنگ** : جس کا رنگ اڑ گیا ہو؛ **رمیدہ بُو** : جس کی بُو رخصت ہو چکی ہو؛ **سم** : زہر؛ **بود** : موجود ہونا، زندگی؛ **عدم** : موجود نہ ہونا، موت؛ **گرو** : رہن رکھا ہوا، فروخت کیا ہوا؛ **نانِ شعیر** : جَو کی روٹی؛ **مدار** : انحصار؛ **سرشت** : عادت؛ **سمندر** : ایک کیڑا جس کے بارے میں یہ روایت عام ہے کہ وہ آگ میں رہتا ہے؛ **ہری ہری** : ہر سے مشتق، ہندو خدا کو ہر کہتے ہیں۔ عام طور پر افسوس کے موقع پر بولا جاتا ہے، توبہ کرنے کا انداز؛ **ستیزہ گاہ** : میدانِ جنگ؛ **حریف پنجہ فگن** : پنجہ لڑانے والے دشمن؛ **مرحبی** : مرحب کے پیروکار او منقلد، مرحب یہودیوں کا ایک سردار جسے حضرت علی المرتضیٰؓ نے غزوہ خیبر کے موقع پر قلعہ القموص میں موت کے گھاٹ اتارا تھا؛ **عنتری** : عنتر کا پیرو۔ یہودی سردار مرحب کا بھائی۔ یہ شخص بھی قلعہ القموص میں حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارا گیا؛

ے نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا ـ ـ ـ

وضاحت علامہ اقبال مسلمانوں سے مخاطب ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ میں اپنی قوم کا شاعر ہوں اور اِسی وجہ سے کلیم کہلا سکتا ہوں لیکن افسوس کہ مجھ میں حضرت موسیٰؑ جیسا سلیقہ موجود نہیں۔ یعنی میں اپنی گمراہ اور بھٹکی ہوئی قوم کی رہنمائی کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ اِسی طرح تم میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی شان موجود نہیں ہے۔ جنھوں نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے بت پرستوں کے بت توڑے، اللہ کا گھر بنایا، آتشِ نمرود میں چھلانگ لگائی۔ خدا کے راستے میں وطن سے ہجرت کی، اللہ کا گھر تعمیر کیا اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہِ خدا میں اپنے لختِ جگر کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے کلیم ہونا چاہیئے تھا، لیکن میں اس کے برعکس عمل کرتا ہوں۔ اور سامری جیسے جادوگر کے زیرِ اثر آگیا ہوں۔ تمھیں خلیل ہونا چاہیئے تھا لیکن تم بھی اپنے راستے سے ہٹ کر بت گر اور بت پرستوں کے طریقے اختیار کر رہے ہو۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اکثر رہنما کلیم و خلیل کی پیروی کے برعکس سامری اور آذر کی راہ پر چل رہے ہیں۔

میری مثال اُس بلبل کی ہے جس کی آواز اس اس کے گلے میں خشک ہو گئی ہو اور وہ

نغمے نہ گا سکتا ہو۔ جبکہ تیری حالت اس پھول جیسی ہے جس کا رنگ بھی اڑ چکا ہو اور خوشبو بھی رخصت ہو چکی ہو اور یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو پھول بیکار ہو جاتا ہے اور اس کی رعنائی و دلآویزی باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں آرزو کے غم کی کہانی بن چکا ہوں جبکہ تیری حیثیت محبوبیت کے ماتم کی ایک بات سے زیادہ نہیں رہی۔

ان حالات میں میری عیش و عشرت بھی محض غم و اندوہ ہے اور میرا شہد و شیرینی بھی زہر ہے۔ میرا وجود اور میری زندگی موت اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح تیرا دل جو خانہ کعبہ کی طرح پاکیزہ تھا، اب غیر اسلامی خیالات و عقائد اور معاشرت کے پاس رہن رکھا ہوا ہے اور تیرا دین کافرانہ طریقوں کے ہاتھ بک چکا ہے۔

زندگی کا ایک ایک سانس ہماری زندگی کو کم کر رہا ہے اور ہماری زندگی اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے اور زندگی کی یہ گزران اور خاتمہ ہمیں غمزدہ کر رہا ہے۔ زندگی گزرنے کا یہ غم دراصل ایک طرح کا زہر ہے جو بالآخر ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر دے گا۔ لیکن ہمیں زندگی گذرنے کا غم نہیں کرنا چاہیئے اور غم کا زہر نہیں کھانا چاہیئے کہ قلندروں کی شان یہی ہے۔

اگر تیرے وجود اور زندگی میں اب کوئی چنگاری موجود ہے تو تجھے فقر و غنا یعنی افلاس و امارت کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ دنیا میں حضرت علی المرتضیٰؓ جیسی عظیم قوت کا انحصار دولت مندی کی بجائے جَو کی روٹی پر ہے یعنی وہ جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ اس کے باوجود در خیبر اکھاڑنے میں کامیاب ہوئے، قلعہ القموص فتح کیا اور مرحب و عنتر پر غلبہ پایا۔ یعنی اگر تو مفلس و نادار بھی ہو تو کیا ہوا ایمان کی پختگی کے باعث آج بھی حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔

اے کعبے کے چراغ تو تجھے طواف کرنے کا کوئی ایسا طریقہ بتا کہ تیرے دیوانے اور شیدائی میں پھر سے آگ میں رہنے والے کیڑے کی سی عادت پیدا ہو جائے۔ یعنی مسلمان پھر سے مشکلات میں جینا، ان کا مقابلہ کرنا اور مشکل حالات کے باوجود آگے بڑھنا سیکھ لیں۔

اہل حرم یعنی مسلمان حرم یعنی کعبے اور اسلام کے ساتھ جس طرح کی وفا کرتے ہیں وہ دراصل جفا ہے جس کی وجہ سے کعبہ اور اسلام مسلمانوں سے شاکی ہیں اور یہ ایسی شکایت ہے کہ اگر اس کا حال کسی بت خانے میں رکھے ہوئے بتوں کے سامنے بیان کیا جائے تو اسلام اور کعبے کے دشمن ہونے کے باوجود وہ بھی حد سے زیادہ افسوس کے باعث خدا خدا پکارنے اور توبہ توبہ کرنے لگیں۔ یعنی دشمنوں کو بھی کعبے اور اسلام سے ہمدردی محسوس ہونے لگے۔

دنیا میں نہ تو کوئی میدان نیا ہے اور نہ ہی مختلف میدانوں میں لڑنے والے لوگ نئے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ وہی حق و باطل کی آویزش اور کشمکش جاری ہے۔ ایک طرف حضرت علی المرتضیٰ یعنی حق صف آرا ہے اور دوسری طرف مرحب وعنتر یعنی کفر و باطل نے ہتھیار سجا رکھے ہیں، مقامات اور لوگ بدلتے رہتے ہیں ورنہ کشمکش اور وجہِ کشمکش ایک ہی ہے۔ اقبال نے یہی بات ایک اور جگہ بھی کہی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

علامہ اقبال آنحضرتؐ سے رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرب و عجم یعنی ساری دنیا کے بادشاہ! ہم پر مہربانی فرما۔ ہم لوگ، جو حقیقت میں بھکاری ہیں لیکن جنہیں آپ کے فیضانِ عالم نے سکندر جیسے عظیم بادشاہ کا سا خراج عطا کیا ہے، بڑی دیر سے آپ کی مہربانی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یعنی علامہ اقبال کے نزدیک آنحضرتؐ کے تصرفاتِ روحانی کے بغیر مسلمانوں کی ترقی اور عروج ممکن نہیں۔

اسیری

(۲۵۳)

تعارف تحریکِ خلافت کے دوران میں انگریز حکومت نے تحریک کی شدت کو کم کرنے کی غرض سے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کو گرفتار کر لیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انہیں رہا کیا گیا تو برِصغیر کے مختلف شہروں میں علی برادران کی رہائی اور آمد کے سلسلے میں عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے۔ امرتسر میں بھی ایک جلسہ ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے یہ نظم اس جلسے میں پڑھ کر سنائی۔ اِس نظم کے مخاطب علی برادران ہی تھے۔

حلِ لغات اسیری: قید، نظربندی ؛ عتبار افزا: وقار بڑھانے والی ؛ قطرۂ نیساں: موسمِ بہار میں برسنے والی بارش کا قطرہ ؛ زنداں: قیدخانہ ؛ صدف: سیپ ؛ ارجمند: قیمتی، معزز ۔ ازفر: خالص ؛ نافۂ آہو:

ہرن کی ناف سے نکلنے والی خوشبو؛ **طائر** : پرندہ ؛

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر فطرت بلند ہو تو قید اور نظر بندی انسان کے وقار میں اضافے کا باعث بنتی ہے ۔ مثلاً موسم بہار کی بارش کا قطرہ سیپ میں قید ہو کر موتی بنتا اور عزت و آبرو پاتا ہے ۔ اسی طرح خالص مشک کو دیکھئے ، یہ صرف خون کا ایک قطرہ ہے لیکن جب یہ ہرن کی ناف میں جم کر مقید ہو جاتا ہے تو مشک بن کر عزت و توقیر پاتا ہے ۔ لیکن قدرت اِس انداز سے ہر ایک کی عزت نہیں کرتی ، دنیا میں ایسے پرندے بہت کم ہیں جن کو جال اور پنجرے میں بند کیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ حافظ شیرازی کہتے ہیں کہ اگرچہ کوے اور چیل بلند پرواز ہیں پھر بھی کوئی انھیں قید نہیں کرتا ۔ یہ خوش قسمتی تو صرف عقاب اور شاہین کے حصّے میں آئی ہے ۔ یعنی لوگ صرف اِس پرندے کو قید کرتے ہیں ۔

دریوزۂ خلافت

(۲۵۴)

تعارف ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا تو ترکی نے بہ امرِ مجبوری جرمنی کا ساتھ دیا ، جب کہ ہندی مسلمان ترکوں سے مکمل ہمدردی رکھنے کے باوجود انگریزی نوآبادی کے باشندے ہونے کی وجہ سے اتحادی قوتوں کے ساتھ تھے ۔ البتہ انھوں نے انگریزوں سے جن شرائط پر تعاون کیا تھا اُن میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ فتح کی صورت میں سلطنتِ عثمانیہ کو کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا ۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں جیسے ہی ترکوں نے ہتھیار ڈالے انگریزوں کے تیور بدل گئے ۔ انگریزوں نے ترکوں کی شکست کو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی شکست کا انتقام قرار دیا اور یہ طے کیا کہ ترکی کو بالکل ختم کر دیا جائے ۔ اِن حالات میں سلطنتِ عثمانیہ اور نظامِ خلافت کے تحفظ کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا ۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں امرتسر میں خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام منعقدہ جلسے میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ خلافت کمیٹی کا ایک وفد وزیرِ اعظم انگلستان سے ملے

اور برطانیہ کے وعدے یاد دلاتے ہوئے انھیں سلطنتِ عثمانیہ کو تحفظ فراہم کرنے پر آمادہ کرے۔ اقبال اِس تجویز کے مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ تحفظ صرف قوتِ بازو سے حاصل کیا جا سکتا ہے درخواستوں سے نہیں۔ "دریوزۂ خلافت" میں یہی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازاں اقبال کا یہ نقطۂ نظر درست ثابت ہوا اور خلافت کمیٹی کے وفد کو ناکام واپس آنا پڑا۔

حلِ لغات

دریوزہ: بھیک ؛ آگہی: واقفیت ؛ گدائی: بھیک مانگنا ؛ ننگ: باعثِ شرم ؛

۵ اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — — —

وضاحت

علامہ اقبال مسلمانوں سے اور بالخصوص خلافت کمیٹی کے ارکان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی ملک تمھارے قبضے سے جا رہا ہو تو بیشک اِس سے دست بردار ہو جاؤ لیکن اِس کے عوض اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا تم تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے۔ تاریخ کا ایک اہم درس یہ ہے کہ مملکتیں اور سلطنتیں بھیک میں نہیں ملا کرتیں بلکہ قوتِ بازو سے حاصل کی جاتی ہیں جبکہ تم خلافت کے نظام اور سلطنتِ عثمانیہ کے دوام کی بھیک مانگنے جا رہے ہو۔ جس بادشاہت اور حکومت کو مسلمان اپنے لہو سے نہ خریدیں یعنی جسے جان کی بازی لگا کر حاصل نہ کریں وہ بادشاہت اور حکومت مسلمانوں کے لیے باعثِ شرم و ندامت ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میرے لئے شکست کھانے اور اپنی ہڈیوں کو توڑ لینے کی نسبت دوسروں سے مومیائی اور قوت حاصل کرنا زیادہ شرمناک ہے۔ واضح رہے کہ مومیائی ایک دوا کو کہا جاتا ہے جو پہاڑوں سے حاصل ہوتی ہے اور جس کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اِس سے ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔ یعنی علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اِس دوا کو بھیک کے طور پر مانگنے سے زیادہ بہتر ہے کہ انسان اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر ہی قناعت کر لے۔

ہمایوں

(۲۵۴)

تعارف جسٹس شاہ دین مرحوم علامہ اقبال کے دوست تھے۔ ہمایوں تخلص کرتے تھے شاہ دین ۱۸۹۰ء میں انگلستان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے، کچھ عرصہ بعد پنجاب ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ علامہ اقبال نے بطورِ مرثیہ یہ نظم لکھی۔ یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جسٹس شاہ دین کے فرزند میاں بشیر احمد نے اپنے والد ہی کی یاد کے طور پر اردو ادب کا ایک موقر ماہنامہ "ہمایوں" جاری کیا تھا۔

حلِ لغات **انجمن افروز**: محفل کو روشن کرنے والا؛ **نزار**: کمزور؛ **شعلہ گردوں نورد**: آسمان کو لپیٹ میں لینے والا شعلہ؛ **فردا**: آنے والی کل۔

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی — — —

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے ہمایوں تیری زندگی سرتا پا جلن کی حیثیت رکھتی تھی تیری ذات اس چراغ کی مانند تھی جو ساری محفل کو روشن کر دیتا ہے۔ اگرچہ مٹی سے بنا ہوا تیرا جسم بہت ہی کمزور اور دردمند تھا لیکن تیری طبیعت بلند ستاروں کی طرح روشن تھی۔ تیرے کمزور جسم میں کتنا بے خوف دل موجود تھا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے مٹھی بھر مٹی میں آسمان تک کو اپنی لپیٹ میں لینے والا شعلہ موجود تھا۔ لیکن عاقل اور سمجھدار دل موت کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ رات کی خاموشی میں آئندہ آنے والی کل کا ہنگامہ چھپا ہوا ہے۔ یعنی رات گذرے گی تو آنے والی کل کے ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔

غافل لوگ موت کو زندگی کا خاتمہ تصور کرتے ہیں حالانکہ زندگی کی وہ شام جسے موت کہا جاتا ہے دراصل زندگی کو ہمیشگی بخشنے والی صبح ہے۔

خضرِ راہ

(۲۵۵)

تعارف جنگِ عظیم اول کا خاتمہ مسلمانانِ عالم بالخصوص مسلمانانِ برصغیر کے لیے ازحد تکلیف دہ دور کا آغاز ثابت ہوا۔ نظم خضرِ راہ اسی عہد کے مسلم احساسات کی ترجمانی کرتی ہے یہ نظم ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی اور اپریل ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں منعقد ہونے والے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اِس جلسے میں بیس ہزار کے لگ بھگ سامعین موجود تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ نظم خضرِ راہ پڑھتے ہوئے علامہ اقبال پر بھی بہت رقت طاری ہوتی اور سامعین بھی اس طرح روتے رہے کہ جلسے پر محرم کی عزاداری کا گمان ہوتا تھا۔

نظم خضرِ راہ ترکیب بند ہیئت کے گیارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دو بند منظر نگاری اور شاعر کے سوالات پر مشتمل ہیں جبکہ باقی گیارہ بندوں میں خضر نے شاعر کے سوالات کا جواب دیا ہے۔ ابتداء میں پوری نظم کے صرف دو عنوان تھے۔ بعد ازاں مضامین و موضوعات کی مناسبت سے جوابات خضر سے متعلق حصے کو بھی مختلف عنوانات دے دیئے گئے۔ نظرِ ثانی میں اس نظم کا صرف ایک شعر حذف کیا گیا جو روزگارِ فقیر اور اقبال کی طویل نظمیں میں دے دیئے گئے۔

خضرِ راہ کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا یہ خیال درست نہیں کہ یہ پہلی نظم ہے جو علامہ اقبال نے یورپ سے واپسی کے بعد انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی تھی۔

حل لغات **خضر:** مختلف روایات میں حضرت خضرؑ کا ذکر ایک ایسی شخصیت کے طور پر آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان روایات کے مطابق حضرت خضر دنیا کے سب سے زیادہ زیرک اور فہمیدہ شخص ہیں، غائب کی باتیں جانتے ہیں۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ تمام دنیا میں سرسبزوشادابی محض اُن کے دم قدم سے ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرتِ خضر کو دائمی زندگی حاصل ہے۔ بعض لوگ خضر کو ایک نبی خیال کرتے ہیں لیکن اُن پر تبلیغ دین کا فرض عائد نہیں کیا گیا۔ جبکہ بعض کے نزدیک یہ صرف ولایت کا ایک مقام ہے، جیسے ابدال، غوث اور قطب وغیرہ۔ جب ایک خضر کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس مرتبے پر کسی دوسرے شخص

کو فائز کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو لیکن قرآن شریف میں حضرتِ خضر کا ذکر خدا کے ایک ایسے بندے کی حیثیت سے کیا گیا ہے جو بہت زیادہ بصیرت کا حامل تھا۔ اسی کی بنا پر علامہ اقبال نے اس نظم میں حضرت خضر سے رہنمائی حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے اور اپنے خیالات کو زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی ؛ **اضطراب** : بے چینی ؛ **سکوت افزا** : خاموشی بڑھانے والی ؛ **آسودہ** : آرام و راحت پائی ہوئی چیز ؛ **نرم سیر** : آہستہ چلنے والا ؛ **انجم کم ضو** : تھوڑی روشنی والے ستارے ؛ **طلسم** : جادو ؛ **گہوارہ** : پالنا، پنگھوڑا ؛ **طفلِ شیر خوار** : دودھ پیتا بچہ ؛ **افسوں** : جادو ؛ **طائر** : پرندہ ؛ **پیک جہاں پیما** : تمام دنیا کا سفر کرنے والا قاصد ؛ **پیری** : بڑھاپا ؛ **شباب** : جوانی ؛ **جویائے اسرارِ ازل** : ازل کے بھیدوں کو تلاش کرنے والا ؛ **وا** : کھلی ہوئی ؛ **تشبیہ** : مراد ہے تشبیہاتی ؛ **چشمِ جہاں بیں** : پوری دنیا کو دیکھنے والی آنکھ ؛ **آشکار** : ظاہر، کھلے ہوئے ؛ **کشتیٔ مسکیں** : اس غریب آدمی کی کشتی کی طرف اشارہ ہے جس میں قرآن شریف کے مطابق حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ سفر کر رہے تھے اور جس میں حضرت خضر نے مصلحت کی بنا پر سوراخ کر دیا تھا اور کشتی عیب دار ہو گئی تھی ؛ **جانِ پاک** : اُس چھوٹے اور معصوم بچے کی طرف اشارہ ہے جسے سفر کے دوران میں حضرتِ خضرؑ نے بظاہر بے وجہ قتل کر دیا تھا ؛ **دیوارِ یتیم** : حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے سفر میں پیش آنے والے اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں یہ دونوں بزرگ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے اپنے لئے ضیافت چاہی۔ سب لوگوں نے ان مسافروں کو کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ جاتے ہوئے حضرت خضر نے ایک مکان کی دیوار کو بہت خستہ پایا اور اس کی مرمت شروع کر دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اعتراض کیا اور کہا کہ جس بستی سے ہمیں ضیافت نہ مل سکی اس کے کسی مکان کی مرمت کیوں کی جائے۔ حضرتِ خضرؑ نے جواب دیا کہ ان یتیم بچوں کے والد نے اپنی وفات سے قبل بچوں کے لیے کچھ دولت اس دیوار میں چھپا دی تھی۔ اگر دیوار کی مرمت نہ کی جاتی اور یہ دیوار گر پڑتی تو اس دولت کو دوسرے لوگ نکال لے جاتے اور بے چارے یتیم بچے اس دولت سے محروم رہتے۔

حیرت فروش : حیرت بیچنے والا، بہت زیادہ حیران ؛ **فردا** : آنے والی کل ؛ **دوش** : گذری ہوئی کل ؛ **خروش** : جھگڑا، ہنگامہ، چپقلش، شور و غل ؛ **خرقۂ دیرینہ** : پرانا لباس ؛ **پیرایہ پوش** : لباس پہننے والا ؛ **اسکندر** : یونان کا مشہور بادشاہ سکندر جس کی فوجیں ملک پر ملک فتح کرتے ہوئے ہندوستان تک پہنچ گئی تھیں ؛ **گرم نا و نوش** : پینے پلانے میں مصروف، استفادہ کرنے والے ؛ **ہاشمی** : عربوں خاص طور پر والیٔ حجاز حسین شریف مکہ کے لیے تلمیح ہے جس

نے ۱۹۱۶ء میں ترکوں کے خلاف غداری کرکے عالمِ اسلام کو سنگین نوعیت کی تباہی سے دوچار کر دیا تھا۔
ترکمان : ترکوں کی طرف اشارہ ہے جو شریفِ مکہ کی غداری کے باوجود بڑی ہمت و جرأت کے ساتھ کفر کے خلاف صف آرا رہے ۔ **نمرود :** ایک بادشاہ جس نے حضرت ابراہیمؑ کو کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں آگ کے شعلوں میں ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ **تگا پوئے دمادم :** مسلسل جدوجہد ۔ **رہین خانہ :** گھر کا احسان اٹھانے والا ، ہمہ وقت گھر میں مقید رہنے والا ۔ **سماں :** منظر ۔ **بانگ :** آواز ۔ **سیماب پا :** پارے جیسے پاؤں والا جسے سکون نہ ہو ، مسلسل حرکت میں رہنے والا ۔ **ہنگام :** وقت ۔ **بام :** چھت ۔ **گردوں :** آسمان ۔ **جبیں :** پیشانی ، ماتھا ۔ **چشمِ جہاں بیں :** ساری دنیا کو دیکھنے والی آنکھ ۔ **خلیل :** دوست ، حضرت ابراہیمؑ کا لقب ۔ **کارواں :** قافلہ ۔ **سلسبیل :** جنت کی ایک نہر کا نام جس سے قیامت کے دن نیک کام کرنے والے لوگ اپنی پیاس بجھائیں گے ۔ **زنجیری :** قیدی ۔ **کشت :** کھیتی ۔ **نخیل :** درخت ، باغات ۔ **رازِ دوامِ زندگی :** زندگی کی ہمیشگی کا بھید ۔ **برتر :** بالا ۔ **اندیشہ :** فکر ۔ **سود :** نفع ۔ **زیاں :** نقصان ، خسارہ ۔ **تسلیم :** اطاعت ، رضامندی ، ایثار ، قربانی ۔ **امروز :** آج کا دن ، حال ۔ **فردا :** آنے والا دن ، مستقبل ۔ **جاوداں :** ہمیشہ رہنے والی ۔ **دواں :** دوڑنے والی ۔ **سر :** راز ، بھید ۔ **کن فکاں :** کائنات ، دنیا ۔ **کوہکن :** پہاڑ کاٹنے والا ، فرہاد ۔ **جوئے شیر :** دودھ کی ندی ۔ **تیشہ :** کدال ، پہاڑ کاٹنے کا ہتھیار ۔ **سنگِ گراں :** بھاری پتھر ۔ **بندگی :** غلامی ۔ **جوئے کم آب :** بہت کم پانی والی ندی ۔ **بحرِ بیکراں :** ایسا سمندر جس کا کنارا نہ ہو ۔ **آشکارا :** ہویدا ، ظاہر ۔ **قلزم :** سمندر ۔ **حباب :** بلبلہ ۔ **زیاں خانہ :** نقصان کا گھر ، مراد ہے دنیا ۔ **خام :** کچا ، ناپختہ ۔ **شمشیرِ بے زنہار :** بے پناہ تلوار ، ایسی تلوار جس کی ضرب سے بچا نہ جا سکے ۔ **مستعار :** ادھار لیا ہوا ۔ **فروغ :** بڑھنا ، پھلنا ، پھولنا ، ترقی پانا ۔ **بدخشاں :** افغانستان کا ایک صوبہ جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں پر لعلوں کی ایک بہت بڑی کان تھی ۔ **نالۂ شب گیر :** رات کو کھینچا ہوا نالہ ۔ **سفیر :** قاصد ۔ **محشر :** قیامت ۔ **عرصہ :** میدان ۔ **رمز :** بھید ، راز ، پتے کی بات ، نکتہ ۔ **اِن الملوک :** قرآن شریف کی سورۃ النمل کی طرف اشارہ ہے جس میں ملکہ سبا کا ایک قول دہرایا گیا ہے ۔ وہ حضرت سلیمانؑ کے پیغام کے جواب میں اپنے مشیروں سے مشورہ لینے کے بعد کہتی ہے کہ جب بادشاہ کسی بستی میں گھستے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں اور

وہاں کے سرداروں کو بے عزت کر دیتے ہیں ۔ **اقوامِ غالب** : غلبہ حاصل کرنے والی قومیں یعنی فاتح قومیں ؛ **ساحری** : جادوگری ؛ **محمود** : محمود غزنوی کی طرف اشارہ کرکے تمام حکمران مراد لئے گئے ہیں ۔ **ایاز** : محمود غزنوی کا ایک غلام جسے بعض لوگ محمود کا عاشق یا محبوب بھی کہتے ہیں، یہ محمود غزنوی کی طرف سے صوبۂ پنجاب کا گورنر بھی رہا، اس سے عام غلام بھی مراد ہیں ؛ **دلبری** : محبوبیت ؛ **اسرائیل** : حضرت یعقوبؑ کا خطاب ۔ لیکن یہاں پر حضرت یعقوبؑ کی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حضرت موسیٰ مراد ہیں ۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ مظلوم تھے لہٰذا دنیا کے تمام مظلوموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ **سامری** : جادوگر، موسیٰ ابن ظفر جس نے حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ساری قوم کو راہ راست سے بھٹکا کر ایک بچھڑے کی پرستش پر مائل کر دیا تھا ؛ **سروری** : حکومت ؛ **بے ہمتا** : بے مثال، منفرد، یکتا ؛ **قیصری** : بادشاہت ؛ **دیوِ استبداد** : ظلم وجبر کا دیو ؛ **پائے کوکب** : ناچنے والا ؛ **حیلہ گر** : بہانے ساز ؛ **شاخِ آہو** : ہرن کا سینگ ؛ **برات** : معاوضہ، تنخواہ ؛ **دستِ دولت آفریں** : دولت پیدا کرنے والے ہاتھ یعنی مزدور، محنت کش ؛ **مزد** : محنت کا معاوضہ، مزدوری ؛ **ساحر الموط** : موط کا جادوگر، حسن بن صباح کی طرف اشارہ ہے جس نے قلعہ التمونت میں جنت بنائی تھی ۔ اس کے آدمی لوگوں کو بھنگ پلا کر جنت میں پہنچایا کرتے تھے بعدازاں وہ انھیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا ؛ **برگِ حشیش** : بھنگ کی پتی ؛ **شاخِ بنات** : مصری کی ڈلی، شیرینی ؛ **خواجگی** : حکمرانوں کی فطرت ؛ **مسکرات** : نشہ آور اشیا مثلاً بھنگ وغیرہ ؛ **سُکر** : نشہ ؛ **مکر** : دھوکا، فریب ؛ **مات** : شکست ؛ **گیتی** : زمین ؛ **کرمک** : پروانہ ؛ **تثلیث** : عیسائیوں کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے جس کی رُو سے وہ تین خداؤں کو مانتے ہیں ؛ **خشت** : اینٹ ؛ **کلاہ** : ٹوپی ؛ **پارس** : فارس، ایران ؛ **حکمت** : دانائی، سیاست ؛ **گاز** : قینچی ؛ **مومیائی** : ایک دوا جو پہاڑوں سے حاصل ہوتی ہے اور جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ دیتی ہے ؛ **مور** : چیونٹی ؛ **کاشغر** : روسی ترکستان کے ایک شہر کا نام ؛ **ترکِ خرگاہی** : شاہی خیموں میں رہنے والے ترک یعنی ترک حکمران ؛ **بنا** : بنیاد ؛ **استوار** : پختہ، محکم ؛ **سطوت** : شاہی شان وشوکت ؛ **حریت** : آزادی ؛ **سمندر** : ایک کیڑا جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ آگ میں رہتا ہے ۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر ـــــ

وضاحت میں ایک رات دریا کے کنارے اپنے دل میں اضطراب و بے چینی لئے

مختلف مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ اُس وقت رات خاموشی کو بڑھا رہی تھی یعنی ہر طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور دریا کا پانی بہت آہستگی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بہتے ہوئے اِس پانی کو دیکھ کر حیران تھا کہ یہ پانی ہے یا محض پانی کی تصویر ہے۔ جس طرح دودھ پیتا بچہ اپنے ہنگھوڑے میں سو جاتا ہے، دریا کی بے چین موجیں بھی دریا کی گہرائی میں اسی طرح آرام و اطمینان کے ساتھ سو رہی تھیں۔ رات کے جادو کے زیرِ اثر تمام پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں قید ہو چکے تھے اور تھوڑی تھوڑی روشنی دینے والے ستارے چاند کے جادو میں گرفتار نظر آتے تھے یعنی چاند کے سامنے ان کی روشنی ماند پڑ چکی تھی۔ اِس عالم میں کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کا سفر کرنے والا یعنی خضر، جس کے بڑھاپے میں صبح کی طرح جوانی کا رنگ موجود ہے، میرے سامنے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اے ازل کے رازوں کو تلاش کرنے والے اگر انسان کی آنکھ کھلی ہو اور وہ دیکھنے کا سلیقہ رکھتا ہو تو دنیا کی تقدیر اور اس کے تمام اندازے بالکل ظاہر ہو جاتے ہیں۔

میں نے خضر کی یہ بات سنی تو میرے دل میں قیامت جیسا ہنگامہ پیدا ہو گیا اور چونکہ میں تلاش و جستجو کا مارا ہوا تھا، لہٰذا فوراً بولا:

۵ اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار ۔ ۔ ۔

وضاحت

میں نے کہا کہ اے خضر دانا اور صاحبِ بصیرت شخص ہے کہ تیری تمام دنیا کو دیکھ لینے کی صلاحیت رکھنے والی آنکھوں پر اُن طوفانوں کے ہنگامے بھی ظاہر اور ہویدا ہیں جو ابھی دریا میں خاموشی سے سو رہے ہیں یعنی تُو ان انقلابات سے بھی واقف و آگاہ ہے جو ابھی دنیا میں وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال سورۃ کہف میں بیان کردہ واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مسکین کی کشتی کو عیب دار کرنے، ایک بے گناہ بچے کو قتل کرنے اور ضیافت سے انکار کر دینے کے باوجود یتیم بچے کی دیوار کی تعمیر و مرمت کرنے اور اُن پر حضرتِ موسیٰ کے سوالات و اعتراضات سے یہ بات ظاہر ہے کہ نبی ہونے کے باوجود حضرت موسیٰؑ جیسے پیغمبر کا علم بھی تیرے سامنے حیرت زدہ اور دم بخود ہے۔ اے خضر تو آبادیاں اور شہر چھوڑ کر صحراؤں اور ویرانوں میں رہتا ہے اور تیری زندگی رات اور دن اور ماضی و مستقبل کی قید سے آزاد ہے یعنی مرورِ ایام تجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ بتایئے کہ زندگی کا حقیقی راز کیا ہے۔ سلطنت و حکومت کے کیا معنی ہیں؟ اور آجکل سرمایہ و محنت میں کیسا جھگڑا اور ہنگامہ بپا ہے؟ ایشیا کا پرانا لباس پھٹ رہا ہے اور نئی نئی قومیں حکومت حاصل کر رہی ہیں۔ نئی نسلیں ان تازہ ابھرنے والی قوموں کا انداز اپنا

رہی ہیں ۔ اگرچہ سکندر آب حیات سے محروم رہا اور اُسے دائمی زندگی میسر نہ آسکی لیکن اس کی فطرت اب تک پینے پلانے میں مصروف ہے یعنی سکندر کے مرنے کے باوجود حکمرانی اور بادشاہت کا دور دورہ ہے ۔ ہاشمی جن کے خاندان کے طفیل اسلام ساری دنیا میں پھیلا ، آنحضرتؐ کی عزت و ناموس کو فروخت کرنے اور اسلام سے غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں جبکہ ترک جو ایک زمانے تک اسلام کے سخت مخالف رہے ، اسلام کے لیے قربانی و ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں ۔ ملت اسلامیہ پر یہ کیسا وقت آگیا ہے ۔ اب ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے ۔ ابراہیم کی اولاد یعنی مسلمان ہیں اور قوت و جبر اور باطل و کفر کے نمائندے نمرود کا کردار ادا کرتے ہوتے ملتِ اسلامیہ کو آگ میں دھکیل دینے کے درپے ہیں ۔ کیا اس سے یہ تصور کیا جائے کہ اب پھر باطل کی یہ قوتیں مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتی ہیں ۔

؎ کیوں تعجب ہے میری صحرا نوردی پر تجھے ۔۔۔۔۔

وضاحت تیسرے بند سے جناب خضرؑ علامہ اقبال کے سوالات کا جواب دینا شروع کرتے ہیں ۔ چونکہ پہلا سوال خضرؑ کی صحرا نوردی سے ہی شروع ہوتا ہے ۔ خضرؑ کہتے ہیں کہ اے اقبال تجھے میری صحرا نوردی پر حیرت کیوں ہے ، سیدھی سی بات ہے کہ میری یہ مسلسل جدوجہد اور بھاگ دوڑ میرے زندہ ہونے کی دلیل ہے ۔ اے اپنے گھر کا احسان اٹھانے والے یعنی ہمہ وقت گھر میں رہنے کے عادی ! تو نے وہ منظر نہیں دیکھا جب صحرا میں سفر کرتے ہوئے قافلوں کے ساتھ گھنٹی کی آواز گونجتی ہے ۔ تو نے وہ منظر نہیں دیکھا جب کوئی ہرن نہایت بے پروائی سے ریت کے ٹیلے پر چلتا ہے ۔ قافلے صحرا میں ساز و سامان کے بغیر قیام کرتے اور پتھروں اور میلوں کے نشانات کے بغیر سفر کرتے ہیں ۔ یعنی حدود و قیود ان کا راستہ نہیں روکتیں اور نہ ان میں تھکن کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ صبح کے وقت پارے کی طرح متحرک رہنے والا ستارہ طلوع ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے آسمان کی چھت سے حضرت جبرئیلؑ کی پیشانی دکھائی دے رہی ہے ۔ اس کے علاوہ شام کے وقت صحرا کی خاموشی میں سورج کے چھپنے کا منظر بھی بڑا دلکش ہوتا ہے ۔ یہی منظر تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ کی تمام دنیا کا مشاہدہ کرنے والی آنکھ کو مزید روشن کر دیا تھا ۔ اس شعر میں سورۃ انعام میں بیان کئے گئے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کائنات کا مشاہدہ کرتے کرتے بالآخر سورج کے غروب ہونے سے اللہ کے قائل ہوتے تھے اور ربانی تمام معبودوں کو رد کر دیا تھا ۔ اس لیے کہ وہ سب کسی نہ کسی سطح پر فانی قرار پاتے ہیں ۔

حضرت خضرؑ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ صحرا میں پانی کے چشمے کے گرد ٹھہرنے والے قافلے کا ہجوم دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ ایمان رکھنے والے نیک اور برگزیدہ لوگ جنت میں نہر کے گرد کھڑے اپنی اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اے اقبال جو شخص محبت کے باعث دیوانہ ہو چکا ہو، اُسے ہمیشہ نت نئے ویرانوں کی تلاش رہتی ہے جبکہ تیری حالت یہ ہے کہ تو آبادی میں رہ کر کھیتوں اور باغوں کا قیدی ہو گیا ہے اور تو یہ بات بھول چکا ہے کہ مسلسل گردش ہی کی وجہ سے زندگی کے پیالے میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور اے بے خبر اور غفلت برتنے والے انسان زندگی کی ہمیشگی کا راز بھی یہی ہے یعنی صرف صحرا نوردی اور مسلسل گردش نے میری زندگی کو مرورِ ایام کے اثرات سے آزاد کر دیا ہے۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال صحرائی زندگی کو پسند کرتے تھے۔ لالۂ صحرا اور بندۂ صحرا کی علامتیں علامہ اقبال کے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک صحرائی زندگی تصنع سے پاک اور انسان کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کا سبب بنتی ہیں۔ اُن کے نزدیک داعیٔ حق کی پرورش کوہستان اور صحرا ہی کرتے ہیں۔ دشتِ حجاز اس کی واضح مثال ہے۔ اقبال کی صحرا پسندی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ ایک دشت ہی میں پیدا ہوئے تھے اور اسلام کا پودا اسی آب و ہوا میں پروان چڑھا۔

۵ برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ــ ــ ــ

وضاحت علامہ اقبال نے ایک سوال زندگی کے بارے میں بھی اٹھایا تھا۔ حضرت خضرؑ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی نفع و نقصان کے تفکرات سے بہت بلند ہے۔ یعنی اگر ہم ہر وقت نفع و نقصان کے پیشِ نظر زندگی کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم زندگی کی حقیقت کو سمجھ ہی نہیں پائے اس لیے کہ کبھی جان کی حفاظت کرنے اور زندہ رہنے کا نام زندگی ہے تو کبھی خدا کی اطاعت و فرمانبرداری میں جان قربان کر دینے کا نام بھی زندگی ہے۔ یعنی جو لوگ زندہ ہیں وہ تو زندہ ہیں ہی لیکن جو لوگ کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جان قربان کر دیتے ہیں وہ بھی زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں اور ابدی زندگی پا لیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ تم زندگی کو آج اور کل کے پیمانے سے ناپنے کی کوشش نہ کرو بلکہ زندگی تو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ہمیشہ سفر کرنے والی ہے اور ہر لمحہ جوان رہنے والی ہے۔ یعنی اس کے تقاضے کبھی ختم نہیں ہوتے جیسا کہ خود اقبال ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

اگر تو زندہ ہے تو دوسروں کی پیدا کردہ دنیا پر قناعت کرنے کی بجائے اپنی دنیا خود پیدا کر۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ آدم کی تخلیق کا راز بھی زندگی ہی ہے اور اِس کائنات کا ضمیر اور حقیقت بھی زندگی ہی ہے یعنی خواہ انسان ہو خواہ کائنات کے دیگر مظاہر، سب زندگی ہی کے کرشمے ہیں۔ اگر تم زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے ہو تو اس کی حقیقت کے بارے میں پہاڑ کاٹنے والے فرہاد سے سوال کرو یعنی اس کی زندگی پر غور کر لو۔ اِس سے تمھیں پتہ چل جائے گا کہ زندگی عیش و عشرت کا نام نہیں ہے بلکہ محنت و مشقت کا نام ہے اور زندگی بھاری پتھروں کو کدال سے کاٹ کر دودھ کی نہر جاری کرنے کا نام ہے۔ اگر انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہو تو اُس کی زندگی اپنی وسعتوں کو سمیٹ کر ایک بہت کم پانی والی ندی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اگر انسان آزاد ہو تو یہی زندگی بے کنار سمندر بن جاتی ہے۔ اگرچہ زندگی مٹی سے بنے ہوئے جسم میں قید ہے لیکن اِس طرح زندگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ زندگی اپنا اظہار اپنی تسخیر کی قوت سے کرتی ہے۔ اے انسان تو زندگی کے سمندر سے ایک بلبلے کی مانند سامنے آیا ہے اور اِس دنیا میں زندگی تیرے لیے ایک امتحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تو زندگی کے اِس امتحان میں ناکام ہے تو تیری حیثیت مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں لیکن اگر تو کامیاب ہو گیا تو پھر تو ایک بے پناہ تلوار کی حیثیت اختیار کرے گا۔ اور ہر چیز تیرے تابع فرماں ہو جائے گی یعنی تیری قوتِ تسخیر صحیح معنوں میں بروئے کار آسکے گی۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ ۔ ۔ ۔

وضاحت

جس شخص کے دل میں سچائی اور صداقت کے لیے مرنے کا جذبہ ہو اُسے چاہیئے کہ پہلے اپنے خاکی جسم میں جان پیدا کرے اور اِس کا طریقہ یہ ہے کہ اِس کے اردگرد وہ تمام اشیاء جو اسے بے محنت حاصل ہو گئی ہیں، انھیں جلا دے اور ان کی راکھ سے خود محنت کر کے اپنی دنیا پیدا کرے اور در اصل سچائی اور صداقت کے لیے یہی دنیا قربان کرنے میں اُسے لطف حاصل ہوگا۔ اس کے بعد سچائی کے لیے قربان ہونے کا جذبہ رکھنے والا شخص زندگی کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی طاقت کو ظاہر کر دے۔ یعنی اِس طاقت سے اکنافِ عالم کو تسخیر کرے ایسا کرنے سے زندگی کی یہ بظاہر معمولی سے چنگاری ایسی ترقی پائے گی جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور جسے کبھی زوال نہیں آتا۔ یہ شخص مشرق کی سرزمین پر سورج بن کر چمک جاتے اور اپنے اردگرد کی دنیا

کو بھی روشن کر دے تاکہ بدخشاں یعنی سرزمین مشرق سے پھر بہت قیمتی لعل یعنی عظیم شخصیات پیدا ہونے لگیں۔ اس شخص کو چاہیئے کہ رات کے وقت جب ساری دنیا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہو، آرام کرنے کی بجائے گریہ و زاری کرے اور اسے آسمان کی طرف اپنا پیغامبر بنا کر بھیجے تاکہ آسمان پر چمکنے والے ستاروں میں اس کے ہمراز پیدا ہو سکیں۔

جنابِ خضر کہتے ہیں کہ یہ وقت قیامت کی مثال ہے اور تو اس وقت میدانِ حشر میں کھڑا ہے۔ قیامت میں اس شخص کی بخشش کی توقع کی جا سکتی ہے جو اچھا اعمال نامہ پیش کر سکے۔ لہٰذا اے غفلت برتنے والے انسان اگر تیرے اعمال نامے میں کوئی عمل ہے تو اب اُسے سامنے لا۔ یعنی صرف ترقی کی خواہش کرنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ انسان کی زندگی اُس کے عمل کی مرہونِ منت ہے اقبال یہی بات ایک اور جگہ بھی ذرا مختلف انداز میں کہتے ہیں۔

ع — عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ع — آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوکَ ۔ ۔ ۔

وضاحت

حضرت علامہ نے ایک سوال سلطنت کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔ جنابِ خضرؑ نظم کے چھٹے بند میں سلطنت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آؤ میں تمہیں قرآن شریف کی سورۃ النمل کی آیت اِنَّ الْمُلُوکَ اِذَا دَخَلُوا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا ۔ ۔ ۔ کی معنویت بتاتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سلطنت صرف اور صرف طاقت ور قوموں کی طرف سے کمزوروں پر حکومت کرنے اور ان کا استحصال کرنے کا ایک جادو ہے۔ یعنی جو قوم طاقتور ہو گی وہ کمزور قوم کو مغلوب کر کے اُس پر اپنی حکومت قائم کرے گی اور پھر سلطنت و مملکت کے نام پر اس کا استحصال کرتی رہے گی۔ واضح رہے کہ بعض مفسرین قرآن شریف کی اس آیت کو صرف ملکہ سبا کا بیان تصور کرتے ہیں جسے قرآن شریف نے نقل کر دیا۔ لیکن اقبال کی رائے اِس سے مختلف ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ قرآن شریف نے ملکہ سبا کے قول کی پیش کش سے دراصل بادشاہت و ملوکیت کے خلاف اپنا فیصلہ دیا ہے۔ بہرحال صورت جو بھی ہو اقبال کہتے ہیں کہ اگر اِس دوران میں محکوم اور غلام لوگ خواب سے بیدار ہو جائیں اور انھیں اپنے حقوق کا احساس ہو جائے تو حکمران اپنے جادوئی طریقوں سے انھیں پھر سُلا دیتے ہیں اور اس طرح اپنا جابرانہ نظام مسلط رکھتے ہیں۔ اقبال نے ایک اور جگہ

بھی حکومت و مملکت کو جادو سے تعبیر کیا ہے اور پُر لطف بات یہ ہے کہ وہاں بھی حوالہ خضر ہی کا ہے

؎ کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا بہ اندازِ محرمانہ !!
سکندری ہو قلندری ہو، یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

جناب خضر کہتے ہیں کہ حکمران غلاموں پر جو جادو پھونکتے ہیں اُس کے زیر اثر ایاز یعنی غلاموں کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ غلامی کے طوق کو بھی اپنی محبوبیت کی دلیل تصور کرنے لگتے ہیں اور اپنی اس حالت پر فخر کرتے ہیں لیکن آخر کب تک؟ ایک وقت آتا ہے جو بنی اسرائیل یعنی غلاموں پر حقیقت حال کھل جاتی ہے۔ اُن کی غیرت و حمیت جاگتی ہے اور جس طرح موسیٰؑ نے جادوگر کا جادو توڑ کر اپنی قوم کو اُس کے حقیقی حقوق و فرائض سے باخبر کیا تھا، اُسی طرح کوئی غلام اٹھ کر حکمرانوں کو ختم کر دیتا ہے اور محکوم لوگ آزاد ہو جاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ دراصل یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ انسان خود کو حقیقی حکمران تصور کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں سروری اور بادشاہت تو صرف اسی ایک بے مثال اور یکتا ہستی یعنی خدا کے لیے مناسب و موزوں ہے۔ صرف خدا ہی حقیقی حکمران ہے، باقی سب آزر کے بناتے ہوئے بت ہیں۔ جن کا مقدر ٹوٹنا اور تباہ ہونا ہے۔ لہٰذا تجھے چاہیے کہ اپنی آزاد فطرت و طبیعت کو غلامی سے رسوا و بدنام نہ کر۔ اگر تو اللہ کے سوا کسی کو اپنا حکمران بنائے گا تو پھر تو یقیناً کسی برہمن سے بھی بڑا کافر ہے۔

جناب خضر کہتے ہیں کہ مغرب کا نیا نظام حکومت جسے اہل مغرب عوامی اور جمہوری قرار دیتے ہیں دراصل وہی پرانا ساز ہے جس کے پردوں میں بادشاہت اور قیصریت کے نغمے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جمہوریت کے لباس میں بھی ظلم و جور کا دیو ناچ رہا ہے اور تو اپنی سادگی سے اِس دیو کو شخصی و انفرادی آزادی کا پیغام لانے والی حسین نیلم پری تصور کرتا ہے۔ موجودہ جمہوری نظام میں لوگوں کی زندگی کو منظم کرنے، فلاح و بہبود کے کام انجام دینے اور لوگوں کو رعایتیں اور حقوق عطا کرنے کے لئے جو ادارے تخلیق کئے گئے ہیں وہ مغرب کی طب کی ایسی دوا کی حیثیت رکھتے ہیں جو بظاہر بہت میٹھی اور شیریں ہے لیکن جس کا اثر یہ ہے کہ یہ لوگوں کو سُلا کر اپنے حقوق سے غافل کر دیتی ہے۔ ان اداروں کے ارکان یعنی اسمبلیوں کے ممبران کی تقاریر اور ان تقریروں کا جوش و خروش دیکھیئے تو یوں لگتا ہے، جیسے انسانوں کے تمام مسائل پلک جھپکنے میں حل ہو جائیں گے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ بھی سرمایہ داروں کی طرف سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے طریقے ہیں۔ یعنی ان کا مدعا و مقصد عوام کی فلاح نہیں بلکہ ذاتی فائدہ ہے۔ بدقسمتی سے تو نے

رنگ و بُو کے اِس سراب کو گلستان سمجھ لیا ہے اور موجودہ عہد کے حکمرانوں نے تمہارے لئے جو جال اور پنجرا تیار کیا ہے تُو اُسے اپنے لئے گھونسلا سمجھ بیٹھا ہے۔

ان اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبال کی رائے کیا تھی۔ اقبال نے جمہوریت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر ایک فارسی شعر میں بہت خوبصورتی سے نظم کیا ہے، وہ کہتے ہیں ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

؎ بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے ۔۔۔

وضاحت خضرؑ سرمایہ و محنت سے متعلق کئے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو مزدوروں کو جا کر میرا یہ پیغام سُنا دے اور یہ پیغام صرف میرا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو ساری کائنات کا پیغام ہے یعنی اگر حق و صداقت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کائنات کی ایک ایک چیز یہی پیغام دیتی نظر آتی ہے کہ اے مزدور تیری محنت کا پھل بہانے تراشنے والے سرمایہ دار کھا جاتے ہیں اور تجھے تیری محنت کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا۔ تیرا معاوضہ ہمیشہ شاخِ آہو پر رہتا ہے واضح ہو کہ ہرن کا سینگ ایسی شاخ تصور کی جاتی ہے جو نہ پھلتی ہے اور نہ پھولتی ہے اور نہ کوئی اِس سے کسی طرح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ سے دولت پیدا کرنے والے ہاتھوں یعنی مزدور کو اس کا معاوضہ اِس طرح دیا جاتا ہے جیسے امیر لوگ غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یعنی مزدور کو اُس کی مزدوری اس کا حق سمجھ کر ادا نہیں کی جاتی بلکہ اس طرح دی جاتی ہے جیسے اُس پر احسان کیا جا رہا ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ سرمایہ دار حسن بن صباح کی طرح ہیں۔ حسن بن صباح لوگوں کو بھنگ پلاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ انہیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہے۔ سرمایہ دار بھی مزدوروں کو اُن کے حقوق سے غافل کرنے کے لیے بھنگ کی پتیاں دیتا ہے اور بیچارہ مزدور اپنی عاقبت نا اندیشی سے اِسے مصری کی ڈلی سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ یعنی مزدور کو منافع میں حصہ دار بنانے کی بجائے محض تنخواہ میں اضافے اور الاؤنس وغیرہ دے کر خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکمرانوں کی فطرت نے نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب اور رنگ کے ایسے نشے ایجاد کر رکھے ہیں اور عام آدمی اسی کی وجہ سے خود کو سرمست و سرشار سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ سب چیزیں بھی محض سرمایہ دار کے استحصالی نظام کے ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن عام لوگ انہی کو خدا اور دیوتا سمجھ کر ان پر قربان ہو

جلتے ہیں اور یوں نشے کی لذت میں اپنی زندگی کے اثاثے تک سے محروم ہو جاتا ہے ۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فریب اور مکاری کی وجہ سے سرمایہ دار کامیاب رہا اور مزدور اپنی نادانی اور سادگی کی وجہ سے سرمایہ دار سے شکست کھا گیا ۔

لیکن اے مزدور یہ نظام اب زیادہ عرصے تک نہیں چلنا چاہیئے ۔ اب تجھے اپنے حقوق کے حصول کے لئے تگ و دو کرنی چاہیئے ۔ اب زمانے کا انداز بدل گیا ہے اور ساری دنیا میں تیرے دور کی ابتدا ہو رہی ہے ۔ یعنی اب ایسا زمانہ آگیا ہے جس میں سرمایہ دار مزدوروں کے حقوق غصب نہیں کر سکیں گے ۔

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول ۔۔۔

وضاحت اے مزدور تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر ہمت و جرات بلند ہو تو انسان سمندروں اور دریاؤں پر بھی قناعت نہیں کرتا اور نہ انہیں لینے کے لیے قبول کرتا ہے ۔ جب کہ مراعات اور الاؤنسوں کی شکل میں تیرے دامن میں شبنم جیسی بے مایہ چیز ڈالی جا رہی ہے ۔ آخر تو اس پر کب تک قناعت کرے گا ۔ تو غور کرے گا تو معلوم ہوگا کہ عیش و عشرت کا سامان عوام کی بیداری کے نغمے میں ہے ۔ آخر سکندر و جمشید جیسے عظیم بادشاہوں کے سُلا دینے والے قصے کب تک سنو گے ، دیکھو زمین کے پیٹ سے ایک نیا سورج پیدا ہو چکا ہے ۔ آخر تم ان ستاروں کا ماتم کب تک کرو گے جو ڈوب چکے ہیں ۔ انسان کی فطرت نے تمام زنجیروں اور پابندیوں کو توڑ دیا ہے اور کیوں نہ توڑتی ؟ بیشک انسان کے لئے جنت سے نکلنا ایک بہت بڑا سانحہ تھا لیکن انسانی آنکھ آخر کب تک جنت سے نکالے جانے کے غم میں رویا کرتی ؟ پھولوں کا علاج کرنے والے مالی سے بہار یہ کہہ رہی ہے کہ پھولوں کے سینوں پر جو زخم لگے ہیں تم کب تک اُن پر مرہم لگاؤ گے ، یعنی جس طرح پھولوں کا کھلنا ایک فطری امر ہے اور تم اس میں کسی بھی طرح رکاوٹ نہیں ڈال سکتے اسی طرح مزدوروں کا بیدار ہونا اور اپنے حقوق حاصل کرنا بھی ایک فطری امر ہے ۔

حضرت خضرؑ مزدوروں کو نادان پتنگوں سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہیں شمع کے گرد چکر لگانے سے باز آنا چاہیئے اور اب اپنی فطرت کے جلوؤں کی طرف توجہ کرنا چاہیئے ۔ دوسروں کی عظمت کے گن گاتے اور اُن کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی عظمت کا احساس کرنا چاہیئے ۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں ۔۔۔

وضاحت علامہ اقبال نے خضرؑ سے آخری سوال عالم اسلام کے بارے میں کیا تھا ۔ حضرت خضرؑ

اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم مجھے ترکوں اور عربوں یعنی عالم اسلام کا کیا حال سناتے ہو؟ مجھ سے مسلمانوں کی کیفیت پوشیدہ نہیں ہے اور میں اُن کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں میں جانتا ہوں کہ حضرتِ ابراہیمؑ کا ترکہ اور ورثہ مسلمانوں کی بجائے عیسائیوں نے حاصل کر لیا ہے اور حجاز کی مٹی کلیسا یعنی عیسائیت کی بنیاد تعمیر کرنے والی اینٹ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ یعنی عیسائیوں نے اپنی سیاست کی وجہ سے اپنے مفادات عربوں کے ذریعے حاصل کئے جس کی بناء پر ترکوں کی سُرخ ٹوپی دنیا بھر میں بدنام ہو گئی اور وہ ترک جو ایک زمانے میں دنیا میں صاحبِ عزت تصور کئے جاتے تھے آج دنیا بھر کے سامنے عاجزی پر مجبور ہو کر ذلیل وخوار ہو گئے ہیں۔ اہل ایران یورپ کے شراب بیچنے والوں سے وہ تند و تیز شراب لے رہے ہیں جو صراحی کو پگھلا دینے والی ہے یعنی ایران تہذیب و تمدن کے معاملے میں اہل یورپ کی نقالی کر کے اپنے تشخص سے محرومی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اہل مغرب کی دانائی اور سیاست کی وجہ سے عالم اسلام اس طرح پارہ پارہ ہو چکا ہے جیسے قینچی سونے کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح سستا سمجھ کر بہایا جا رہا ہے اور اے اقبال تو اِس کیفیت پر بے چین و مضطرب ہے۔ تیری بے چینی کا سبب یہ ہے کہ تو اصل حقیقت سے واقف نہیں ہے۔

مولانا جلال الدین رومی کہہ گئے ہیں کہ اگر کسی پرانی عمارت کو نئے سرے سے بنانا اور تعمیر کرنا مقصود ہو تو کیا تو نہیں جانتا کہ پہلے پرانی عمارت کی بنیاد اکھاڑتے ہیں۔ یعنی تخریب کا عمل دراصل تعمیر کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یعنی مسلمانوں میں جو تخریب نظر آ رہی ہے اِس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ تو نئی تعمیر کا آغاز ہے۔

ع ملک ہاتھوں سے گیا ملّت کی آنکھیں کھل گئیں ۔۔۔

وضاحت بیشک ملک اور سلطنت چھن گئی لیکن اِس نقصان کے ساتھ فائدہ یہ ہوا کہ ملت اسلامیہ کی آنکھیں کھل گئیں اور اب انھیں اپنے سود و زیاں کا احساس ہونے لگا ہے۔ خدا نے تجھے آنکھیں اور بصیرت عطا کی ہے اے غفلت برتنے والے تجھے خوب غور کر کے ان حالات کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ ہڈیاں جوڑنے والی دوا کی بھیک مانگنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان ٹوٹ پھوٹ جائے اور شکست قبول کرے۔ بیشک تو ایک حقیر چیونٹی ہے اِس کے باوجود تجھے حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم بادشاہ کے سامنے اپنی حاجت اور ضرورت بیان نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی بدترین حالات میں بھی انسان کو دوسروں سے مدد حاصل کرنے کے لئے دستِ سوال دراز نہیں کرنا چاہیئے۔

حضرت خضر کہتے ہیں کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ پورے مشرق کی نجات اِس بات میں مضمر ہے کہ ملّت اسلامیہ متحد رہے ۔ لیکن بدقسمتی سے ایشیا کے باشندے ابھی تک اِس اہم بات سے واقف نہیں ہیں کہ عالمِ اسلام ہی ان کی حفاظت کا مشکل فرض انجام دے سکتا ہے ۔ اگر ملّتِ اسلامیہ ترقی کرنا چاہتی ہے تو اس کا راستہ یہ ہے کہ وہ کاروبارِ دنیا ترک کر کے ایک دفعہ پھر اپنے دین اور اِس کے اصولوں کی طرف رجوع کرے ۔ اِس لئے کہ ملک اور سلطنتیں سب کی سب صرف اور صرف حرم یعنی دین کی حفاظت کا ایک معمولی سا پھل ہیں ۔ یعنی اگر تم دینِ اسلام کے اصولوں پر گامزن ہو جاؤ گے تو مملکتیں اور سلطنتیں خود بخود تمہیں حاصل ہو جائیں گی ۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کو دریائے نیل یعنی افریقہ کی سرزمین سے لے کر ترکستان کے شہر کاشغر تک حرم اور اسلام کی حفاظت کے لیے متحد ہو جانا چاہئیے ۔ ملّتِ اسلامیہ میں خواہ شاہی خیموں میں رہنے والے ترک ہوں اور خواہ اعلیٰ و ارفع خاندان سے تعلق رکھنے والے عرب ہوں ، کوئی بھی رنگ اور نسل کے امتیازات کو لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا ، ختم ہو جائے گا ۔ یعنی رنگ و نسل کے امتیازات کی بجائے صرف اور صرف دین اسلام پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں یورپ اور دنیا کے دیگر مذاہب و اقوام کی طرح افراد کو نسل کی بناء پر تسلیم کیا جانے لگا تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ اسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی جس طرح راستے میں پڑا ہوا غبار اُڑ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے ۔ تمہیں چاہئیے کہ تم پھر سے اپنے آباء و اجداد اور بزرگوں جیسا دل و جگر پیدا کرو ، تاکہ دنیا میں پھر سے خلافت کا نظام قائم و استوار کیا جا سکے ۔ گویا بزرگوں جیسے حوصلے ، قوتِ برداشت اور وسیع المشربی کے بغیر یہ اہم کام انجام نہیں دیا جا سکتا ۔

اے پوشیدہ اور ظاہر باتوں میں امتیاز نہ کرنے والے تجھے ہوشیار ہونا چاہئیے اور اے ابوبکرؓ اور علیؓ کی بڑائی ثابت کرنے کے چکروں میں گرفتار رہنے والے تجھے ہوش و خرد کا دامن تھامنا چاہئیے ۔ اِس شعر میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کی فرقہ بندی کو ہدف تنقید بنایا ہے ۔ یعنی ہم امتِ مسلمہ کو پیش آمدہ مسائل کے حل ڈھونڈنے کی بجائے معمولی معمولی فرقہ وارانہ مباحث میں اُلجھ کر اپنا وقت اور اپنی توانائیاں ضائع کرتے رہتے ہیں ۔

۵ عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی ـــ ـــ

وضاحت

جنابِ خضرؑ کہتے ہیں کہ عشق کا فرض یہ تھا کہ وہ آنے والے مصائب پر بارگاہِ خداوندی میں نالہ و فریاد کرتا سو وہ کر چکا ۔ اب ہمیں اس فریاد کا اثر دیکھنا

چاہیئے۔ تو نے اب تک دریا اور اس کی رفتار کی عظمت اور عروج دیکھا ہے۔ لیکن اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود دریا کی بے قرار موجیں اس دریا کے لئے کس طرح زنجیر بنتی اور اسے ختم کرتی ہیں۔ تہذیبِ مغرب کے بارے میں یہی بات علامہ اقبال نے جا بجا کہی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؂

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا حال ؂
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

اسلام نے روئے زمین کے تمام انسانوں کی آزادی کا جو خواب دیکھا تھا اب اس کے پورا ہونے اور اس کی تعبیر سامنے آنے کا وقت آگیا ہے۔ سمندر کو دیکھئے کہ یہ کیڑا آگ میں پیدا ہوتا ہے جلتا ہے اور پھر اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے۔ یعنی اس کا آگ میں جل مرنا اس کی نئی زندگی کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی مثال بھی یہی ہے۔ دیکھئے کہ بوڑھا جہاں مرنے کے بعد پھر پیدا ہو رہا ہے یعنی عالمِ اسلام تباہی و بربادی کی آخری حدوں کو چھو کر پھر ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔ ذرا غور سے میری گفتگو میں آنے والے زمانے کی تصویر دیکھو۔ گو ابھی یہ تصویر دھندلی ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ خود کو متشکل کرے گی۔ آسمان کے پاس ایک آزمایا ہوا فتنہ ابھی موجود ہے اور وہ فتنہ تقدیر ہے اور تقدیر وہ چیز ہے جس کے سامنے تدبیر کے سارے حربے ناکام ہو جاتے ہیں۔

تو مسلمان ہے لہٰذا تجھے چاہیئے کہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی بجائے اپنے دل کو آرزو اور اُمید سے آباد رکھ اور ہر وقت اپنے سامنے یہ بات رکھ کر اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں علامہ اقبال نے سورۃ آلِ عمران کی ایک آیت کے ٹکڑے کو تضمین کیا ہے۔

طلوعِ اسلام

(۲۶۷)

تعارف | طلوعِ اسلام بانگِ درا کی آخری نظم ہے۔ اِس نظم میں شکوہ، جوابِ شکوہ،

شمع اور شاعر اور خضرِ راہ کے مایوسانہ لہجے کی بجائے رجائیت کا پہلو غالب ہے اور اِس نظم کا انداز شمع و شاعر اور خضرِ راہ کے آخری بندوں جیسا ہو گیا ہے۔ طلوعِ اسلام میں مسلمانوں کے طویل خوابِ غفلت کے مقابلے میں بیداری کا پیغام ہے۔ اِس نظم کے پس منظر میں جنگ سقاریہ، سمرنا میں ترکوں کی عظیم الشان فتوحات اور ہندی مسلمانوں کی بیداری خاص طور پر کارفرما ہے۔

ترکیب بند ہیئت کے نو بندوں پر مشتمل یہ نظم اپریل ۱۹۲۳ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ دوسری نظموں کے برعکس اِسے بلا ترمیم و اضافہ بانگِ درا میں شامل کر لیا گیا۔

حلِ لغات

تنک تابی: کم روشنی ؛ **عروق**: رگیں، نہریں ؛ **سینا**: مشہور فلسفی اور طبیب حکیم ابو علی بن سینا جو طب، ریاضی، منطق اور فلسفے میں بے مثال شخصیت تھی۔ ۹۸۰ء میں بخارا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ اشارات، شفا اور قانون اس کی مشہور تصانیف ہیں ؛ **فارابی**: محمد بن طرخان ابو نصر فارابی ۸۷۰ء میں بمقام فاراب پیدا ہوئے اور ۹۵۰ء میں دمشق میں وفات پائی۔ انھوں نے بیشمار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، اس لیے انھیں ارسطو کے مقابلے میں معلم ثانی کہا جاتا ہے۔ **درگاہ**: آستانہ، چوکھٹ ؛ **شکوہ**: شان و شوکت ؛ **نطق**: کلام، گفتگو، شعر و شاعری ؛ **برگستواں**: گھوڑے کی زین، ظاہری آرائش و زیبائش ؛ **سرشک**: آنسو ؛ **نیساں**: موسمِ بہار کا موسم ؛ **برگ و بر**: پتے اور پھل پھول ؛ **جہانبانی**: حکومت کرنے کا طریقہ ؛ **جہاں بینی**: معاملاتِ دنیا کو دیکھنا اور سمجھنا ؛ **دیدہ ور**: آنکھ والا، دیکھنے والا ؛ **حدیث**: بات ؛ **خدائے لم یزل**: وہ خدا جسے کبھی زوال نہ آئے ؛ **پرے**: دور، دوسری طرف، آگے ؛ **فانی**: فنا ہونے والا ؛ **آنی**: لمحاتی، ختم ہو جانے والا ؛ **عروس**: دلہن ؛ **مضمر**: پوشیدہ، چھپا ہوا ؛ **گِل**: مٹی ؛ **رمز**: بھید، پتے کی بات ؛ **تورانی**: توران میں رہنے والے لوگ ؛ **قیصر**: ایران کے بادشاہوں کا خطاب ؛ **کسریٰ**: روم کے بادشاہ ؛ **استبداد**: ظلم و ستم ؛ **جادہ پیما**: راستے پر چلنے والا ؛ **زندانی**: قیدی ؛ **المانی**: جرمن قوم کے افراد ؛ **انگارۂ خاکی**: خاک سے بنا ہوا ہیولا، انسان ؛ **روح الامین**: حضرت جبریل ؛ **تفسیر**: وضاحت، تشریح ؛ **بندہ**: غلام ؛ **چیرہ دستاں**: ظلم کرنے والے ؛ **اکسیر گر**: سونا بنا لینے والے، فاتح ؛ **پیرِ حرم**: کعبے کا بزرگ، شریف حسین والیِ مکہ کی طرف اشارہ ہے ؛ **کن فکاں**: کائنات، دنیا ؛ **پرفشاں**: پر جھاڑنے والا ؛ **جاوداں**: ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ؛ **مصاف**: میدانِ جنگ ؛ **حریر و پرنیاں**: انتہائی نرم ریشمی کپڑوں

کا نام ؛ صیدِ زبوں : انتہائی حقیر اور ناقابلِ توجہ شکار ؛ شہر یاری : بادشاہت و ملوکیت ؛ خیرہ : تاریک، چندھیا دینا ؛ صناعی : کاریگری ؛ حکمت : دانائی ؛ تدبیر : سوچنے اور تدبیر کرنے کا عمل ؛ محکم : پختہ ؛ خروش آموز : جوش سکھانے والا ؛ جولانگہ : گھوڑے دوڑانے کا میدان ، میدانِ جنگ ؛ تتاری : ترک ؛

۵ دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی ـ ـ ـ

وضاحت ستاروں کی ماند پڑتی ہوئی روشنی اِس بات کی دلیل ہے کہ اب صبح ہونے والی ہے ۔ ابھی تھوڑی دیر بعد افق سے سورج طلوع ہوگا اور بہت گہری نیند سونے کا زمانہ رخصت ہو جائے گا ۔ مشرق کی مردہ شریانوں میں پھر سے زندگی کا گرم خون دوڑنے لگا ہے اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے حکیم بوعلی سینا اور فارابی جیسے فلسفی بھی سمجھنے سے قاصر ہیں ۔ مغرب کی طرف سے تہذیب و تمدن اور فتوحات کے امڈتے اور بڑھتے ہوئے سیلاب نے اسلام سے روگردانی کرنے والے مسلمانوں کو نئے سرے سے اسلام کی طرف رجوع ہونے پر مجبور کر دیا ہے ۔ دراصل دریا کے تموج اور لہروں کے تند و تیز تھپیڑے گوہر کو سیراب کرتے اور ایک معمولی قطرۂ آب کو نہایت قیمتی موتی بنا دیتے ہیں ۔ یعنی پے در پے شکستوں نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے آستانے سے ایک بار پھر صاحبِ ایمان لوگوں کو ترکوں جیسی شان و شوکت ، ہندوستانی لوگوں جیسا سوچ بچار اور غور و فکر کرنے والا ذہن اور عربوں جیسی گفتگو ، شاعری اور فصاحت و بلاغت ملنے والی ہے ۔

اے بلبل اگر اِس کے باوجود غنچوں یعنی مسلمانوں میں نیند اور غفلت کا کچھ اثر باقی ہے تو جس قدر سننے والوں میں نغمے کا ذوق کم ہے تو اسی تناسب سے اپنے نغمے کی آواز اور تلخی میں اضافہ کر دے ۔ تجھے چاہیئے کہ خاموش اور بے عمل بیٹھے رہنے کی بجائے صحنِ چمن ، گھونسلے اور درختوں کی شاخوں میں یعنی جہاں کہیں بھی تو ہے ، وہیں تڑپتی رہے ۔ اِس لئے کہ پارے سے اُس کی تقدیر اور خصوصیت چھینی نہیں جا سکتی ۔ آخر اچھی اور پاک چیزوں کو دیکھنے والی آنکھ گھوڑے کی زین کی زیبائش یعنی عارضی اور ظاہری آرائش کو کیوں دیکھے ، خاص طور پر اُس وقت جب اُسے فتح مند مسلمانوں کی بہادری اور دلیری بھی نظر آ رہی ہو ۔

اے بلبل تجھے چاہیئے کہ تو لالے یعنی مسلمانوں کے دلوں میں آرزوؤں اور امیدوں کے چراغ روشن کر دے اور ملتِ اسلامیہ کے ایک ایک فرد کو تلاش و جستجو کا شیدائی اور عاشق بنا دے ۔

۵ سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت مسلمانوں کی آنکھوں میں موجود آنسوؤں میں موسمِ بہار کے بادلوں کا اثر آگیا ہے جس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اب عالمِ اسلام میں ایک بار پھر بہت سے قیمتی موتی پیدا ہوں گے۔ یعنی ایسے افراد جنم لیں گے جو تاریخ کے صفحات پر اپنے انمٹ نقوش مرتب کریں گے۔ ملّتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو کر بکھر چکی تھی لیکن یہ اب پھر متحد ہو رہی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے شاخِ ہاشمی یعنی ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر پتوں اور پھول و پھل سے آراستہ ہوگی یعنی مسلمانوں کی ترقی کا زمانہ آگیا ہے۔ ترکِ شیرازی یعنی مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھیوں نے ایران و افغانستان کے لوگوں کے دل جیت لئے یعنی یہ لوگ ملّتِ اسلامیہ کے ہیرو بن گئے اور آخر کیوں نہ ہو صبا ہمیشہ پھولوں کی خوشبو سے اپنا ہمسفر پیدا کر لیتی ہے۔ اگر اِس ساری جدوجہد میں عثمانیوں یعنی ترکوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تو کیا ہوا، کیا یہ بات معلوم نہیں کہ سینکڑوں ہزاروں ستارے فنا ہوتے ہیں تو ایک صبح پیدا ہوتی ہے۔ بیشک غائر نظر سے حالات و معاملات کا مشاہدہ کرنا اور حقیقتِ حال تک پہنچنا دنیا پر حکومت کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ انسان کا جگر خون بن کر بہہ جائے یعنی انسان بہت زیادہ محنت کرے تو دل کی آنکھ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ نرگس کو دیکھئے آنکھ رکھنے کے باوجود اسے ہزاروں سال تک اپنے اندھے پن کا ماتم کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر اس کی آنکھ دیکھنے کی صلاحیت حاصل کرتی ہے۔ اے بلبل تجھے نغمے گانے چاہئیں تاکہ تیرے ترنم اور نغموں سے کبوتروں میں بھی شاہین جیسا جگر پیدا ہو جائے یعنی بیشک مال و اسباب اور سازوسامان کے اعتبار سے مسلمانوں کی حالت کبوتروں جیسی ہے اور وہ حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے لیکن تیرے نغموں سے حاصل ہونے والے ولولے اور ہمت کے باعث یہی لوگ بہادر اور دلیر ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

اے بلبل ترے سینے میں زندگی کا حقیقی راز چھپا ہوا ہے۔ تُو اسے مزید چھپا کر نہ رکھ اور بیان کر دے۔ مسلمانوں کو زندگی کے حقیقی سوز اور تڑپ کی بات بتا دے۔

۵ خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تُو ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال اِس بند میں مسلمانوں کو اُن کا مقام اور اُن کی حیثیت یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مسلمان اِس دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور زبان کی حیثیت رکھتا ہے جسے کبھی زوال نہیں آ سکتا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ شکوک و شبہات اور

ظن و تخمین نے تجھ پر غلبہ پالیا ہے۔ تجھے چاہیئے کہ ان سے نجات حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اپنی حیثیت کے بارے میں یقین کی منزل پر پہنچے۔ گو مسلمان دوسرے لوگوں کی طرح اسی زمین پر بستے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقاصد کی بلندی کے اعتبار سے ان کی منزل نیلے آسمان سے بھی کہیں آگے ہے۔ اس دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت ایسے قافلے کی ہے جس کے لیے ستارے بھی محض راستے کے گرد و غبار سے زیادہ کچھ نہیں۔ بیشک یہ دنیا ختم ہو جانے والی ہے اور یہاں کے انسان اور دیگر چیزیں بھی باقی رہنے والی نہیں لیکن اے مسلمان ازل و ابد صرف تیرے لئے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تو خدا کے پیغام کو عام کرنے والا ہے اور چونکہ خدا اور اس کا پیغام دونوں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں لہٰذا اس حوالے سے تو بھی ازلی و ابدی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تیرا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا تھا جبکہ تجھے ساری دنیا کو تعمیر کرنا اور خدا کے حکم کے مطابق منظم کرنا ہے۔ زندگی کے تمام امکانات تیری ہی فطرت کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تو اس دنیا کے پوشیدہ امکانات کو دریافت کرنے کا امتحان دے رہا ہے۔ پانی اور مٹی سے بنی ہوتی اس دنیا سے جب نبوت ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے جہاں کی طرف تشریف لے گئی تو اپنے ساتھ تحفے کے طور پر تجھے ہی لے گئی تھی۔ ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایشیا کی سرزمین پر بسنے والی مختلف اقوام کی حفاظت کا کام ملتِ اسلامیہ ہی کو انجام دینا ہے۔

ایسے میں تجھے چاہیئے کہ تو ایک بار پھر صداقت و سچائی، عدل و انصاف اور شجاعت و بہادری کے بھولے ہوئے سبق پڑھے۔ اس لئے کہ مستقبل میں ساری دنیا کی رہنمائی کا کام تجھ ہی سے لیا جانا ہے۔

۵   یہی مقصودِ فطرت ہے۔ یہی رمزِ مسلمانی — — —

وضاحت

علامہ اقبال مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تجھے چاہیئے کہ تو بھائی چارے اور محبت کو ساری دنیا میں عام کر دے۔ اس لیے کہ فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے اور اسلام کی رمز بھی یہی ہے۔ یعنی اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں اخوت کے پیغام کو عام کیا جائے۔ اس سلسلے میں لوگوں نے رنگ و خون اور نسل و ذات کے جتنے بت تراش لیے، ہیں تو ان سب کو توڑ کر ملتِ واحدہ کے تصور کو عام کر دے۔ دنیا میں تیری شناخت مختلف علاقوں اور خطوں مثلاً توران، ایران اور افغانستان سے تعلق رکھنے والے کی بجائے صرف مسلمان کے طور پر

ہونی چاہیئے۔ تو درختوں کی شاخوں میں گلستان کے پرندوں کے ساتھ کب تک میٹھا رہے گا۔ اللہ تعالےٰ نے تیرے بازوؤں میں قہستاں میں رہنے والے شاہین کی قوت پیدا کی ہے ۔ یعنی تجھے کسی ایک خطے سے وابستہ ہوکر زندگی گذارنے کی بجائے اِس طرح کے تمام امتیازات سے آزاد ہوجانا چاہیئے، تقریباً یہی بات علامہ اقبال نے ایک اور جگہ بھی کہی ہے۔ شاہین کہتا ہے کہ

یہ پورب، یہ پچھم ، چکوروں کی دنیا
میرا نیلگوں آسماں بیکرانہ

وہم اور گماں سے بسائی گئی اِس تاریک دنیا میں مسلمانوں کا یقین اُس چراغ کی مانند ہے جسے کسی لق ودق صحرا کی اندھیری رات میں کسی تارک الدنیا درویش نے بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ دکھانے کے لیے روشن کر رکھا ہو۔ اے مسلمان کیا تو جانتا ہے کہ قیصر و کسریٰ یعنی ایران وروم کے مظالم کو کس نے ختم کیا تھا۔ اِن مظالم کو حضرت علی المرتضیٰ رض کی قوت، حضرت ابوذر غفاری رض کے فقر اور حضرت سلمان رض فارسی کے صدق و اخلاص نے مٹا دیا تھا۔ حضرت علی رض کی قوت ایسی تھی کہ کبھی ذاتی اغراض کے لیے متحرک نہ ہوئی۔ اور کفر و باطل کے مقابلے میں کبھی کشمش و پیچ کا شکار نہیں ہوئی۔ حضرت ابوذر غفاری رض کا فقر یہ تھا کہ اُن کے نزدیک مسلمانوں کے لیے مال و زر جمع کرنا بالکل حرام تھا اور دین کے معاملے میں حضرت سلمان فارسی رض کے صدق کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک زرتشی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ راہِ حق کی تلاش میں عیسائیت اختیار کی ۔ بے سروساماں ہونے کے باوجود ہزاروں میل کا سفر طے کرکے اور سینکڑوں مقامات پر ٹھوکریں کھانے کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور اسلام قبول کیا۔ گویا اقبال کہتے ہیں کہ بے لوث قوت، بے ریا فقر اور صدق و اخلاص ہی مسلمانوں کو جبر و استبداد ختم کرنے کے قابل بنا سکتے ہیں ۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ترکی، ایران اور افغانستان میں ملّت کی آزادی کے لیے لڑنے والے جس شان و شوکت سے اپنے سفر پر نکلے اس کو سینکڑوں سال کے اسیر و مقید بھی اپنے اپنے قید خانوں کے سوراخوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یعنی احرارِ ملّت کا ایک بہت بنیادی نوعیت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ مظلوم و مقہور لوگوں کو ظلم و قہر سے نجات دلائیں ۔ اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی پائیداری واستواری ساز و سامان کی بجائے صرف اور صرف پختہ ایمان کی وجہ سے ہے ۔ یہی دیکھ لیں کہ آزادی کی جنگ میں ہر طرح کے اسلحہ سے لیس جرمنوں کے مقابلے میں بے سروساماں ترک آخر کار کامیاب قرار پائے ۔

دراصل جب مٹی کا ہیولا یعنی انسان اپنے مقاصد کے بارے میں یقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس میں حضرتِ جبرئیل جیسی قوتِ پرواز پیدا ہو جاتی ہے۔

؎ غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — — —

وضاحت

علامہ اقبال یقین کے ضمن میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر انسان غلام ہو تو اُسے آزاد کرانے کے لیے نہ تلواریں کام آتی ہیں اور نہ سوچ بچار اور منصوبہ بندی سے آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر انسان غلامی کو ختم کرنے کے بارے میں یقین کی منزل تک پہنچ جائے تو پھر اُسے قید کرنے والی تمام زنجیریں کٹ جاتی ہیں اور یقین ہی کی بدولت منصوبہ بندی بھی ہو جاتی ہے اور دیگر ضروری وسائل بھی میسر آجاتے ہیں۔ جس شخص کو یقین کی دولت حاصل ہو گئی اُس کی قوتِ بازو کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ اُس کی تو صرف ایک نظر سے تقدیر تک بدل جاتی ہے۔ مردِ مومن کے زورِ بازو کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

اقبال کہتے ہیں کہ سلطنت وحکومت اور اشیاء کا علم یعنی سائنس جس کے ذریعے انسان نے تمام مادی ترقیاں حاصل کی ہیں، صرف ایمان کے ایک نکتے کی توضیح وتشریح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی اقبال کے نزدیک اگر کسی شخص کے ایمان میں پختگی پیدا ہو جائے تو سلطنت وحکومت اور سائنس کے علاوہ تمام ترقیات بھی از خود اس کی غلام ہو جاتی ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عام لوگوں میں حضرت ابراہیمؑ جیسی پر یقین نظر بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے یعنی حق وباطل میں امتیاز کرنے والی نگاہ پانا آسان نہیں ہوتا اور اِس منزل پر پہنچنے سے قبل ہی راہِ حق سے بھٹک جاتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اللہ نے تمام انسان برابر پیدا کئے لیکن ہم نے انسانوں کو مساوی درجہ دینے کی بجائے انھیں غلام اور مالک بنا دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ انسانوں میں یہ فرق پیدا کرنا انسانیت کے لئے تباہ کن ہے۔ اِس لئے ہمیں اِس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ورنہ فطری اصول کی خلاف ورزی کی وجہ سے خود فطرت اِس کی بڑی سخت سزا دے سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ غور کرنا چاہیئے کہ دنیا کی تمام اشیاء، خواہ وہ نور سے وجود میں آئی ہوں یا مٹی سے بنی ہوں حقیقت کے اعتبار سے ایک جیسی ہیں۔ مثلاً اگر آپ ایک ذرے کا دل چیریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اِس میں سے سورج کا خون ٹپک رہا ہے یعنی ایک ادنیٰ اور حقیر ذرہ بھی تقریباً وہی

خواص رکھتا ہے جو سورج سے منسوب ہیں، پُر لطف بات یہ ہے کہ ایٹم بم کے تجربات نے اِس بات کو ثابت کر دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں مردوں کے لئے پختہ یقین، مسلسل عمل اور ساری دنیا کو فتح کر لینے والی محبت تلوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنے ان سے انسان پوری دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے۔

ایک مرد کو دنیا میں اور کیا چیز درکار ہے۔ سوائے اِس کے کہ اُس کی طبیعت بلند ہو، مشرب و مسلک خالص ہو، دل گرم ہو، نگاہ پاکیزگی کو دیکھنے والی اور اس کی روح بے چین و مضطرب ہو۔

ع عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے ۔۔۔

وضاحت

اِس بند میں علامہ اقبال نے جنگ عظیم اوّل کے نتائج پر اِس طرح روشنی ڈالی ہے کہ محوری قوتوں کے تقابل کے ساتھ ساتھ اسلام کے برکات بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جو قوم اپنے دشمنوں پر عقاب کی طرح حملہ آور ہوئی تھی وہ شکست کھا گئی اور جنگ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ حد سے زیادہ ساز و سامان رکھنے کے باوجود ایک بے بال و پر اور بے بس پرندے سے زیادہ کچھ نہیں تھی جب کہ وہ قوم جس کے پاس ظاہری وسائل بالکل نہ تھے اپنی آزادی کی جنگ میں بالآخر کامیاب قرار پائی۔ پہلے مصرع میں جرمن قوم کا ذکر کیا گیا ہے جن کے قومی جھنڈے پر عقاب کا نشان بنا ہوا تھا اور جن کی ابتدائی پیش قدمی واقعی عقابی نوعیت کی تھی جب کہ دوسرے مصرع میں ترکوں کا ذکر ہے۔ اِس مصرع میں صنعتِ ایہام موجود ہے۔

اِس مصرعے میں صنعتِ ایہام موجود ہے۔ شام سے مراد سرزمینِ شام بھی ہے جو جنگِ عظیم اوّل سے قبل ترک سلطنت میں شامل تھی اور اِس سے مرادِ شام کا وقت بھی ہے۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ جنگ کے دوران میں ترکوں کی حیثیت اُن ستاروں سے زیادہ نہ تھی جو شام کے وقت شفق کی سُرخی کے باعث پورے طور پر نمایاں نہیں ہوتے لیکن اِس کے باوجود وہ طلوع ضرور ہوئے اور انھوں نے اپنی آزادی کی حفاظت کی۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جرمن فنونِ حرب میں اِس قدر ماہر تھے کہ سمندر کے نیچے بھی تیر سکتے تھے اور ڈوبتے نہیں تھے لیکن وہ آخرکار سمندر میں غرق ہو گئے جبکہ ترک جو موجوں کے تھپیڑے کھا رہے تھے آخرکار موتی بن کر سمندر سے نکل آئے یعنی کامیاب ٹھہرے۔ جن لوگوں کو سائنسی علوم پر ناز تھا وہ راستے کا غبار ثابت ہوئے لیکن جو لوگ مٹی پر ماتھے ٹیک کر خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے اور اپنی خاکساری و انکساری کا اظہار کرتے تھے اکسیر بنانے والے ثابت ہوئے۔ کیمیا سے مراد جدید زمانے کا علم کیمسٹری بھی ہے اور قدیم زمانے کا

وہ علم بھی جس کے ذریعے مختلف دھاتوں کو سونے میں بدلا جا سکتا تھا۔ ہمارا آہستہ چلنے والا قاصد یعنی ترک قوم جو سائنس کے علوم میں بہت پیچھے تھی، زندگی کی پیغامبر ثابت ہوئی لیکن جو قوم بہت ترقی یافتہ تھی اور جسے بجلی کے ذریعے خبریں ملتی تھیں وہ زندگی کے طور طریقوں سے محض بے خبر نکلے۔

مندرجہ بالا اشعار کا پس منظر یہ ہے کہ ترکوں اور جرمنوں نے ایک دوسرے کے اتحادی کی حیثیت سے جنگ میں شرکت کی، دونوں شکست کھا گئے۔ جس کے نتیجے میں جرمنوں کو تو مکمل تباہی سے دوچار ہونا پڑا لیکن ترک سنبھل گئے اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جنگ عظیم اوّل کے دوران میں شریف حسین والی مکہ نے ترکوں سے غداری کی اور مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت کو نقصان پہنچایا اور یوں والی مکہ کی کوتاہ نظری کے باعث اسلام رسوا و بدنام ہوا۔ لیکن ترک جو ایک زمانے میں مسلمانوں کے شدید دشمن تھے، کس قدر صاحب بصیرت ثابت ہوئے۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ آخر وقت تک اسلام کی حفاظت اور پاسبانی کا فرض ادا کرتے رہے۔ آسمان پر اڑنے والے فرشتے زمین سے مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ خاک سے بنے ہوئے یہ ترک دوسری قوموں کے مقابلوں میں زیادہ زندہ، زیادہ مستحکم و استوار اور زیادہ روشن ثابت ہوئے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ دراصل اہل ایمان سورج کی طرح زندگی گذارتے ہیں۔ سورج اگر مشرق میں ڈوبتا ہے تو مغرب میں طلوع ہو جاتا ہے۔ مغرب میں غروب ہوتا ہے تو مشرق میں نکل آتا ہے۔ اسی طرح اہل ایمان بھی اگر کسی ایک جگہ زوال کا شکار ہو جائیں تو انہیں کسی دوسری جگہ عروج حاصل ہو جاتا ہے دراصل افراد کا یقین وہ دولت ہے جو قوموں اور ملتوں کی تعمیر کرتا ہے۔ یعنی افراد پُر یقین نہ ہوں تو قومیں وجود میں نہیں آ سکتیں۔ یقین ہی وہ طاقت ہے جو کسی ملت کی تقدیر کو سنوارتی اور بناتی ہے۔

۵ تُو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تمھاری حیثیت اس کائنات کے راز کی ہے۔ تمھیں چاہئے کہ تم اپنی آنکھوں پر ظاہر ہو جاؤ۔ یعنی اپنی حقیقت سے آگاہ و واقف ہو جاؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم خود ہی اپنی خودی کے رازداں ہو جاؤ اور خدا کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرو۔ یعنی مشیتِ ایزدی کے مطابق نظامِ کائنات کو چلانے کی قابلیت اور اہلیت پیدا کرو۔ ہوس نے انسانی برادری کو مختلف امتیازات کی وجہ سے

بے شمار گروہوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ تم بھائی چارے کا سبق دے کر اور محبت کا پیغام عام کر کے اِس گروہ بندی اور بے وجہ تقسیم کے خلاف جہاد کرو۔ دوسری قوموں کا تو ذکر ہی کیا خود مسلمان اپنے اپنے علاقائی خطوں کی وجہ سے پہچانے جانے لگے ہیں۔ کچھ ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں اور کچھ خراسانی، افغانی اور تورانی ہونے پر نازاں ہیں۔ حالانکہ ان کی مثال سمندر جیسی ہے جس کی لہریں ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتیں اور یہ موجیں کسی ساحل سے وابستگی اختیار کرتی ہیں۔ تمہیں بھی سمندر کی طرح ساحل کی پیدا کردہ تمام حد بندیاں توڑ کر بے کنار ہو جانا چاہیئے۔ اے مسلمان تو اب تک رنگ و نسل کے امتیازات میں الجھا ہوا ہے۔ تو اسلام اور کعبے کا پرندہ ہے۔ تجھے چاہیئے کہ اپنے پرواز شروع کرنے سے قبل اِس نوعیت کے تمام امتیازات کو گرد و غبار کی طرح اپنے پروں سے جھاڑ دے۔

اے غفلت برتنے والو! زندگی کا راز یہ ہے کہ انسان اپنی خودی میں ڈوب جائے۔ جب انسان خودی میں ڈوب جاتا ہے تو وہ صبح و شام کی قید سے آزاد ہو کر ہمیشگی اختیار کر لیتا ہے۔ تمہیں بھی یہی کرنا چاہیئے۔ زندگی کے میدانِ جنگ میں اپنی سیرت و شخصیت میں فولاد جیسی سختی پیدا کر۔ لیکن جب تو اپنوں میں ہو اور جہاں محبت کی ضرورت ہو وہاں تجھے حریر و پرنیاں کی طرح نرم و نازک ہو جانا چاہیئے۔ اگر تو ناموافق حالات میں گھرا ہوا ہو تو تجھے ان پہاڑوں اور صحراؤں سے منہ زور سیلاب کی صورت گزر جانا چاہیئے۔ لیکن اگر حالات سازگار ہوں اور تو اپنوں کے حلقے میں ہو تو تجھے اس ندی کی مانند ہو جانا چاہیئے جو گلستان سے نغمے گاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے مردِ مومن کی اِس خصوصیت کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اے مسلمان تیرے علم اور تیری محبت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اور فطرت کے ساز میں تجھ سے زیادہ دل لبھانے والی کوئی دوسری آواز نہیں ہے۔ یعنی مظاہر کائنات میں مسلمان سب سے اعلےٰ اور سب سے برتر ہے۔

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہر یاری ہے

وضاحت

انسانی زندگی ترقی کے کتنے مراحل طے کر چکی ہے لیکن آج بھی ایک عام آدمی بادشاہت و ملوکیت کے سامنے ایک انتہائی ذلیل و حقیر اور ناقابلِ توجہ شکار

سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور کس قدر غضب کی بات ہے کہ آج بھی ایک انسان دوسرے انسان کو شکار کرنے اور اُسے جبر و استحصال کا نشانہ بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ موجودہ دور میں جو تہذیب پروان چڑھی ہے، اس کی ظاہری چمک دمک اور آرائش آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے اور دیکھنے کے قابل نہیں رہنے دیتی۔ لیکن اگر اس کی حقیقت و اصلیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ محض جھوٹے اور نقلی موتیوں کا کام ہے جنھیں بہت خوبصورتی سے سجانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس حکمت و دانائی پر مغرب کے فلسفیوں کو بے حد ناز ہے وہ دانائی اس کے سوا کچھ نہیں کہ حرص و ہوس کے باعث خون بہانے والے جدال و قتال کے لیے ایک انتہائی تیز تلوار تھما دی جائے۔ ظاہر ہے کہ پھر انجام بخیر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ محض سوچنے اور غور و فکر کرنے سے اس تہذیب و معاشرت اور اصولِ حیات کو استوار نہیں کیا جا سکتا جو سرمایہ داری کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہو۔ انسان کی زندگی عمل کے ذریعے اچھی یا بُری اور جنتی یا دوزخی بنتی ہے۔ یعنی انسان اچھے عمل کرے گا تو جنت میں جائے گا بصورتِ دیگر اس کے لیے جہنم تیار ہے۔ ورنہ انسان تو اپنی فطرت کے اعتبار سے اِس طور پر بنایا گیا ہے کہ وہ نہ نور سے بنا ہے کہ لازماً جنت ہی اُس کا مقدر ہو اور نہ آگ سے تخلیق کیا گیا ہے کہ وہ لازمی طور پر دوزخ میں ڈالا جائے۔ تو بلبل کو نغمے گانے کا انداز سکھا اور کلی کی گرہ کھول کر اُسے پھول بنا دے۔ اس لیے کہ اس دنیا میں تیری حیثیت موسم بہار میں چلنے والی ہوا جیسی ہے۔ ایشیاء کے دل سے پھر محبت کی چنگاری پیدا ہوئی اور ساری زمین پر اُن ترکوں کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں جنھوں نے اطلس سے بنے ہوئے لباس پہن رکھے ہیں۔

آ کہ میری کمزور جان کا خریدار آ گیا ہے اور ایک مدت بعد قافلہ پھر ہمارے قریب سے گزر رہا ہے۔ یہ شعر نظیری کا ہے۔ تضمین کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اِس شعر میں ذرا سی ترمیم کر لی ہے مگر اِس سے معنوں میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

ے بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد ـــ ـــ ـــ

وضاحت اے شراب پلانے والے تو آ کہ شاخوں سے پرندوں کے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ موسم بہار آ گیا، بہار کے آتے ہی محبوب بھی آیا اور محبوب آیا تو ہمیں چین و آرام مل گیا۔ موسمِ بہار کے بادل نے ہر وادی اور ہر صحرا میں اپنا خیمہ نصب کر لیا اور پہاڑوں کی بلندی سے آبشاروں کی آوازیں آنے لگیں۔ اے ساقی میں تجھ پر قربان جاؤں

تو پھر انعام و اکرام کا پرانا سلسلہ بحال کر دے ۔ اس لئے کہ گانا گانے والوں کے گروہ قطار در قطار چلے آ رہے ہیں ۔ تو عبادت گزار لوگوں سے کنارہ کر لے اور بے جھجک پینا شروع کر دے کہ بہت مدت کے بعد ہماری پرانی شاخ سے بلبل کے نغموں کی آواز آنے لگی ہے ۔ بدر و حنین کے آقا یعنی آنحضرت کا ذکرِ خیر اُن کے عشاق کو سُنا ۔ آپؐ نے جو پوشیدہ تصرفات فرمائے تھے، وہ اب میری آنکھوں پر ظاہر ہو گئے ہیں ۔ حضرتِ ابراہیمؑ کی شاخ یعنی ملت اسلامیہ ہمارے خون سے ایک بار پھر ترو تازہ ہو گئی اور محبت کے بازار میں ہماری پونجی کھری ثابت ہوئی ۔ میں شہید کی قبر پر لالے کے پھول بکھیر رہا ہوں کہ اُس کا خون ہماری ملت کے پودے کو بہت ہی راس آیا ہے ۔

علامہ اقبال خواجہ حافظ کے شعر کی تضمین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آ تاکہ ہم پھول برسائیں اور اپنے پیالوں میں شراب ڈالیں ۔ آسمان کی چھت میں سوراخ کر دیں اور نئے دور کی بنیاد رکھ دیں ۔

○

غزلیات

(۳۷۷)

غزل نمبر ۱

حلِ لغات کملی والا: چادر والا۔ آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس مراد ہے۔ پریشاں خاطر: پریشان و بے قرار طبیعت والی۔ لبِ ساحل: ساحل کا کنارہ۔ حجابِ محمل: کجاوے کا پردہ۔ تگ و دو: کوشش

ے اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام میرا ـ ـ ـ

وضاحت اے صبح کی ہوا آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اب آپؐ کی امت کے ہاتھ سے دین بھی رخصت ہو گیا اور دنیا بھی چلی گئی، دین ہاتھ میں ہو تو یوں اطمینان رہتا ہے کہ چلو عاقبت سنور گئی۔ دنیا پر قبضہ ہو تو یہ بات وجہِ تسلی ہوتی ہے کہ چلئے یہاں کا آرام میسر ہے لیکن اگر کوئی شخص یا قوم دین و دنیا دونوں سے محروم ہو جائے تو یہ انتہائی زوال کی علامت ہے۔

ے یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا ـ ـ ـ

وضاحت ساحل کے کنارے نے ایک بیقرار موج سے کہا کہ ابھی تو سمندر بہت دور ہے اور اس سے ملنے میں بہت دیر ہے۔ لیکن تیری حالت یہ ہے کہ تو سمندر تک پہنچنے سے بہت پہلے دریا ہی میں پیش آمدہ مشکلات سے گھبرا گئی۔ تقریباً یہی بات میرؔ نے ذرا مختلف انداز میں کہی ہے۔

ے ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ے عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجابِ محمل سے ـ ـ ـ

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے قیس اور اے عاشق و دیوانے! تیری محبت کی تمام عزت

اور بھرم صرف اس وجہ سے ہے کہ حسن پردہ نشیں ہے لیکن اگر کجاوے کا وہ پردہ ختم کر دیا جائے جس نے حسن کو چھپا رکھا ہے اور حسن بے نقاب ہو جائے تو اُس کی عزت و بھرم، غیرت اور محبوبیت سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

ع کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی ـ ـ ـ

وضاحت جب پانی کے قطرے نے کوشش اور جدوجہد ترک کر دی تو اُسے موتی بننا نصیب ہوا اور وہ بلند تر مرتبے پر فائز ہو گیا۔ اس کے بعد اس قطرے کی فطرت کی آوارگی اور اِس کے لیے دریا کی موجوں کی کشمکش دونوں ختم ہو گئیں اور موتی بننے کے بعد پانی کے پریشاں خاطر قطرے کو اطمینان و آرام میسر آگیا۔

ع نکلی تو لبِ اقبال سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا ـ ـ ـ

وضاحت بظاہر تو یہ بات اقبال کی زبان سے ادا ہوئی ہے لیکن معلوم نہیں کہ اصل میں یہ آواز کس کی ہے اور جو بات کہی گئی ہے وہ کس کا پیغام ہے۔ اِس لیے کہ اِس بات نے محفل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اطمینان و سکون بھی پہنچایا اور یہ بات سُن کر لوگوں کے دل بھی تڑپ گئے۔

غزل ۲

(۲۷۸)

حلِ لغات سرود: نغمہ، گانا۔ گوش: کان۔ خندہ زن: ہنسا، قہقہے لگانا، تحقیر و تذلیل کرنا۔ دہر: دنیا۔ آفرینش: پیدائش۔ دوش: کاندھا۔

ع یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے ـ ـ ـ

وضاحت قمری اور بلبل کے گانے سراسر کانوں کا دھوکا ہیں۔ اِس لئے کہ اِن نغموں کے پس منظر میں بظاہر ہنگاموں سے بھرا ہوا چمن اور چمن کا باطن

غور کرنے پر بالکل خاموش نظر آتا ہے۔ یعنی انگریزوں کی دل خوش کن باتوں سے دھوکا کھانے کی بجائے ملک کی بدحالی کو دیکھنا چاہیئے۔

ے تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر ۔۔۔

وضاحت اے مغرب کی شراب! یہ تیرے پیالوں کا اثر ہے کہ شراب پلانے والا شراب پینے والوں پر ہنس رہا ہے اور ان کی تحقیر و تذلیل کر رہا ہے۔ جبکہ بیچارے شراب پینے والوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے ہوش وحواس بھی کھو بیٹھے ہیں۔ یعنی مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید کرنے والے اپنے نفع ونقصان سے بے پروا ہو گئے ہیں اور یوں سراسر خسارے میں جا رہے ہیں۔

ے دہر کے غم خانے میں تیرا پتہ ملتا نہیں ۔۔۔

وضاحت انسان دنیا میں آکر اتنا بے عمل ہو گیا ہے کہ گویا دنیا میں اس کا وجود ہی نہیں رہا۔ کیا خدا نے نعوذ باللہ اس انسان کو بنا کر کوئی جرم کیا تھا کہ انسان یوں غائب ہو گیا ہے۔

ے آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں ۔۔۔

وضاحت افسوس کہ دنیا والے جس چیز کو دل سمجھتے ہیں درحقیقت وہ دل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے پہلو میں ایک ایسا ہنگامہ رکھ دیا ہے، جو خاموش ہے۔ یعنی دل جو خود تو خاموش ہے لیکن حقیقت میں دنیا کے تمام ہنگاموں کا سبب ہے۔

ے زندگی کی راہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل ۔۔۔

وضاحت علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیا کے راستے میں چلو ضرور لیکن ذرا سنبھل کے اور بچ کر چلو۔ تمہیں چلتے ہوئے اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ تمہارے کندھوں پر بہت ہی نازک صراحیاں رکھ دی گئی ہیں۔ اگر تم سنبھل کر نہ چلے اور تمھیں کوئی ٹھوکر لگ گئی تو یہ سب صراحیاں ٹوٹ جائیں گی۔ میرؔ نے یہی مضمون ذرا بہتر انداز میں نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ے لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

؎ جس کے دم سے دلّی و لاہور ہم پہلو ہوئے — — —

وضاحت علامہ اقبال لاہور کے مشہور شاعر مرزا ارشد گورگانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اقبال جس شاعر کے طفیل دبستان لاہور اور دبستانِ دہلی ہم عوش ہوئے تھے، افسوس کہ اب وہ بھی وفات پا گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

غزل ۳

(۲۷۸)

حلِ لغات شوریدہ: دیوانہ، مجنوں، سودائی؛ مصلحت اندیش: نیک و بد میں تمیز کرنے والا؛ آتشِ نمرود: نمرود کی آگ، اُس آگ کی طرف اشارہ ہے جس میں نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں ڈال دیا تھا۔ اللہ کے حکم سے آگ گلستان میں تبدیل ہو گئی تھی؛ دہر آشوبی: زمانے میں انقلاب لانا؛ زناری: بتوں کی پوجا کرنے والا۔ کاوشِ انجام: انجام کی فکر؛ کم و کیف: کمیت و کیفیت؛ میزان: ترازو؛ ابرِ نیساں: موسمِ بہار کا بادل؛ مے آشام: شراب پینے والے؛

؎ نالہ ہے بلبلِ شوریدہ تیرا خام ابھی — — —

وضاحت اے مجنوں و سودائی بلبل تیرا نالہ اور تیری فریاد ابھی ناپختہ ہے۔ لہٰذا ابھی کچھ عرصے تک نالہ و فریاد سے درگذر کر اور اسے اپنے سینے ہی میں روک کر رکھ۔

؎ پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — — —

وضاحت اگر عقل ہمہ وقت نفع و نقصان کے تخمینے کرنے میں مصروف رہے اور اسی بنیاد پر عمل کی طرف راغب ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ عقل میں پختگی آ گئی لیکن اگر یہی خصوصیت عشق میں ہو تو وہ بے باکانہ عمل کرنے کی بجائے شبہات میں گرفتار نظر آئے تو کہنا چاہیئے کہ ابھی عشق میں پختگی نہیں آئی اور یہ عشق کی خامی ہے۔

؎ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ـ ـ ـ ـ

وضاحت علامہ اقبال حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ اور اللہ کے پیغام سے عشق تھا اور چونکہ یہ عشق پختہ تھا لہٰذا وہ آتشِ نمرود کو دیکھتے بھالتے ہوتے بھی بے پروا ہوکر اس میں کود پڑے اور اپنے انجام کی مطلق پروا نہ کی جب کہ عقل آج تک چھت کے کنارے کھڑی حضرت ابراہیم کے اس عمل کے بارے میں سوچ رہی ہے یعنی عقل میں وہ بے باکی نہیں ہوتی جو عشق کا بنیادی جوہر ہے علامہ اقبال نے یہی بات ذرا بدلے ہوئے پیرائے میں ایک اور جگہ بھی کہی ہے۔

؎ صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک کلیم سر بکف

؎ عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل ـ ـ ـ ـ

وضاحت محبوب کی طرف سے قاصد کے ذریعے عاشق کے پاس پیغام بھیجا گیا۔ عشق تو اس پیغام کے مطابق نہایت تیزی سے عمل پیرا ہوگیا جبکہ بیچاری عقل اپنی تمام تر تیزی اور طراری کے باوجود محبوب کے پیغام کے معنی بھی نہیں سمجھ سکی۔

؎ شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی ـ ـ ـ ـ

وضاحت عشق کا طریقہ تو آزادی اور زمانے بھر میں نت نئے انقلاب لانا ہے جب کہ تو ابھی تک زمانے کے بت خانے اور اس کا گرفت رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس طرزِ عمل کے ساتھ تو صاحبِ عشق نہیں ہو سکتا۔ اگر صاحبِ عشق ہے تو اس کہنہ نظامِ عالم کی پرستش کرنے کی بجائے اس الٹ پلٹ کو رکھ دے۔

؎ سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات ـ ـ ـ ـ

وضاحت زندگی کی تمام تر کمیت و کیفیت کا دار و مدار انسان کی مسلسل کوشش اور جدوجہد پر ہے جب کہ تم جدوجہد کرنے کی بجائے ابھی تک دن رات کے شمار میں لگے ہوئے ہو۔ حالانکہ زندگی کا یہ کوئی معیار نہیں ہے۔

؎ ابرِ نیساں یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک ـ ـ ـ ـ

وضاحت اے بہار کے بادل میرے پہاڑوں پر کھلنے والے لالے کے پھول ابھی پیاسے ہیں۔ جبکہ تو ان کی پیاس بجھانے کے لئے کھل کر برسنے کی بجائے اپنی انتہائی

معمولی سے شبنم کے چند قطرے دے رہا ہے جو ہماری پیاس کی نسبت سے بہت کم ہیں۔ تیری طرف سے یہ سلوک آخر کب تک جاری رہے گا؟ اسی طرح ایک اور مقام پر علامہ اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

؎ بادہ گردانِ عجم وہ عربی میری شراب ـ ـ ـ

وضاحت شراب پینے والے ابھی تک میری شراب اور شراب کے پیالے سے جھجکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ان پیالوں میں جو شراب ہے وہ خالص عربی اور اسلامی شراب ہے۔ جب کہ یہ میخوار عجمی شراب پینے والے ہیں۔ علامہ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو اسلامی تہذیب کی طرف بلاتا ہوں جبکہ مسلمان تہذیبِ عجم و فرنگ کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ایسے میں انھیں میری بات سنتے ہوئے حجاب محسوس ہو رہا ہے۔

؎ خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم

وضاحت ابھی ابھی ٹھنڈی ہوا گلستان سے اقبال کی خبر لائی ہے۔ یہ نیا نیا گرفتار ہونے والا شخص ابھی تک جال اور دام سے مایوس نہیں ہوا اور ابھی تک جال میں تڑپ رہا ہے۔

غزل ۴

(۲۷۹)

حلِ لغات مہر: سورج ، ماہ: چاند ، انجم: ستارے ، چشمک: پنہاں: پوشیدہ طور پر کی جانے والی چھیڑ چھاڑ ، اعجاز: معجزہ ، دریوزہ گری: بھیک مانگنا ، بادیہ پیمائی: جنگلوں جنگلوں آوارہ گردی کرنا۔

ے پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر محفل کو سجا لے اور دنیا میں سورج چاند اور ستاروں یعنی سب کو اپنا تماشائی بنا لے ۔ یعنی اس طرح جلوہ آرا ہو کہ ہر کوئی تیرا جلوہ دیکھنے میں محو ہو جائے ۔ دراصل علامہ اقبال انسان سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ تو چھپا ہوا ہے یعنی بے عمل ہے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے رہا ۔ تجھے چاہیئے کہ تو اس طرح سامنے آ کہ سب تجھے دیکھ سکیں ۔

ے تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر تو بجلی ہے تو پھر یہ پوشیدہ طور پر کی جانے والی چھیڑ چھاڑ کب تک ہوتی رہے گی ۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ تو بے پردہ ہو کر اور بغیر جھجکے میرے دل میں آجا ۔ اس میں بھی انسان کو مخاطب کیا گیا ہے ۔

ے نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت زندگی کا معجزہ صرف گرم سانس کا مرہونِ منت ہے ۔ یعنی گرم اور پُرحرارت سانس کی وجہ سے زندگی اپنا اظہار کرتی ہے ۔ اگر یہ گرم سانس تیرے سینے میں بھی موجود ہے تو تجھے بھی حضرتِ عیسیٰ کی طرح مردوں کو زندہ کرنے کا کارنامہ انجام دینا چاہیئے ۔

ے کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت علامہ اقبال حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر گئے ۔ وہاں انھوں نے اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھنے کی درخواست کی جو بڑی ردوکد اور سوال وجواب کے بعد منظور ہوئی ۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تم کب تک کوہِ طور پر موسیٰؑ کی طرح اللہ کا جلوہ دیکھنے کی بھیک مانگتے رہو گے ؟ زیادہ بہتر یہ ہے کہ بھیک مانگنے کی بجائے اپنی ہی ہستی سے کوہِ سینا کا شعلہ پیدا کر لیا جائے ۔

ے جو تری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیرِ حرم ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت تم نے اپنے آپ کو عیسائیت کے رنگ میں رنگ لیا ہے اور تم نے مغرب کی تہذیب و معاشرت اختیار کر رکھی ہے ۔ لیکن تمھیں چاہیئے کہ اس انداز کو ترک

کرد و اور تمھاری روش یہ ہونی چاہیئے کہ تمھاری خاک کے ایک ایک ذرے سے نیا خانہ کعبہ تعمیر کیا جاسکے۔

ے اس گلستان میں نہیں حد سے گذرنا اچھا — — —

وضاحت اِس باغ میں یعنی اِس دنیا میں اپنی حد سے تجاوز کرنا اچھا نہیں ہے۔ انسان کو ہر عمل اپنی بساط کے مطابق کرنا چاہیئے۔ بالفرض تم محبوبیت کی روش اختیار کرنا چاہتے ہو تو وہ بھی اسی قدر کرو جس حد تک تم خوبصورت ہو، بصورت دیگر ذلت و رسوائی تمھارا مقدر ہو جائے گی۔

ے پہلے خود دار تو مانند سکندر ہولے — — —

وضاحت تیرے دل میں یہ شدید خواہش ہے کہ تجھے عظیم بادشاہ دارا جیسی شان و شوکت حاصل ہو جائے لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ اُسے یہ شان وشوکت کس طرح ملی تھی۔ اس کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ پہلے انسان سکندر جیسے بادشاہ کی طرح خود دار و غیرت مند ہو، پھر حکمرانی کرنے کا شوق پیدا کرے۔

ے مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبالؔ — — —

وضاحت اے اقبالؔ تجھے اپنی منزل کی تلاش ہے تو مایوس نہ ہو۔ بیشک تجھے تیری منزل مِل جائے گی۔ لیکن ابھی کچھ دِن مزید جنگلوں خاک چھاننی پڑے گی۔

غزل ۵

(۲۸۰)

ے پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو — — —

وضاحت اے اقبالؔ دنیا میں پھر بہار کی ہوا چلنے لگی لہٰذا تجھے مست و سرشار ہو کر غزل گانی چاہیئے۔ بہار کی ہوا چونکہ چیزوں کی افزائش کا سبب بنتی ہے لہٰذا اگر تو غنچہ ہے تو اِس ہوا کے اثر سے پھول کر تجھے گُل بن جانا چاہیئے اور اگر تو

پہلے ہی پھول ہے تو تجھے باغ میں تبدیل ہو جانا چاہیئے۔

ع تُو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے ---

وضاحت بے شک تیری حیثیت ایک مٹھی مٹی سے زیادہ نہیں لیکن اگر تو چاہے تو اپنے اجزا کی حرارت وگرمی کے باعث منقلب ہو سکتا ہے ابکھر سکتا ہے اور پھیل کر ایک صحرا کی وسعت اختیار کر سکتا ہے۔ یعنی انسان مجبور ہو کر بھی بہت سے معاملوں میں قادر و مختار ہے۔

ع تو جنسِ محبت ہے قیمت ہے گراں تیری ---

وضاحت تُو محبت کی جنس ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تیری قیمت بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں محبت کے طلب گار بہت ہی کم پونجی رکھتے ہیں۔ اگر تیری قیمت اتنی ہی رہی تو ان میں سے کوئی بھی تجھے نہیں خرید سکے گا۔ لہذا تجھے اپنی قیمت کم کر کے سستا ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ یہ لوگ تجھے خرید سکیں

ع کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تری ---

وضاحت آخر تیری آواز ساز کے پردوں میں کیوں چھپی رہے؟ تُو تو اس دنیا کا ایک حسین و خوبصورت نغمہ ہے۔ اس لیے تجھے چاہیئے کہ تُو ہر کان پر خود کو ظاہر کر دے تاکہ سب لوگ تیری رنگینی سے لطف اندوز ہو سکیں۔

ع لے رہروِ فرزانہ ، رستے میں اگر تیرے ---

وضاحت اے عقل مند مسافر اگر تیرے راستے میں کوئی گلشن اور باغ آتا ہے تو تجھے شبنم ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر تیرا راستہ روکنے کے لیے کوئی صحرا تیرے راستے میں آتا ہے تو تجھے طوفان کی شکل اختیار کر لینی چاہیئے۔ دراصل اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کو خاص طور پر مردِ مومن کو سازگار حالات میں نرم دل اور ناسازگار حالات میں انتہائی سخت ہونا چاہیئے۔ بصورتِ دیگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اسی لیے وہ کہتے ہیں

ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

سامان کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی ۔ ۔ ۔

وضاحت اے مُسافر اگر تُو سفر کے دوران میں اپنے ساتھ کچھ سامان رکھنا چاہتا ہے تو اِس سے صاف ظاہر ہے کہ تو تن آسان ہے اور راستے کی سختیاں جھیلنا تیرے بس میں نہیں ۔ اِسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تُو منزل کی بجائے اپنے آرام و اطمینان کا خیال رکھنا چاہتا ہے ۔ بصورتِ دیگر اگر تجھے اپنی منزل سے محبت ہے تو تجھے چاہیئے کہ سامانِ سفر کو برباد کر کے اپنی منزل کی طرف قدم بڑھا ۔

غزل ۶

(۲۸۰)

حل لغات مُنتَظَر : وہ جس کا انتظار کیا جائے ، یہاں پر اللہ تعالیٰ مراد ہیں ، مجازی : غیر حقیقت ، مادّی ، جبیں : ماتھا ، پیشانی ، نیاز : عاجزی ، خاکساری ، خروش : شور و ہنگامہ ، محرم : واقف ، گوش : کان ، سرود : نغمہ شکستہ : ٹوٹا ہوا کرمک : پروانہ ، پتنگا ، حکایت : کہانی ، حدیث : بات غزنوی : محمود غزنوی مراد ہے ، ایاز : محمود غزنوی کا ایک غلام جو صوبہ پنجاب میں گورنر بھی رہا ۔ بعض روایات میں اُسے محمود غزنوی کا عاشق اور محبوب بھی کہا گیا ہے ۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر ! نظر آ لباسِ مجاز میں ۔ ۔ ۔

وضاحت اے وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جاتا ہے ، یعنی اے خدا اب تو مادی لباس پہن کر سامنے آ جا ۔ اِس لیے کہ میری خاکساری اور انکساری رکھنے والی

پیشانی میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تجھے دیکھوں اور سجدہ کروں۔

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو ۔ ۔ ۔

وضاحت اے انسان! تو شور و ہنگامے کی مسرت سے واقف ہو جا۔ تو ایک آواز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا تجھے لوگوں کے کانوں تک پہنچنا چاہیئے تاکہ لوگ تجھ سے محظوظ اور لطف اندوز ہو سکیں۔ آخر اس نغمے کی کیا حیثیت ہے جو ساز کے پردے کی خاموشی میں چھپا ہوا ہو۔ نغمہ تو وہ ہے جسے لوگ سن سکیں۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

وضاحت اے مسلمان! تو اپنے آئینے کو ٹوٹنے سے نہ بچا۔ شاید تجھے معلوم نہیں کہ تیرا آئینہ یعنی دل تو وہ آئینہ ہے جو ٹوٹنے کے بعد آئینہ ساز یعنی اللہ تعالےٰ کی نگاہوں میں زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے محفوظ رکھنے کی تگ و دو نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ شعر غالباً ایک مقولے سے متاثر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتا ہے۔

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن ۔ ۔ ۔

وضاحت شمع کا طواف کرتے ہوئے پروانے نے کہا کہ اے شمع وہ پرانا اثر نہ تو اب تیرے جلنے کی کہانی میں موجود ہے اور نہ میری پگھلنے اور جل مرنے کی بات میں ہے۔ دونوں چیزیں تاثیر سے خالی ہوگئیں اس لئے کہ دونوں اپنے اپنے عمل میں مخلص نہیں ہیں۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی ۔ ۔ ۔

وضاحت مجھے تباہ و برباد کر دینے والے جرم کو اس دنیا میں کہیں بھی پناہ نہ مل سکی۔ البتہ ایک تیری رحمت کا دامن ہے جس نے میرے جرم کو چھپا لیا اور مجھے معاف کر دیا۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں ۔ ۔ ۔

وضاحت نہ اب عشق میں پرانے زمانے جیسی گرمی و حرارت رہی اور نہ ایاز یعنی حسن میں شوخی و دلبری اور محبوبیت کی وہ صورت موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا جب محمود غزنوی کا دل اپنے محبوب ایاز کی فرقت میں تڑپا کرتا تھا۔ لیکن اب عشق کا دل تڑپ سے بالکل خالی ہے۔ اسی طرح ایاز یعنی محبوبیت میں جو محبوبیت تھی اور اس کی زلف میں جو پیچ و خم تھے، اب وہ بھی مفقود ہیں یعنی عاشق اور محبوب دونوں اپنی خصوصیات سے بیگانہ ہو چکے ہیں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا ۔۔۔

وضاحت جب کبھی میں نے نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کیے تو فوراً زمین سے یہ آواز آنے لگی کہ اللہ تعالیٰ کو تو وہ لوگ سجدہ کریں جو اپنے دلوں میں بتوں کی محبت نہیں رکھتے ۔ یقیناً نماز سے ایسے لوگوں کو فائدہ ہوگا لیکن تیرا دل تو بتوں کی محبت میں سرگرم ہے ۔ بھلا تجھے سجدہ کرنے اور نماز پڑھنے سے کیا حاصل ؟ گویا اخلاص کے بغیر کوئی بھی عمل اپنے نتائج پیدا نہیں کرتا ۔ یہی وجہ ہے کہ آج نماز نہ تو فحشی سے روکتی ہے اور نہ بغاوت سے باز رکھ سکتی ہے ۔ اِس لئے کہ ہم کامل خلوص سے نماز ادا ہی نہیں کرتے ۔

غزل

حلِ لغات تہہ دام : جال کے نیچے ، گرفتار حالت میں ؛ طائر : پرندہ ؛ نوائے زیرِ لبی : وہ آواز جو ہونٹوں کے نیچے رہے اور دوسروں کو سنائی نہ دے ؛ دلِ ناصبور : بے صبر دل ؛ گریہ : رونا دھونا ؛ زخمہ : ساز بجانے کا آلہ ، مضراب ؛

تہہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا ۔۔۔

وضاحت اگر چمن کے پرندے گرفتاری کے عالم میں بھی غزل پڑھتے اور گانے گاتے رہے تو کیا حاصل ۔ اِس لئے کہ اُن کے دلوں میں جس زیاد نے طوفان برپا کر رکھا ہے ، وہ تو غزل خوانی کے باوجود صرف ایسی آواز بن سکی جو ہونٹوں تک محدود رہے اور کسی کو سنائی نہ دے ۔ یعنی ایسی غزل خوانی کا کوئی فائدہ نہیں ۔ مطلب یہ کہ غلامی سے رہا ہونے کے لیے زیادہ جدوجہد درکار ہے ۔

تیرا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دلِ ناصبور نہ کر سکا ۔۔۔

وضاحت تیرا دیدار بھی میرے بے صبر اور سکون ناآشنا دل کی تسلی اور اطمینان کا باعث نہیں بن سکا ۔ اگرچہ تُو نے دیدار کرنے کا موقع دیا ۔ اِس کے باوجود میں اپنی پرانی روش کے مطابق صبح کو اٹھ کر روتا رہا اور نصف شب کے قریب آہیں بلند کرتا رہا ۔

ے نہ خدا رہا نہ صنم رہے نہ رقیب دیر و حرم رہے ۔ ۔ ۔

وضاحت عجیب زمانہ آیا ہے کہ اب دنیا میں نہ خدا موجود ہے اور نہ بت موجود ہیں۔ نہ خدا سے محبت کرنے والے موجود ہیں اور نہ بتوں کی پرستش کرنے والے۔ نہ دنیا میں حضرت علی المرتضیٰ کی قوت جو بے خوف وخطر باطل کے خلاف میدانِ عمل میں آجاتی تھی، موجود ہے اور نہ ابولہب جیسا کوئی کافر موجود ہے جو کامل استواری کے ساتھ اسلام کی مخالفت کر سکے۔ گویا دنیا میں مذہب سے کسی کا تعلق نہیں رہا۔ سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہو گئے ہیں۔

ے مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا ۔ ۔ ۔

وضاحت اگرچہ میرے ساز پر پے بہ پے اور مسلسل یورپ و عجم کے مضراب پڑتے رہے۔ یعنی اگرچہ میرا انداز و اسلوبِ شعر غیر اسلامی رہا لیکن میں ایسا وفا کا مارا ہوا ہوں کہ یورپ و عجم کی تمام تر کوشش و کاوش کے باوجود میری آواز اسلام اور عرب ہی کی آواز رہی اور میں تمام عمر اسلام کی ترجمانی کرتا رہا۔ علامہ اقبال نے نظم 'شکوہ' کے آخر میں بھی یہی بات کہی ہے۔

ے عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

غزل ۸

(۲۸۲)

حلِ لغات زندانی : قیدی، محتاج ؛ اسباب : وسائل کے ذرائع ؛ قلب : دل ؛ لا یخلف المیعاد : اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ لسان العصر : زمانے کی زبان ؛ اس سے اکبر الہ آبادی مراد ہیں۔ ان وعد اللہ حق : بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

؎ گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اِس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح تیری تعمیر کی گئی ہے اس کے باعث تُو ظاہ
وسائل و ذرائع کا محتاج ہے اور ان کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سک
لیکن کم از کم اِس طرح کی قید سے تُو اپنے دل کو تو آزاد رکھ سکتا ہے ۔ یعنی دل ان چیزوں کا پابند
نہیں ہوتا ۔

؎ عقل کو تنقید سے فرصت نہیں ۔ ۔ ۔

وضاحت عقل ہمہ وقت ظن و تخمین اور نقد و اعتراض میں الجھی رہتی ہے ۔ یہی وجہ
ہے کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتی ۔ لہٰذا تجھے چاہئے کہ تُو عقل
کو نظر انداز کر کے اپنے اعمال کی بنیاد جذبۂ عشق پر رکھے ۔ صرف اس طرح تُو ترقی کے مراحل بہ آسانی
طے کر سکتا ہے ۔

؎ اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر ۔ ۔ ۔

وضاحت اِس کے علاوہ تجھے ہر وقت قرآن شریف کی یہ آیت بھی اپنے سامنے رکھنی چاہئے
کہ اللہ کے وعدے جھوٹے نہیں ہوتے بشرطیکہ تُو خود اللہ تعالیٰ سے کئے
کئے وعدوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے ۔ اگر تُو ایسا کرے گا تو یقیناً اللہ کے تمام وعدے
پورے ہوں گے ۔

؎ یہ لسان العصر کا پیغام ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وضاحت اگر تمھارے لئے میری بات قابلِ توجہ نہ ہو تو خیر لیکن حضرت اکبرالہ آبادی
نے بھی یہی بات کہی ہے کہ ہمیں قرآن شریف کی یہ آیت اپنے پیشِ نظر
رکھنی چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بیشک میرے وعدے سچے ہوتے ہیں ۔ دوسرا مصرع
حضرت اکبرالہ آبادی کا ہے جسے اقبال نے تضمین کیا ہے ۔

ظریفانہ

تمہید علامہ اقبال، اکبر الٰہ آبادی کے بیحد مداح تھے۔ قیاس یہ ہے کہ انھوں نے اکبر کے کلام کا مطالعہ چھوٹی عمر سے کیا ہوگا۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں علیگڑھ کے سٹریچی ہال میں لیکچر دیتے ہوئے انہوں نے کلام اکبر کی بیحد ستائش کی۔ پھر ۱۹۱۱ء میں پنجاب ریویو میں اکبر کے فکر و فن کے بارے میں انھوں نے نہایت مختصر الفاظ میں اُن کی روح کو سمو ڈالا۔ اس تحریر سے ایک مختصر اقتباس درجِ ذیل ہے:

"ان کے کلام میں ظریفانہ لہجے پر نہ جائیے۔ اُن کے شباب آور قہقہے، ان کے آنسوؤں کے آئینہ دار ہیں۔"

اسی سال اکبر سے ان کی خط و کتابت شروع ہوئی اور پھر علامہ اقبال اکبر کی ملاقات کے لئے کئی دفعہ الٰہ آباد گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ علامہ اقبال نے اکبر کے نام اپنے خطوط میں بارہا یہ لکھا ہے کہ میں اکبر کو اپنا مرشد سمجھتا ہوں اور اُن کے رنگ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ درحقیقت ایک مرید کا مرشد سے اظہارِ عقیدت ہے۔ اسے کسی اور رنگ میں نہیں لینا چاہیئے۔ بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ اقبال نے شاعری کا آغاز اکبر کی پیروی سے کیا۔ لیکن چونکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اس لئے انھوں نے اِس رنگِ سخن کو ترک کر دیا۔ مگر اِن ناقدین کو اتنی بات بھی معلوم نہیں کہ یہ علامہ اقبال کا ابتدائی کلام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا زیادہ حصّہ اُس زمانے میں لکھا گیا ہے جب وہ بانگِ درا کا بیشتر حصّہ تخلیق کر چکے تھے۔ بانگِ درا کے ظریفانہ حصّے کو اکبر کی خدمت میں اقبال کا نذرانۂ عقیدت سمجھنا چاہیئے۔

(۱)

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

وضاحت اس رباعی کے پہلے مصرعے میں عام طور پر شارحین اصولِ دین کو ترکیب فرض کرکے وضاحت کرتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس ترکیب کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا فاعل غائب ہے۔ درحقیقت اس مصرعے کی نثر یوں ہے کہ اصول مشرق میں دین بن جاتے ہیں یعنی اصولوں کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ وہ دین کا درجہ حاصل کر لیتے

ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مغرب میں چونکہ صنعتی ترقی انتہا پر پہنچی ہے اس لئے اصول مشینی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یعنی مغرب کے اصول مشینی زندگی کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جو لوگ مشرق سے حصولِ تعلیم یا کسی اور غرض سے مغرب جاتے ہیں، وہاں کی مشینی زندگی میں ڈھل جاتے ہیں اور چونکہ مشین اشیاء کے زیادہ سے زیادہ نمونے بڑی جلدی تیار کر ڈالتی ہے اس لئے یہاں سے جانے والا ایک شخص یورپ میں جا کر بستا ہے تو وہ بہت جلد ایک کی بجائے تین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے لڑکے یورپ جانے سے پہلے اپنے اصولوں کی بات بڑے شد و مد سے کرتے ہیں اور زبان سے اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ مغرب کی دلچسپیاں انہیں اپنے مقصد سے نہیں ہٹا سکتیں۔ لیکن وہاں پہنچکر وہ شادی کر لیتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک کی بجائے تین ہو جاتے ہیں۔ اصول دھرے رہ جاتے ہیں اور وہ مغرب کی مشینی زندگی کا ایک پرزہ بن جاتے ہیں۔ اس رباعی کی ساری خوبصورتی اس کی رعایتِ لفظی میں ہے۔ موازنہ چونکہ مشرقی ممالک کے مسلمانوں اور مغرب کے عیسائیوں میں کیا گیا ہے اس لئے ”رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے“ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لڑکے خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ اور ایک کے تین کہہ کر اُن کے عقیدۂ تثلیث اختیار کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ صنعتِ ایہام کا یہ استعمال اس رباعی کی تاثیر میں اضافہ کر رہا ہے۔

۲۔ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

وضاحت ہندوستان میں انگریزوں نے ۱۸۵۷ کے بعد انگریزی کی تدریس لازمی کر دی تھی۔ پہلے تو مسلمان اپنے لڑکوں کو بھی انگریزی نہیں پڑھاتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ خواتین کے کالج بھی کھلنے لگے اور لڑکیوں نے بھی انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔ اقبال نے لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس کی مذمت کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قوم کی فلاح کا راستہ تو درحقیقت پیروئ دین میں پوشیدہ ہے لیکن قوم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ لڑکیاں مغربی تعلیم حاصل کر کے فلاح پا جائیں گی۔ مغربی تعلیم ان میں مغربی تہذیب کی نقالی کا شوق پیدا کرے گی اور نتیجہ یہ ہو گا کہ کچھ عرصہ بعد وہ مشرقی تہذیب کو گناہ سمجھنے لگ جائیں گی۔ لڑکیوں کو انگریزی پڑھانے کا یہ شوق جو درحقیقت ایک ڈراما ہے، خدا جانے مستقبل میں قوم کو کس قسم کے مناظر دکھائے گا۔ گویا ان مناظر کی سنگینی کا اندازہ اس وقت ہو گا جب اس ڈرامے کی اسٹیج سے پردہ اٹھے گا اور سارے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ مغربی تعلیم نے لڑکیوں میں کیا کیا خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ تین شعروں کے اس قطعے میں آخری شعر میں صنعتِ ایہام سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لڑکیوں کی مغربی تعلیم ڈراما ہے۔ اس کی مناسبت سے سین کا انگریزی لفظ استعمال کیا گیا ہے

جس کا مطلب منظر ہے۔ آخری مصرعے میں "پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ" میں صنعتِ ایہام کا استعمال بڑی لطافت سے کیا گیا ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس ڈرامے سے جب پردہ اٹھے گا تو ساری حقیقت سامنے آجاتے گی۔ مگر دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لڑکیاں جب پردہ اٹھا دیں گی تو اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مغربی تہذیب ہماری تہذیب و ثقافت کو کس طرح تباہ کر چکی ہے۔

۳ - شیخ صاحب بھی پردے کے کوئی حامی نہیں   مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے

وضاحت دو اشعار کا یہ قطعہ اکبر الٰہ آبادی کے اسلوب کی پیروی میں خاصا کامیاب ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ شیخ صاحب ایک عالم دین ہیں جو اکثر پردے کی حمایت میں تقریر کرتے رہتے ہیں لیکن انہوں نے جب پردے کی حمایت کی تو کالج کے لڑکوں نے ان کے بارے میں بُری رائے قائم کر لی اور یہ سمجھنے لگے کہ شیخ صاحب پرانی وضع کے آدمی ہیں اور نئی روشنی سے محروم ہیں۔ اس لئے شیخ صاحب نے کل وعظ کرتے ہوئے یہ بات صاف صاف کہہ دی   کہ پردے کی اب ضرورت نہیں رہی اور اس کے لئے دلیل یہ دی کہ پردہ تو عورتوں اور مردوں کے درمیان ہوتا ہے جبکہ کالج کے لڑکے اپنے بناؤ سنگھار کی وجہ سے عورتوں کے مشابہہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے عورتوں کا ان سے پردہ کرنا بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں لطف یہ ہے کہ شیخ صاحب نے بظاہر کالج کے لڑکوں کی بات مانتے ہوئے پردے کے خلاف فتوےٰ دے دیا ہے لیکن درحقیقت یہ مصرع کالج کے لڑکوں پر ایک بلیغ طنز کی حیثیت رکھتا ہے کہ گویا وہ مردانگی سے محروم ہو گئے ہیں اور لڑکیوں میں اور ان میں کوئی فرق نہیں رہا۔

۴ - یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند   غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی

وضاحت یہ قطعہ بھی اپنے مقصد کے لحاظ سے مندرجہ بالا قطعہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن وہاں بات کالج کے لڑکوں تک محدود تھی لیکن یہاں سارے مسلمان مردوں کو مخاطب کر کے وہی بات کہی گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے ہوشمند انسان! اب یہ بات زیادہ دور نہیں ہے کہ جب تجھ میں غیرت بالکل ختم ہو جائے گی تو تجھ میں عورتوں کی بے پردگی پر کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ عورت اوٹ میں رہنے یعنی پردہ کرنے کی بجائے الیکشن لڑا کرے گی۔ اور کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ طلب کرتی پھرے گی۔ اور اسے اپنے یہ مشاغل اس قدر عزیز ہو جائیں گے کہ اولاد کی پرورش کا خیال ذہن سے بالکل نکل جائے گا۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کے مطابق عورت اور مرد کے دو الگ الگ دائرہ کار ہیں۔ عورت گھر سنبھالتی ہے۔ اولاد کی پرورش اور تربیت کرتی ہے جبکہ مرد باہر کا کاروبار چلاتا ہے۔ اگر اس دائرہ کار

میں تبدیلی آجائے اور عورتیں باہر آکر کونسل کی ممبر بن جائیں اور ملک کا نظام چلانے لگیں تو یہ مردوں کی غیرت پر حرف آنے والی بات ہے ۔

۵۔ تعلیم مغربی ہے، بہت جرأت آفریں   پہلا سبق ہے، بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

وضاحت یہ چار اشعار چونکہ ایک دوسرے سے زیادہ مربوط نہیں ہیں۔ اس لئے اسے اکبر الٰہ آبادی کے رنگ کی ایک نامکمل غزل قرار دیا جاسکتا ہے ۔ اس لئے چاروں شعروں کی شرح الگ الگ درج ذیل ہے ۔

i ۔ تعلیم مغربی بہت جرأت پیدا کرنے والی تعلیم ہے ۔ چنانچہ جو لوگ کالج میں داخل ہوتے ہیں انہیں کالج سے پہلی تعلیم اور تربیت یہ ملتی ہے کہ وہ شیخی بگھاریں اور اپنے حسب نسب پر اترائیں ۔ حالانکہ اصل تعلیم تو وہ ہے جو انسان میں قابلیت اور انکسار پیدا کرے مگر مغربی تعلیم، تعلیم دینے سے پہلے مبالغہ آمیزی پیدا کر دیتی ہے ۔

ii ۔ ہندوستان میں جو لوگ بھی رہتے ہیں وہ محض چیزوں کے خریدار ہیں ۔ یعنی ہندوستان میں کوئی چیز بنائی نہیں جاتی بلکہ اس کی حیثیت ایک منڈی کی سی ہے جہاں مختلف ملکوں سے انواع واقسام کا مال آکر بکتا ہے مگر یہاں سے مصنوعات تیار ہو کر برآمد نہیں ہوتیں ۔ کوئی ملک محض درآمدات پر انحصار کر کے زندہ نہیں رہ سکتا ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کی حالت اس معاملے میں اتنی گئی گذری ہے کہ یہاں بھنگ بھی کابل سے آتی ہے اور پٹھان اس کو جابجا بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اس شعر کا دوسرا مصرع اکبر الٰہ آبادی کی ایک رباعی کے ایک مصرع سے بیحد مماثلت رکھتا ہے ۔ جو یوں ہے : ع

آغا آتے ہیں لے کے کابل سے ہینگ

iii ۔ اس شعر میں "میرا" اور "ان کا" کے الفاظ وضاحت طلب ہیں ۔ میرا سے مراد ہندوستان کے باشندوں کا حال ہے جبکہ "ان کا" سے مراد انگریز حاکموں کا حکم ہے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے انگریزوں کے سامنے بہت زیادہ عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ان کی عاجزی اس حد تک پہنچ جاتی ہے جیسے وہ انگریزوں کے بوٹ کی "ٹو" چاٹ رہے ہوں ۔ لیکن انگریزوں کے غرور اور ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا یہ ہے کہ وہ بوٹ چاٹنے پر بھی ہندوستانیوں سے خوش نہیں ہوتے بلکہ انہیں کہتے ہیں کہ "رینگ رینگ کر میرا بوٹ چاٹنے کی کوشش میں میرا فرش خراب نہ کرو ۔"

۱۷۔ اس شعر میں اونٹ اور گائے کی علامتیں وضاحت طلب ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری میں اونٹ سے مسلمان مراد لئے ہیں اور گائے سے ہندو۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اونٹ عرب کا جانور ہے جبکہ گائے ہندوؤں کی مقدس ماتا ہے۔ اقبال نے یہی علامتیں اکبر سے انہی معنوں میں مستعار لی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی صاحب کہنے لگے کہ اونٹ تو ایک بدصورت جانور ہے۔ جیسا کہ ضرب المثل ہے "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" لیکن گائے بہت اچھا جانور ہے۔ اور اس کی اچھائی اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے سینگ جو بظاہر حملہ کرنے کے کام آتے ہیں وہ بھی بہت لوکدار اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس شعر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ بات کس نے کہی ہے لیکن قیاس یہی ہے کہ یہ بات کسی انگریز نے کہی ہے۔ انگریز عموماً مسلمانوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں اپنے سے دور رکھا کرتے تھے۔ گویا مسلمان اُن کے لئے بھدے سے جانور کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوؤں کو وہ عموماً خوش رکھتے تھے اور ان کے لہجے کی تلخیوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ گویا گائے اگر اُن پر حملہ آور بھی ہوتی تھی تو بُرا ماننے کی بجائے ان کے حملوں کے خوبصورت انداز کی داد دیتے تھے۔

۱۸۔ کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگدست — تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

وضاحت اس مختصر قطعے میں علامہ اقبال نے ان لوگوں پر طنز کی ہے جو ذاتی مفاد کے حصول کی غرض سے مختلف شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لوگ یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ذاتی منفعت کے لئے مذہب کے مسلّمہ عقائد کی تردید پر اتر آتے ہیں۔ اس قطعے میں کسی ایسے ہی شخص کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس شخص کو اقبال نے "حضرتِ واعظ" کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر حضرتِ واعظ مالی طور پر پریشان ہیں تو انہیں اس بات کا غم نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر وہ تہذیبِ نو کے سامنے اپنا سر جھکا دیں اور نئی نسل کو خوش کرنے کا طرزِ عمل اپنا لیں، تو ان کی مالی تنگی دور ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب تک اسلامی عقائد میں جہاد کی تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے یہ موضوع پرانا ہو گیا ہے حضرتِ واعظ کو یہ چاہیئے کہ اب وہ حج کرنے کی تردید میں کوئی کتابچہ لکھ ڈالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ رسالہ بہت مقبول ہو جائے گا۔ نئی تہذیب کے لوگ اسے خرید کر پڑھیں گے اور واعظ کی مالی تنگدستی دور ہو جائیگی۔

نوٹ: ردِّ جہاد میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بہت کچھ لکھا تھا۔ جس کی طرف اس قطعے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۹۔ تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے

حلِ لغات پِل (Pill): گولی، بدیۂ دل: مراد ہے تنظیم، پس از سبق: سبق کے بعد

وضاحت اس قطعے میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں مغرب سے مرعوبیت اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ جب تک کسی چیز کا نام انگریزی میں نہ لیا جائے اس وقت تک لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً مریض کو مرض کے علاج کے لئے گولیاں دی جاتی ہیں۔ لیکن اگر اس کو ڈاکٹر یہ کہے کہ گولی کھا لو تو اُسے یہ بات پسند نہیں آئے گی لیکن اگر یہ کہا جائے کہ "پِل" کھا لیجئے تو یہ بات زیادہ موثر ثابت ہوگی اور وہ سمجھے گا کہ وہ جلد شفایاب ہو جائے گا۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی آمد نے ہمارے ملک کی فضا اس حد تک بدل دی ہے کہ کسی زمانے میں جب اساتذہ طلباء کو تعلیم دیتے تھے، تو تعلیم کے بدلے شاگرد ان کی دلی طور پر تعظیم کرتے تھے۔ لیکن اب مغربی تعلیم کے اجراء سے سکولوں کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ ماسٹروں کی کوئی عزت طالب علموں کے دل میں نہیں رہی بلکہ وہ سبق پڑھنے کے بعد فیس ادا کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ اور اب استاد کی عزت کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی۔

۸۔ انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے

حل لغات پیرہن : قمیض
غسّال : غسل دینے والا

وضاحت اِس قطعہ میں اقبال نے وہی بات کہی ہے جو اس سے قبل ظریفانہ ہی کے ایک شعر میں یوں کہہ چکے ہیں۔ ؎

لیتے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

اس قطعے میں یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں دنیا بھر کے ملکوں سے سامانِ تجارت آتا اور بکتا ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ درآمدی مال کو خرید کر صرف کرنے کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟ کیا ہمارا ملک ہمیشہ چھتریاں، رومال، مفلر، قمیض اور اس قسم کی معمولی معمولی چیزیں بھی باہر سے منگوا کر پہنتا رہے گا اور کیا ہم اس قسم کی چیزیں بھی خود نہیں بنا سکتے۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اسی طرح غافل رہے اور اپنے ملک کو غیر ملکی سامان کی مارکیٹ بنائے رکھا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب یہاں کوئی شخص مر جائے گا تو اُسے غسل دینے کے لئے کابل سے لوگ بلوانے پڑیں گے اور مردے کو کفن دینے کے لئے کفن جاپان سے درآمد کرنا پڑے گا۔

۹۔ ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

حل لغات کنٹر : شراب پینے کا پیالہ ؛ بلوری : شیشے کا بنا ہوا ؛ ہٹ : ضد، مستقل مزاجی ؛ گردوں : آسمان ؛ جھٹکا : جانور کو ذبح کرنے کے لئے بغیر تکبیر پڑھے ایک ہی وار میں گردن الگ کر دینا جو سکھوں کا طریقہ ہے۔

یہ چار شعروں کی ایک طنزیہ غزل ہے ۔

وضاحت :۔ ہم مشرق کے غریب لوگ ہیں لیکن ہمیں مغرب سے محبت ہوگئی ہے ۔ دقت یہ ہے کہ ہم اپنی غریبی کی وجہ سے ایک پرانا مٹکا گھر میں رکھنے پر مجبور ہیں اور اس کے سوا ہمارے پاس کوئی برتن موجود نہیں جبکہ مغرب میں شراب پینے کے لئے شیشے کے برتن استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اس شعر میں خوبصورتی یہ ہے کہ مٹکا بھی دیہاتوں میں شراب کا ذخیرہ رکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ دیسی ساخت کی شراب اکثر مٹکوں میں رکھی جاتی ہے ۔ مراد یہ ہے کہ ہماری تہذیب اور ہمارے نظریات وخیالات پرانے اور پختہ ہیں جب کہ مغرب کے خیالات ونظریات اپنی چمک دمک سے ہمیں متاثر ضرور کرتے ہیں لیکن ان میں وہ وسعت اور گہرائی نہیں ہے جو مشرقی تہذیب میں پائی جاتی ہے ۔

۲:۔ اس دور میں نئی نئی چیزیں اور نئے نئے نظریات اتنی تیزی سے آرہے ہیں کہ وہ تمام پرانی چیزوں کو مٹاکر رکھ دیں گے ۔ جو شخص راہِ راست سے ذرا بھی ہٹے گا وہ مغرب کی پیروی میں تباہ ہو جائے گا ۔ البتہ جو لوگ مستقل مزاج ہوں گے اور اپنے راستے پر ثابت قدمی سے قائم رہیں گے انہیں مغربی تہذیب مٹا نہیں سکے گی ۔ گویا اس شعر میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ مغربی تہذیب کی کیسی بھی یلغار ہو، ہمیں اپنی تہذیب پر ثابت قدم رہنا چاہیئے ۔

۳:۔ ہندو اور مسلمان کسی زمانے میں پیار محبت سے رہا کرتے تھے ۔ لیکن اب ان میں روز جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ۔ اقبال ہندوؤں کو اور مسلمانوں کو شیخ اور برہمن کے لفظوں سے مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم لوگ داناؤں کی باتیں سنتے ہو یا نہیں سنتے ؟ دنیا بھر کے دانا یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمان اور ہندو اتفاق کی وجہ سے ترقی کرکے آسمان تک جا پہنچے تھے اور اب نفاق کی وجہ سے آسمان سے گر کر چکنا چور ہو گئے ہیں اور ان کی ساری ترقی فنا ہو چکی ہے ۔

۷:۔ کبھی تو وہ زمانہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کی محبت برقرار تھی اور باہم مل کر محبت اور پیار کی محفلیں منعقد کرتے تھے لیکن اب جہاں ہندو اور مسلمان اکٹھے ہو جائیں وہاں یا تو اردو ہندی کی بحث شروع ہو جاتی ہے یا قربانی اور جھٹکے کا موضوع چل پڑتا ہے ۔

۱۰:۔ "اصلِ شہود وشاہد ومشہود ایک ہے" غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا

حلِ لغات

شہود : ظاہر ہونا ؛ شاہد : گواہی دینے والا ؛ مشہود : جس کے بارے میں شہادت دی جائے ۔

وضاحت

پہلا مصرع غالب کا ہے جس کی طرف اقبال نے خود ہی اشارہ بھی کر دیا ہے ۔ تضمین شعر کے اس قطعے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا موازنہ کیا گیا ہے ۔ کعبہ والوں سے مراد

مسلمان اور اہلِ دیر سے مراد ہندو ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ غالب نے کہا تھا کہ خدا کی ذات، اس کی ذات کو دیکھنے والوں اور اس کی ذات کی گواہی دینے والوں میں یعنی درحقیقت ان تینوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وحدت الوجود کے عقیدے کی رُو سے انسان، کائنات اور خدا درحقیقت ایک ہی وجود کی ظاہری شکلیں ہیں۔ اگر غالب کی یہ بات درست ہے تو پھر عاشق مزاج مسلمانوں کو بتوں کی محبت کے باعث برہمن کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ برہمن اور بتوں میں عقیدۂ وحدت الوجود کی رُو سے کوئی فرق نہیں۔ درحقیقت اس قطعے میں مزاحیہ انداز میں غالب کا قول استعمال کیا گیا ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان بعض اوقات جب ایک عمل کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں کسی دوسرے عمل کو بھی اپنانا پڑتا ہے۔ یعنی اگر مسلمان غیر مسلم حسینوں سے محبت کریں گے تو پھر غیر مسلم راہنماؤں کی پیروی بھی کرنی پڑے گی۔

۱۱۔ ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا — رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی

حلِ لغات معاد: آخرت

وضاحت جب ہمارے ہاتھوں سے دامنِ دنیا نکل گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ دنیا کے جانے کے ساتھ آخرت کا خیال بھی دل سے نکل گیا۔ جب ہمارے پاس دنیا نہیں رہی تو دین کی پروا کون کرے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا۔

گئی دنیا تو پھر ہم دین کو اب کیوں لگا رکھیں
برا معلوم ہوتا ہے مسائل کا یہ پشتارا

غرض مسلمانوں کے ہاتھوں سے دنیا بھی نکل گئی اور دین بھی چلا گیا۔ اب مسلمانوں نے اسمبلیوں میں قانونِ وقف بنانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی ہے۔ لیکن مسلمان لیڈروں سے یہ پوچھنا چاہیئے کہ جب مسلمانوں کے پاس جائیداد ہی نہیں ہے تو وقفِ جائیداد کا قانون بنوا کر کیا کرو گے۔ اس قطعے میں اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جب قائدِ اعظم نے ہندوستان کی مرکزی کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا تھا جسے "قانونِ وقفِ اولاد" کہا جاتا تھا۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اپنے آباء واجداد کی جائیداد سے اپنے حصے کے مطابق فائدہ اٹھاتی رہے لیکن اسے گروی نہ رکھ سکے۔

۱۲۔ وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے — مہذب ہے تو اے عاشق قدم باہر نہ دھر حد سے

وضاحت اس قطعے میں ایک ہندوستانی عاشق اور ایک یورپی خاتون کے درمیان مکالمہ دیا گیا ہے۔ عاشق، مس کو کسی طرح بھی اپنی محبت میں اسیر کرنے پر کامیاب نہیں

ہوتا اور بالآخر اس بات کا ارادہ کرلیتا ہے کہ وہ خودکشی کرے گا۔ جب وہ خودکشی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو میں اُسے جواب دیتی ہے "اے عاشق! اگر تو مہذب ہے، تو ہجر کی تکلیفیں برداشت کر اور خودکشی سے باز رہ۔ تجھے اس لئے بھی خودکشی نہیں کرنی چاہیئے کہ نہ تو تیرے پاس خودکشی کی جرأت ہے، نہ ہی خنجر ہے، تو آخر خودکشی کس طرح کرو گے"

اس پر عاشق نے کہا کہ یہ بات درست ہے، تاہم اگر تم کچھ روپے نقد دے دو تو میں سرحد سے کوئی پٹھان کرایے پر منگوالوں گا اور وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس میں لطیفہ یہ ہے کہ عاشق جان دینے کے لئے نقدی بھی محبوب سے مانگ رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض لوگ یہاں ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو رقم لیکر ہر قسم کا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

۱۳۔ ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر　　حاصل ہوا یہی نہ بچے مار پیٹ سے

وضاحت اس قطعے میں اقبال نے ترکی کی اُس جنگ کی طرف اشارہ کیا ہے جو ۱۹۱۲ء میں لڑی گئی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ ایڈریانوپل میں جنگ ہو رہی تھی اور سامانِ رسد چند میل کے فاصلے پر پڑا تھا مگر سپلائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اقبال نے کہا ہے کہ اُس وقت ترک اتنے نادان ہو چکے تھے کہ انہیں عربوں کی قدر و قیمت کا کچھ احساس نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنگ میں بری طرح ہار گئے۔ عرب میں اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے۔ اگر ترکی کے لوگ عربوں سے کچھ سیکھتے تو کم از کم اونٹوں کا بیڑا تیار کر لیتے اور سامانِ رسد میدانِ جنگ تک پہنچا کر شکستِ فاش سے بچ جاتے۔ اس میں عربوں کی قدر نہ جاننے سے مراد یہ ہے کہ ان دنوں ترکوں اور عربوں میں شدید اختلافات ہو چکے تھے۔

۱۴۔ ہندوستاں میں جزوِ حکومت ہیں کونسلیں　　آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا

وضاحت اس قطعے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کو رفتہ رفتہ اسمبلیوں میں نمائندگی دینی شروع کر دی ہے۔ یہ نمائندگی جوں جوں بڑھے گی ہندوستان کے لوگ سیاسی طور پر ترقی کی انتہا تک جا پہنچیں گے۔ اور پھر ملک میں الیکشن شروع ہو گئے۔ جب الیکشن شروع ہوں گے تو بہت سے دولت مند لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لئے میدان میں نکلیں گے۔ گویا پہلے تو فقیر ہی بھیک مانگا کرتے تھے۔ اب اسمبلیوں کی بدولت امیر لوگ بھی سوال کرنا سیکھ جائیں گے۔

۱۵۔ ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں　　ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا

حل لغات

امپیریل کونسل: سے مراد بادشاہ کی اسمبلی ہے۔ چونکہ حکومت برطانیہ کا سربراہ بادشاہ ہوتا ہے اس لئے برطانیہ اور برطانیہ کی نوآبادیات کی اسمبلیوں کو امپیریل کونسل کہا جاتا ہے۔

وضاحت

اس قطعے میں غالب کے ایک مصرع کی تضمین کی گئی ہے۔ وہ مصرع یہ ہے۔

ع ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اس مصرع کو بنیاد بنا کر ایک ووٹر اور ایک امیدوار کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ امیدوار ووٹ طلب کرنے گیا ہے۔ جواباً ووٹر نے کہا ہے کہ امپیریل کونسل کی ممبری حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم تمہیں ووٹ ضرور دیں گے لیکن کیا ان ووٹوں کا کوئی معاوضہ بھی ہمیں ملے گا۔ کیونکہ غالب نے یہ بجا فرمایا ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کے سامان کی ضرورت پڑتی ہے اور جب تک الیکشن کا امیدوار غرباء کو ووٹوں کے لئے پیسے نہ دے غرباء گذر اوقات نہیں کر سکتے۔

۱۶۔ دلیلِ مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہو گی نہ ہو حضور سے الفت تو یہ ستم نہ سہیں

حل لغات

کمیٹی: میونسپل کمیٹی؛ حلقہ: میونسپل انتخابات کے لئے کچھ علاقوں پر مشتمل رائے دہندگان کا مرکز جو ایک کونسلر کو منتخب کرتا ہے۔ کلکٹر: مراد ڈپٹی کلکٹر، انگریزی دور میں مالیہ جمع کرتے تھے اور انتظامی امور انجام دیتے تھے۔ اس لئے بہت اہم سمجھے جاتے تھے۔ لبِ ساحل: ساحل سے بندھا ہوا۔ مراد ایسی کشتی جو ساحل پر لنگرانداز ہو۔

وضاحت

یہ غزل پانچ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے مختلف اشعار میں بالعموم طنز سے کام لیا گیا ہے اور یہ طنز برطانوی دور میں ایک خاص مزاج کے لوگوں پر ہے۔

i۔ اس شعر میں حضور سے مراد انگریز افسر ہے جس کو خوشامدی لوگ حضور حضور کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ ایک ایسا ہی خوشامدی شخص کسی انگریز افسر سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں آپ سے سچی محبت ہے اور آپ سے محبت رکھنے کی وجہ سے ہمارے اپنے ہی ملک کے لوگ ہمارے مخالف ہو گئے ہیں۔ ظلم و ستم کو اس طرح سہنا ہماری محبت اور وفاداری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ii۔ حلقہ انتخاب کے لوگ اصرار کرتے ہیں کہ ہم بھی میونسپل کمیٹی کے اجلاس میں ان کے حقوق کے لئے کوئی بات کریں۔ لیکن چونکہ ہمیں ابھی تک یہ پتہ نہیں کہ انگریز کلکٹر ہمارے حلقہ انتخاب کے مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ اس وقت تک ہم کمیٹی میں اپنے علاقے کے لوگوں کے حقوق کے لئے کوئی بات نہیں کہیں گے۔ مبادا کلکٹر صاحب ناراض ہو جائے۔ اس شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے اگرچہ جمہوریت کا ایک نظام دکھاوے کی خاطر میونسپل کمیٹیوں میں جاری

کردیا ہے لیکن وہاں بھی محض کلکٹر کے توسط سے انگریزوں کی رائے چلتی ہے اور منتخب کونسلر لوگوں کے حقوق کے لئے اُس وقت تک حق گوئی سے گریز کرتے ہیں جب تک انھیں حکومت کا عندیہ معلوم نہیں ہو جاتا۔

iii۔ اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ انگریزی دور میں ہندوستانی لوگ انگریزوں کے ساتھ کام کیا کرتے تھے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو جاتے تھے۔ ایسے خوشامدی لوگوں کو جاتے ہوئے انگریز افسر ایک سند لکھ کر دے جاتا تھا کہ فلاں فلاں شخص نے برطانوی حکومت کی بہت خدمت کی ہے۔ یہ سند بحفاظت تمام رکھ لی جاتی تھی اور جب کبھی ضرورت پڑتی تھی، نکال کر کسی اور افسر کے سامنے پیش کر دی جاتی تھی۔ اور اس سے مختلف کام نکلوائے جاتے تھے۔ اس شعر میں ایک ایسا ہی شخص اپنے آپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اس وقت انگریز مجھ پر بڑا مہربان ہے اس لئے بہتر ہے کہ میں اُن سے خوشنودی کا ایک سرٹیفکیٹ لکھوا لوں تاکہ اُس کے ذریعے میرے لڑکوں کو ملازمتیں مل سکیں۔ کیونکہ کوئی اعتبار نہیں کہ صاحب بہادر کی مہربانی کب تک رہتی ہے اگر وہ ناراض ہو گئے تو سند سے محروم ہونا پڑے گا۔

iv۔ ہندوستان کے لوگوں کو اب رہنے کے لئے زمین پر تو جگہ نہیں مل سکتی البتہ دنیا میں وسیع سمندر موجود ہیں جن کی تہوں میں بیشمار مُردوں کی گنجائش ہے۔ اس لئے ہندوستان کے لوگوں کو سطح زمین پر رہنے کی جگہ نہیں ملتی تو نہ سہی اُنہیں چاہیئے کہ وہ سمندروں میں کود کر خودکشی کر لیں تاکہ ان کی لاشیں آرام سے سمندروں کی تہوں میں لیٹ سکیں۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کی آمد کے بعد بالکل ختم ہو کر رہ گئے ہیں اور دنیا میں ان کی کوئی اہمیت برقرار نہیں رہی۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے۔ اب ان کے دکھوں اور تکلیفوں کا علاج موت کے سوا کسی چیز سے نہیں ہو سکتا۔

v۔ ہم ایک بے بس کشتی کی طرح انگریزوں کے فرمانوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ جس طرح کشتی ملاح کے اشارے پر چلتی ہے۔ جدھر ملاح اسے چلانا چاہتا ہے اُدھر کا رُخ کر لیتی ہے۔ اسی طرح ہم انگریزوں کے حکم کے بندے ہیں۔ اگر انگریز ہمیں کہے کہ ساحل پر بندھے رہو تو ہم وہیں بندھے رہیں گے۔ اور اگر یہ کہہ دے کہ پانی میں تیر جائیں تو ہم پانی میں بہنے لگیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے افراد کسی تحریک میں بھی اس وقت تک شریک نہیں ہوتے جب تک کہ انگریزوں کا اشارہ نہ ہو۔

۱۷۔ فرماتے تھے شیخ طریق عمل پہ وعظ — کفار ہند کے ہیں تجارت میں سخت کوش

حل لغات

طریق عمل: زندگی بسر کرنے کا طریقہ۔ سخت کوش: محنتی۔ حق نیوش: سچی بات سننے والے۔ بارِ گوش: کانوں کا بوجھ یعنی ناگوار گزرنے والی بات۔ سامانِ خورد و نوش

کھانے پینے کا سامان ؛

وضاحت

اس قطعے کا مفہوم آسان لفظوں میں یوں ہے کہ ایک دن واعظ مسلمانوں کو یہ نصیحت کر رہا تھا کہ انہیں ہندوستان میں رہنے کے لیے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے ۔ وہ انہیں سمجھا رہا تھا کہ ہندوستان کے کفار یعنی ہندو تجارت میں بڑے محنتی ہیں ۔ اس لئے مسلمان اُن سے مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ اس لئے مسلمانوں کو تجارت میں کامیاب بنانے کے لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہم مذہب لوگوں سے چیزیں خریدا کریں ۔ جو لوگ مشرکوں سے چیزیں خریدتے ہیں وہ خود بھی مشرک ہیں ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم عقل اور ہوش سے محروم ہے اس لئے وہ کافروں اور مشرکوں کے ساتھ لین دین کرتے ہیں ۔ اگر مسلمانوں کے کان سچی بات سننے کی ہمت رکھتے ہیں تو انہیں یہ سن لینا چاہیئے کہ کافر کے ہاتھ سے خریدی ہوئی چیز ناپاک ہو جاتی ہے ۔ واعظ کی اسی محفل میں ایک شرابی بھی شریک تھا ۔ اس کے لئے واعظ کی نصیحت بڑی ناگوار تھی کیونکہ شراب بالعموم ہندو بیچا کرتے ہیں ۔ وہ کہنے لگا کہ اس قسم کی پابندیاں اگر کھانے پینے کی چیزوں پر بھی لگ جائیں تو بڑا ظلم ہے ۔ اُس شخص کی یہ بات سنکر میں نے یہ جواب دیا کہ اگر ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی تجارت اور لین دین پر پابندی بھی لگ جائے تو آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کیونکہ ہندوستان میں مسلمان بھی شراب بیچتے ہیں ۔

ے دیکھئے دیتی ہے مشرق کی تجارت کب تک　　شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے ۔

حل لغات

شیشۂ دیں : دین کی صراحی ؛

مدارا : علاج

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ مشرق ، مغرب کے ساتھ ایک عجیب و غریب قسم کی تجارت کر رہا ہے ۔ اس تجارت میں مال کے بدلے مال لیا جاتا ہے ۔ مشرق کے لوگ اپنے دین کی صراحی یعنی عقائد مغرب کو دے رہے ہیں اور اس کے بدلے ان سے شراب کے پیمانے اور پیالے حاصل کر رہے ہیں ۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین سے بدظن ہو رہے ہیں اور مغرب کے نظریات اخذ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اس سوچ سے اقبال کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ ہم بھی بہت کچھ ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ جو ضرورت کے بالکل برعکس ہیں ۔ ہمیں اپنے ماضی سے بہت محبت ہے جو جنون کی حدوں تک پہنچی ہوئی ہے ۔ اس جنون کا علاج کرنے کے لئے ہم اپنے جسم کو تعلیم جدید کا نشتر لگوا رہے ہیں تاکہ خون بہہ جائے اور ہمارا جنون ختم ہو جائے ۔ یعنی ہم ملت کا علاج کسی ایسے سرجن سے کرا رہے ہیں جو ملت کی رگوں کو کاٹ کر اور اس کا لہو بہا کر ہمیں کمزور بھی کر رہا ہے اور ماضی سے کاٹ بھی رہا ہے ۔ پرانے زمانے میں دیوانگی کے

علاج کا طریقہ یہ تھا کہ نشتر لگا کر خون بہایا جاتا تھا۔ یہاں چونکہ جنون سے مراد مسلمانوں کی اپنی عقائد سے محبت ہے اس لئے سرجن سے مراد انگریز ہے۔ جو ملت کی رگوں سے خون بہا کر ان کا علاج کرنے کے دعوے کے باوجود درحقیقت ان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔

۱۹۔ گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرم سخن — نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو قرار

حلِ لغات

حذر: پرہیز، بچنا۔ زنہار: ہرگز نہیں۔ غمزہ شتر: اونٹ کے نخرے (چونکہ اونٹ ایک بے ڈول جانور ہے۔ اس لئے اگر کوئی بدشکل انسان نخرے کرے تو اُسے شتر غمزے کہا جاتا ہے۔) گوسفند: بکری۔ گا: گائے۔ پلنگ: چیتا۔ خرِ لنگ: لنگڑا گدھا۔ سبق آموز: سبق دینے والا، سبق سکھانے والا۔ طیور گلزار: باغ کے پرندے۔

وضاحت

اس نسبتاً طویل قطعے کا مفہوم یہ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے کلام میں گائے اور اونٹ دو علامتیں ہیں۔ گائے ہندوؤں کی علامت ہے اور اونٹ مسلمانوں کی۔ اقبال انہی علامتوں سے کام لیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ایک روز گائے اونٹ سے یہ کہنے لگی کہ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ ایک حال پر برقرار نہیں رہتی۔ میں پہلے رسی سے بندھی رہتی تھی۔ پھر میں نے وہ رسی توڑ ڈالی۔ اس سے میں بہت بدنام ہوئی مگر اب میں نے یہ سُنا ہے کہ تم نے بھی مہار توڑ ڈالی ہے۔ گائے نے مزید کہا کہ ہندوستان میں تو سیاست کے میدان میں اونٹ کو اہمیت دی جاتی ہے مگر سرزمین عرب میں چونکہ ریتلا صحرا ہے اس لئے وہاں ریل نہیں چل سکتی۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان تو ہندوستان میں رہ کر بھی سیاسی طور پر اہمیت حاصل کر گئے ہیں مگر انگریز عرب میں لوگوں کے دلوں کو تسخیر نہیں کر سکے گا۔ گائے گفتگو کرتے ہوئے اونٹ سے مزید یہ کہتی ہے کہ کل تک تم میری محفل میں شریک ہونے سے پرہیز کرتے تھے اور تمہارے لٹکتے ہوئے ہونٹوں پر ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، کی آواز ہوتی تھی لیکن آج یہ کیا تبدیلی آگئی ہے کہ تو نے ہم پر مہربانی شروع کر دی ہے اور تمہارے دل میں ہماری طرف سے پہلا کینہ باقی نہیں رہا۔ گائے کی یہ گفتگو جب اونٹ نے سُنی تو اُس نے شرماتے ہوئے کہا کہ ہمارا شمار تمہارے عاشقوں میں ہوا ہے اور جب تو اپنی خوبصورت چال چلتی ہے تو اونٹ اپنے بے ڈھنگے نخروں کے ساتھ تم پر سو جان سے عاشق ہو جاتا ہے۔ اور تمہاری مستانہ چال کے تو ہم پرانے عاشق ہیں۔ اور جب سے تو نے رسی توڑ کر آزادی حاصل کی ہے۔ جنگل کے دوسرے بے زبان جانوروں میں بھی شعور پیدا ہو گیا ہے۔ اونٹ نے گائے سے مزید کہا کہ ہم ایک ہی جنگل میں عرصہ دراز سے رہتے ہیں جب کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ہم میں چارہ بھی خریدنے کی استطاعت نہیں۔ یہ بھی ادھار لے کر

اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر جنگل کے سارے جانور ایک جیسے خیالات اختیار کر لیں تو تمام جانوروں کی عزت اور وقار بحال ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر باغ کا مالک سب کو خلوص اور اتحاد کا درس دے تو یقیناً باغ کے سارے پرندے ایک جیسی محبت بھری زبان میں گفتگو کرنے لگیں گے۔ اس لئے گانٹے کو یہ چاہیئے کہ وہ باغ کی مالک ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی کچھ دے تاکہ ہم بھی خوش رہیں اور ہمارے ساتھی بھی خوش رہیں۔ آخر میں ایک فارسی کا شعر دیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حافظ کی گدڑی جس قیمت پر بھی ممکن ہو شراب سے رنگین کر دو اور اس انداز میں اُسے شراب میں مست کر کے بازار جاتے ہوئے پکڑ کرے آؤ۔

اس قطعے میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ کسی زمانے میں انگریزوں اور ہندوؤں کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ جب ہندوؤں نے آزادی کی تحریک کا آغاز کیا تو مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے انگریزوں سے تعاون شروع کر دیا۔ لیکن پھر خلافت کے مسئلے میں مسلمان بھی انگریزوں سے ناراض ہو گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی انگریزوں کی مخالفت شروع کر دی۔ اُس زمانے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے راہنماؤں کی رائے یہ تھی کہ حصولِ آزادی کے لئے مسلمان اور ہندو کو مل کر انگریزوں کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ اس قطعے میں اُس زمانے کی صورت حال بیان کی گئی ہے۔ گویا ہندو مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم تم اکٹھے ہو جائیں تو اس صورت میں ہندوستان کے تمام افراد باوقار ہو سکتے ہیں مگر مسلمان یہ چاہتے تھے کہ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ تعاون کریں تو ہندو ہمیں ہمارے حقوق دیں۔ یہی بات اونٹ کی زبان سے کہلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان غریب ہیں، پسماندہ ہیں، وہ ہندوؤں کے ساتھ اُسی وقت چل سکیں گے جب ہندو ان کے اقتصادی حالات کو بہتر بنا دیں گے۔

۳۔ رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناکامی کا

حلِ لغات بسوہ دار: مراد زمیندار ؛ تشنہ کامی: مقصد سے محروم رہنا

وضاحت اس قطعے میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان معمولی معمولی باتوں پر تو بہت برہم ہوتے ہیں لیکن بڑی باتیں بآسانی برداشت کر لیتے ہیں۔ اور ان کے ضمیر پر ذرا بھی بوجھ نہیں پڑتا۔ اس کی وضاحت اقبال یوں کرتے ہیں کہ رات ایک مچھر بھن بھن کرتا ذرا میرے قریب سے گذرا اور میرے کان میں آکر اپنی ناکامی کا قصہ بیان کرنے لگا۔ مچھر نے کہا کہ میں رات بھر سخت کوشش کرنے کے بعد بڑی مشکل سے کسی انسان کو کاٹ کر ایک بوند لہو حاصل کرنے میں کامیاب

ہوتا ہوں لیکن زمیندار بغیر کسی دقت کے کاشتکاروں کا لہو پی جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جاگیرداری نظام میں کاشت کار درحقیقت اپنی سخت محنت سے اپنا لہو کھیتوں کو دیتا ہے لیکن اس کے معاوضے میں اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا جب کہ اس کی محنت کا پھل جاگیردار کھا جاتا ہے۔

۲۱۔ یہ آیۂ نو جیل سے نازل ہوئی مجھ پر　　گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا

حلِ لغات

آیۂ نو: نئی آیت ؛ آشتی: صلح ؛ بدری: ہندو
مسیتا: مراد مسلمان

وضاحت

اس قطعے کا مطلب لکھنے سے پہلے اس کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔
ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد گاندھی کو قید کر دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے جیل سے ایک مضمون اشاعت کے لئے اپنے اخبار "نوجیون" میں بھیجا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے قرآن اور گیتا دونوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کتابوں کی تعلیم یکساں ہے۔ (بحوالہ یوسف سلیم چشتی — شرح بانگ درا)

اقبال نے گاندھی کے اس اعلان پر بطور طنز یہ قطعہ لکھا ہے۔ گویا ایک شخص یہ کہتا ہے کہ جیل میں مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے یعنی الہام ہوا ہے کہ گیتا میں قرآن کی تعلیمات موجود ہیں اور قرآن میں گیتا کی۔ یعنی ہندو اور مسلمان عقائد کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں۔ اس پر اقبال تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ جس شخص پر یہ بات روشن ہوگئی ہے کہ قرآن اور گیتا کی تعلیمات یکساں ہیں اس نے کیا خوب ہندو اور مسلمان کی صلح کرا دی ہے۔ گویا ہندو اور مسلمان میں جو اختلافات تھے وہ ختم ہو گئے ہیں اور دونوں کی صلح برابری پر ہو گئی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے قابلِ غور ہے کہ گیتا اور قرآن کی تعلیمات کو یکساں قرار دینے والے نے غالباً یہ سوچا ہے کہ ہندو تو اپنے مذہب سے بیزار ہو ہی چکے ہیں اب مسلمانوں کو بھی غلط سلط تعلیمات دے کر مسجد سے نکالا جائے یعنی اپنے مذہب سے بیزار کیا جائے۔

۲۲۔ جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست　　ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت

حلِ لغات

ست: سچائی۔ راستی ؛ تت: روح، مراد ہے مرکزی خیال، خلاصہ،
ساہوکار: سود پر قرض دینے والا۔

وضاحت

اقبال کہتے ہیں کہ ہر مذہب نے ایک ہی بات کی تعلیم دی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی جان چلی جائے لیکن اُسے سچائی سے ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ اس لئے میں یہ سچی بات بغیر کسی خوشامد کے کہوں گا کہ ساہوکاری، جاگیرداری اور حکمرانی تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یعنی تینوں کا طریقۂ واردات ایک ہی ہے۔ ساہوکار مقروض کا خون چوستا ہے۔ جاگیردار

کاشتکار کا اور بادشاہ رعایا کا۔ اس لئے یہ تینوں اصل میں ایک ہی ہیں۔

ے محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے — دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون

حلِ لغات

آشوب خیز: مصیبتیں پیدا کرنے والا؛ وقد کنتم بہ تستعجلون: اور تم تو عذاب کے آنے میں شک کر کے (اُس کے لئے جلدی مچایا کرتے تھے) سورۃ یونس۔ ینسلُون: سورۃ انبیاء کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں یہ لفظ آتا ہے۔ پورا جملہ یوں ہے۔ حتیٰ اذا فُتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدبٍ ینسلون۔ یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھول دیئے جائیں اور ہر بلندی سے ڈھلکتے ہوئے چلے آئیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ پرانے زمانے میں یاجوج اور ماجوج دو جنگجو قومیں تھیں جو تباہی مچایا کرتی تھیں۔ بعض مفسرین کے بقول ایک پیغمبر نے ان کو روکنے کے لئے ایک بہت مضبوط اور اونچی دیوار تعمیر کر دی۔ روایت یہ ہے کہ اس قوم کے افراد اس دیوار کو مسلسل چاٹتے رہتے ہیں اور تھک ہار کر سو جاتے ہیں اور صبح کو وہ دیوار دوبارہ اتنی ہی بلند ہو جاتی ہے۔ قیامت کے قریب وہ اِس دیوار کو چاٹ کر اس سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

وضاحت

اقبال نے آیات کے حوالے سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ دنیا میں اس وقت محنت اور سرمایہ یعنی اشتراکی اور سرمایہ دار ممالک ایک دوسرے کے خلاف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھئے ان میں جو جنگ ہو گی اس میں کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ بہرحال اتنا طے ہے کہ اس جنگ میں طرفین کی بہت سی تمناؤں کا خون ہو جائے گا۔ سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک حکمت و تدبیر سے اس آنے والی جنگ کو روکنے کی لاکھ کوشش کریں لیکن یہ جنگ رُک نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ گروہ تو ہیں کہ وہ خدا پر شک کر کے اس کے وعید پر طنز کیا کرتے تھے اور اب یہ مصیبت ان کے سر پہ آ پڑی ہے۔ خدا کا عذاب آنے ہی والا ہے اور ان کی پوری کوشش کے باوجود اسے روکنا ممکن نہیں ہے۔ مسلمانو! تم جلد دیکھ لو گے کہ یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھُل جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اشتراکی اور سرمایہ دار ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دینگے۔

۲۴۔ شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رندِ لم یزل — رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق

حلِ لغات

رندِ لم یزل: وہ رند جس کو زوال نہ آئے۔ یعنی ہر وقت شراب پینے والا شخص؛ بالائے طاق رکھنا: بھول جانا؛ نیلی رواق، نیلا چھجا، مراد آسمان؛ کرزن: ایک مشہور انگریز وائسرائے؛ مداور: علاج؛ حکم برداری، انگریزی میں اس کے لئے MAN DATE کی اصطلاح رائج ہے۔ اس کا مطلب ہے کوئی ملک کسی اور حکومت

کی زیرِ نگرانی نظام چلائے ۵ دردِ لایطاق : ناقابلِ برداشت درد ۶ سرآغا خاں : حسن علی شاہ المعروف آغا خاں اسمٰعیلیہ فرقے کے سربراہ جو کریم آغا خاں کے دادا تھے۔

وضاحت اس نظم کو سمجھنے کیلئے اُس دور کے بعض سیاسی واقعات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں ترک ایک وسیع سلطنت کے مالک تھے۔عرب بھی ان کے ماتحت تھے۔ انگریزوں نے ترکی کی سلطنت کو کمزور کرنے کے لئے مختلف عرب ممالک کے لوگوں کو اُکسایا کہ وہ ترکی کے خلاف بغاوت کردیں۔ بغاوت کے نتیجے میں حجاز کی بادشاہی شریف حسین کے حصے میں آئی۔ شام کی سلطنت امیر فیصل کو ملی، شرقِ اردن کا بادشاہ امیر عبداللہ بنا اور عراق کی حکومت امیر زید کو ملی۔ فلسطین کو انگریزوں نے اپنے قبضے میں رکھا۔ فلسطین اور عراق کے لئے وہ طریقِ حکومت تجویز کیا جسے سیاسی اصطلاح میں حکم برداری یا MANDATE کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ فلسطین و عراق دونوں انگریزوں کی زیرِ نگرانی حکومت چلائیں گے۔ مگر یہ تجویز پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ شام کے لوگوں نے امیر فیصل کی بادشاہی نامنظور کردی۔ جب جنگ عظیم شروع ہوگئی تو فرانسیسی اپنی فوجیں شام سے ہٹاکر چلے گئے۔ یہ واقعات آگے بھی جاری رہے، لیکن جب یہ نظم لکھی گئی ہے اُس وقت فرانسیسی شام سے اپنی فوجیں ہٹاکر جا رہے تھے۔

اس قطعے کا مطلب یہ ہے کہ فرانس کے فوجی جو ہمیشہ شراب پی کر مست رہتے ہیں شام کی سرحدوں سے رخصت ہو رہے ہیں اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے میخانے کے سارے طریقے بھی بھلا دیئے ہیں۔ یعنی اگر فوج کسی ملک سے پسپا ہوتی ہے تو اس کا بھی ایک قاعدہ ہوتا ہے نہ یہ کہ دُم دباکر بھاگ جائیں۔ بہرحال فرانس کی فوج شام سے فرار ہوگئی ہے۔ یہ بڑا عبرت کا مقام ہے کہ نیلا آسمان ایک پل میں اپنا رنگ بدل دیتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ لارڈ کرزن کو یہ مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل کرنا چاہیئے (لارڈ کرزن اُس زمانے میں انگلستان کے وزیر خارجہ تھے۔ بعد میں ہندوستان کے وائسرائے بنے) کیونکہ انگریزوں نے حکم برداری کا جو نظام نافذ کیا تھا وہ بالکل ناکام ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اب عراق اور فلسطین کو ہضم کرنے کے لئے حکم برداری کی بجائے کوئی اور حیلہ کرنا پڑے گا۔ سرآغا خان نے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک وفد اس سلسلے میں مشورہ دینے کے لئے انگلستان طلب کیا ہے۔ اقبال سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ وفد اس لئے ترتیب دیا جا رہا ہے کہ اس کی مدد سے انگریز فلسطین و عراق کو آسانی سے ہضم کرسکے۔

۲۵۔ تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمین

حلِ لغات تکرار : جھگڑا ۔ لڑائی ؛ شوریدہ حال : بدحال ، غریب

وضاحت اس قطعے میں علامہ اقبال نے مالک اور مزارع میں ایک فرضی مکالمہ قلمبند کیا ہے۔ اور اس کے بعد آخری شعر میں اُس سے ایک نتیجہ نکالا ہے، فرماتے ہیں کہ ایک روز زمین کے مالک اور مزارع میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ دونوں اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ زمین درحقیقت ان کی ملکیت ہے۔ مزارع یہ کہہ رہا تھا کہ جو فصل بوئے کھیت اسی کا ہوتا ہے۔ جبکہ مالک یہ کہہ رہا تھا کہ تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ زمین کا مالک میں ہوں۔ آخر میں نے اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ زمین کا اصل مالک کون ہے خود زمین سے یہ سوال کیا کہ تو کس کی ملکیت ہے۔ زمین نے جواب دیا کہ مجھے تو فقط ایک بات پہ یقین ہے کہ زمین کا مالک ہو یا غریب مزارع۔ جو بھی آسمان کے نیچے یعنی دنیا میں رہائش رکھتا ہے وہ زمین کا مال ہے کیونکہ مرکر اسے زمین کے اندر ہی سماتا ہے۔

۲۶۔ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں   نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

حلِ لغات نجار: بڑھئی، ترکھان

وضاحت اقبال کہتے ہیں کہ نئی تہذیب کے انڈے گندے ہیں۔ اس لیے یہ کسی کام نہیں آسکتے ان کو اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دینا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ نئی تہذیب کی پیروی کرنے والے نوجوان قوم اور ملت کے کسی کام نہیں آسکتے۔ دوسرے شعر میں انگریزوں کے اُس نظام جمہوریت پر طنز کی گئی ہے جو انھوں نے ہندوستان میں متعارف کرایا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ انگریزوں نے ملک میں میونسپل کمیٹی کے الیکشن منعقد کروانے شروع کر دیئے ہیں۔ کچھ لوگ ممبر منتخب ہوکر کونسلوں میں پہنچنے شروع ہو گئے ہیں اور کچھ لوگ میونسپل کمیٹیوں کی صدارت بھی کرنے لگ گئے ہیں۔ لیکن یہ اصلی اور سچی آزادی نہیں بلکہ آزادی کا فریب ہے اور انگریز اس قسم کے انتخابات کے ذریعے درحقیقت آزادی کو دور تر کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تیسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ یورپ کے رندے اتنے تیز ہیں کہ ہندوستان کے بڑھئی جب ان رندوں سے کام شروع کرتے ہیں تو وہ خود بھی ان رندوں کے ساتھ چھل جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یورپ سے جو ایجادات ہندوستان میں آرہی ہیں، اُس کے یہاں کے کارکنوں پر بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور وہ صرف یورپی اوزاروں کے ساتھ کام نہیں کرتے بلکہ آہستہ آہستہ یورپی تہذیب بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

۲۷۔ کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار   عیش کا پتلا ہے محنت ہے اُسے ناسازگار

حلِ لغات مردک : مرد کا اسمِ تصغیر ہے جو حقارت کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی فضول انسان ۔ ناکردہ کار : جو کام کرنا نہ جانتا ہو ۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی : انسان کے لئے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرے ۔

وضاحت اقبال نے اس قطعے میں قرآنِ پاک کی آیت کو بنیاد بناکر یہ کہا ہے کہ حکمِ قرآنی یہ ہے کہ انسان کے لئے وہی چیز جائز ہے جس کو وہ کوشش کرکے حاصل کرے ۔ اس صورت میں کارخانے کا مالک جو کارخانے کا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا بلکہ عیش کا پتلا ہے اور محنت اس کے بس کی بات نہیں تو پھر کارخانے کی ملکیت کا حق اُسے کس طرح پہنچتا ہے ؟ اور اگر سعی یا کوشش ہی کسی چیز کے حصول کو جائز بناتی ہے تو پھر کارخانے کا آرام طلب مالک مزدور کی محنت سے حاصل کیا ہوا سرمایہ اپنے تصرّف میں لانے کا کوئی حق نہیں رکھتا ۔

۴۸ ۔ سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا

وضاحت اس قطعے میں اس بات پر طنز کی گئی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں جمہوریت کے رائج کرنے کا فریب دینے کے لئے کونسل ہال بنوا دیا ہے ۔ اس کونسل ہال کی تعمیر پر اقبال یہ کہتے ہیں کہ کل کسی کارخانے کے مزدوروں میں کونسل ہال کی افادیت کے بارے میں بحث ہو رہی تھی اور کارخانے کے مزدور یہ کہہ رہے تھے کہ دستکار طبقہ بڑی مشکل سے اپنے جھونپڑوں میں وقت کاٹنے پر مجبور ہے ۔ دستکاروں میں سے کچھ لوگوں کو اگر دل بہلانا ہو تو وہ کسی تکیے پر چلے جاتے ہیں ۔ گویا تکیے غریبوں کی ملاقات کا مرکز ہوتے ہیں مگر سرمایہ داروں کے پاس بیٹھنے اور دل بہلانے کا کوئی تکیہ نہیں تھا ، اس لئے سرکار نے کونسل ہال بنا دیا تاکہ سرمایہ دار وہاں اکٹھے ہوں اور گپ شپ کرکے چلے جائیں ۔ اس میں طنز اس بات پر ہے کہ اسمبلی سرمایہ داروں کے تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہونے کے علاوہ کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتی ۔

۴۹ ۔ مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

حلِ لغات من : دل ۔ پاپی : گنہگار ۔ امیر فیصل ، عرب کے مشہور حکمران شریف حسین کا بیٹا ۔ سنوسی : سید محمد ادریس السنوسی جنھوں نے ۱۹۱۱ء کی جنگِ طرابلس میں انور پاشا کے ساتھ مل کر میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دی سنوسی کے پیرو کار ایک تحریک کی شکل میں منظم ہوگئے جسے سلسلۂ سنوسیہ کہا جاتا ہے ۔ اپدیشک : نصیحت کرنے والا ، واعظ ۔

وضاحت اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ شاہ عالمی دروازہ لاہور کے باہر مسلمان ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے درخواست بھی دے رکھی تھی لیکن یہ درخواست منظور نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے مل کر سامانِ تعمیر جمع کیا۔ شام کے بعد مسجد کی تعمیر شروع کر دی اور صبح ہونے سے پہلے مسجد مکمل کر دی گئی۔ یہ مسجد آج بھی موجود ہے۔

اقبال نے اس مسجد کی تعمیر کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگرچہ دلوں میں ایمان کی حرارت رکھنے والے لوگوں نے ایک ہی رات میں مسجد تعمیر کر ڈالی لیکن مسجد تعمیر کرنا ایک بات ہے اور نمازی بن جانا دوسری چیز ہے۔ ایک رات میں مسجد تو بن گئی لیکن ہمارے دل پرانے گنہگار ہیں اس لئے سالہا سال میں بھی ہمیں نماز پڑھنے کی عادت نہیں ہو سکی۔

۲۔ امیرِ فیصل کو سنوسی نے کیا خوبصورت پیغام بھجوایا کہ اے فیصل! تیرا نام عربی نام ہے اور تیرے آباؤ اجداد بھی عرب ہیں لیکن تیرے دل میں عقائدِ اسلام راسخ نہیں ہیں۔ اسلام جو دینِ عرب ہے اور سرزمینِ عرب سے پھوٹا ہے، اُس کا اثر عرب کے لوگوں پر ہونا چاہیئے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ سنوسی جو افریقہ کا رہنے والا ہے، وہ تو اسلام کے دفاع کے لئے بے دریغ میدانِ جنگ میں آ جاتا ہے جب کہ عرب کے حکمران یورپ کے لوگوں کے مفادات کے نگہبان بن جاتے ہیں۔

۳۔ ہماری آنکھیں تو بیشک اسلام کا نام لینے پر آنسو بہانے لگتی ہیں۔ لیکن اس قسم کے رونے میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ رونا تو اُس وقت مناسب ہوتا ہے جب آنسوؤں کی جگہ خونِ جگر آنکھوں سے ٹپکے۔ جس سے اس بات کا اظہار ہو کہ رونے والے کے آنسوؤں میں اس کے دِلی جذبات اور خلوص شامل ہے۔ اسلام کا نام لیکر رونے مگر عملی طور پر اسلام کے لئے کچھ نہ کرنے والے، سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔

۴۔ اقبالؔ وعظ و نصیحت کرنے میں تو لاجواب ہے۔ اور اتنے خوبصورت انداز میں نصیحت کرتا ہے کہ تھوڑی دیر میں لوگوں کا دل اپنی مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔ مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ گفتار کا غازی تو بن گیا ہے مگر اس خوبصورت گفتگو کے مطابق اپنا کردار خوبصورت نہیں بنا سکا۔ اس شعر میں اقبال نے اپنا نام لے کر واعظین اور رہنماؤں پر طنز کی ہے، جن کی باتیں تو بہت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان کا کردار گفتگو کے مطابق نہیں ہوتا۔